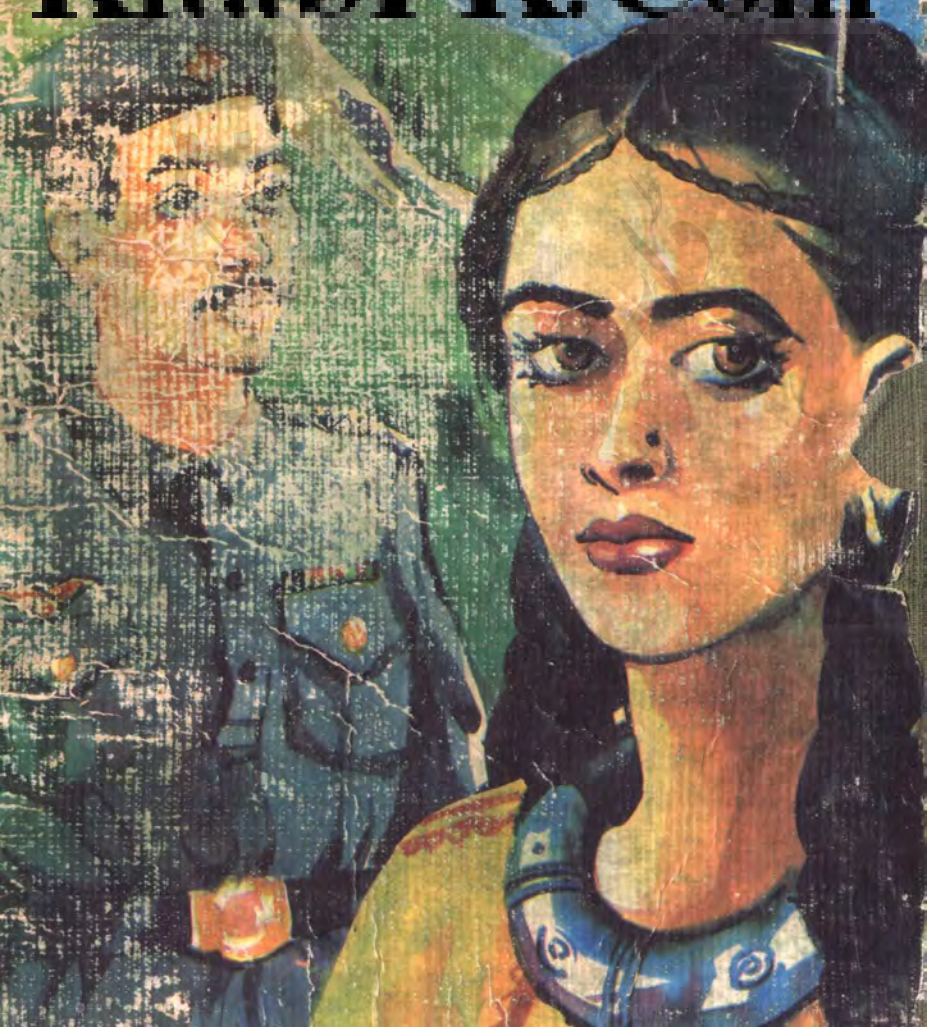


سائش

KitabPK.Com



## واپسی

گھڑی کی سوئیاں رات کا ایک بجار ہی تھیں اور دُور دُور تک کسی ذی نفس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گہری رات کا اسرار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔  
شام سے چلنے والی پُر وائی ہوا اچانک رُک گئی تھی جس سے جنگلی گھاس کی  
سُسر اہٹ بھی تھم گئی تھی اور جب کوئی جنگلی جانور گھاس کے اس طویل سلسلے میں  
بہت فاصلے سے بھی داخل ہوتا تو معمولی سی کھڑکھڑاہٹ پر وہ چوکس ہو جاتے۔

لیکن —

ابھی تک وہ نہیں آیا تھا جس کا انہیں انتظار تھا۔  
جس کے لیے انہوں نے یہاں خصوصی ناکے لگا رکھے تھے۔ مخبر بڑے اعتماد  
کا آدمی تھا۔ اس بات کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا کہ اس نے غلط اطلاع دی ہو۔ اس  
سے پہلے موہن کی فراہم کردہ اطلاع کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی —

”اس مرتبہ موہن غلطی تو نہیں کھا گیا —“

انسپکٹر چوہنی لال نے اپنے سکھ حوالدار بھگت سنگھ کے کان میں سرگوشی کی۔  
”سُر! ایسا ممکن نہیں۔ بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورسز) کے پاس اس  
سے زیادہ قابل اعتماد مخبر اس علاقے میں اور کوئی نہیں ہے۔“

بھگت سنگھ نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا

”میں بھی حیران ہوں۔ رات کے دو بج رہے ہیں اور ابھی تک ...“

بی ایس ایف میں لوگ جانتے تھے کہ بیشتر سمگلر پوسٹ کمانڈروں کو ناکہ بھرنے کے بعد ہی اپنا مال ادھر سے ادھر یا ادھر سے ادھر لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اگر انھیں یہ خبر ہو جاتی کہ ان پر خصوصی نگرانی کے ساتھ ناکہ لگایا جا رہا ہے تو وہ اپنے دوست سمگلروں کو صورت حال سے باخبر کر دیتے اور ناکہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اس روز بھی جب چوٹی لال ٹھپی کاٹ کر واپس ڈیوٹی پر آیا تو ڈپٹی کمانڈنٹ نے اُسے فوراً رپورٹ کرنے کو کہا تھا۔

چوٹی لال کے لیے اس اچانک حکم کا مطلب واضح تھا —!

وہ جانتا تھا کہ اسے کوئی نئی مہم سونپی جا رہی ہے —

”آگے چوٹی لال —“

ڈپٹی کمانڈنٹ نے اُس کے سیلیوٹ کی آواز پر نظریں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

”یس سر!“

چوٹی لال مودب تھا۔

ڈپٹی کمانڈنٹ نے اپنے سامنے دھری فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور وہاں کھڑے حوالدار کلرک کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرنے کے بعد انسپکٹر چوٹی لال کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔

”چوٹی لال — اس مرتبہ معاملہ ذرا مختلف ہے —“

”میں سمجھا نہیں سر!“

انسپکٹر چوٹی لال نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

”دیکھو چوٹی لال آج سے پہلے تم جاسوسوں اور سمگلروں کو ہی پکڑتے آتے

ہو لیکن اس مرتبہ تمہیں بڑے خطرناک چور کو گرفتار کرنا ہے —“

ڈپٹی کمانڈنٹ نے کہا اور چوٹی لال مسکرا دیا کیونکہ یہ اُس کے لیے کوئی ایسا کام

نہیں تھا جسے وہ پہلے سے کوئی مختلف کام سمجھتا۔

”سر! یہ تو معمول کی بات ہے۔ چور بھی انسان ہی ہوتے ہوں گے سمگلروں

انسپکٹر چوٹی لال اچانک کچھ کہنے کتنے رُک گیا۔

اُس کے حساس کانوں نے شاید وہ مخصوص آہٹ سُن لی تھی جس کے لیے شام چھ بجے کے بعد سے وہ لوگ یہاں مورچہ بند ہو کر بیٹھے ہوتے تھے۔

بارڈر سیکورٹی فورسز کے کمپنی ہیڈ کوارٹر میں تعینات انسپکٹر چوٹی لال اپنے ہم کاروں میں ”چوٹی قضاوی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کی چھری کے نیچے آنے والا بکرا کبھی بیچ کر نہیں جاسکتا۔

بھارت کی ہزاروں میل لمبی سرحد پر اُس نے قریباً ہر بڑی جگہ ڈیوٹی دی تھی، جہاں بھارت کی سرحدی فورس کا پایا جانا ممکن ہو سکتا تھا۔ چوٹی لال بی ایس ایف میں سپاہی کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر بنا تھا۔

جب سے پنجاب میں سمگلروں نے زور پکڑا تھا تب سے اُس کی منتقل ڈیوٹی پنجاب کے ہی سرحدی علاقوں میں لگائی جا رہی تھی اور گزشتہ دس سال سے اُس نے گونگا نگر سے جموں تک کی سرحد پر ہر حساس مقام پر پہرہ دیا تھا۔

گزشتہ تین سال سے اسے انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے کر بی ایس ایف کی خصوصی چھاپہ مار ٹیم میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس ٹیم کی حیثیت بی ایس ایف میں وہی تھی جو جرمز افواج میں گسٹاپو کی ہوا کرتی تھی۔

افسروں کا چہیتا ہونے کی وجہ سے کوئی بھی چوٹی لال کے مُتہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا سب جانتے تھے کہ وہ افسروں کا مُتہ چڑھا ہے اور اس کی بات کو افسران خواہ مخواہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

چوٹی لال کسی بھی پوسٹ کے نزدیک ناکہ لگانے سے پہلے کبھی متعلقہ پوسٹ کو خبردار نہیں کرتا تا آنکہ ہی کسی کو اعتماد میں لینے کی ضرورت سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اُس نے متعلقہ پوسٹ ہی کی مدد سے ناکہ بندی کرنی ہے تو پھر خصوصی ناکہ لگانے

کا تو مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔

یہ بات تھی بھی سچ —!

اور جاسوسوں سے زیادہ خطرناک تو ہونے سے رہے۔  
انسپیکٹر چوٹی لال نے کہا۔

”نہیں انسپیکٹر۔ اگر عام قسم کے ملزم ہوتے تو سرحد پر کتنی ایجنسیاں موجود ہیں کوئی نہ کوئی تو اسے پکڑ ہی لیتا۔ اس مرتبہ تم نھتو خاں کو پکڑنے جا رہے ہو۔ کتنے کو تو وہ عام قسم کا اٹھائی گیرا ہے لیکن گزشتہ پندرہ سال سے اس نے بھارتی علاقے میں موجود دیہاتوں میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ بڑے مضبوط پیرے سے بھی وہ بڑی آسانی سے ڈھور ڈنگر کھول کر لے جاتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اُسے گرفتار کرنے کے لیے گزشتہ پانچ سال سے تو کتنی کوششیں میں خود کر چکا ہوں۔ لیکن ہر دفعہ ناکامی کا مُتہ دیکھنا پڑا۔ چوٹی لال یہ نھتو خاں انسان نہیں چھلا وہ ہے چھلا وہ خطرے کی بومیلوں دُور سے سونگھ کر یوں غائب ہوتا ہے جیسے اُسے زمین نے نکل لیا ہو یا آسمان نے اُچک لیا ہو“

ڈپٹی کمانڈنٹ نے کہا۔

”حیرت ہے سر! آپ کو بھی۔“

چوٹی لال حیران تھا کہ ایک معمولی جانور چور بھی بی ایس ایف کے قابو میں آ رہا تھا اُس نے احتراماً اپنی بات نامکمل ہی چھوڑ دی تھی۔

”چوٹی لال اس کجمنت نھتو خاں کی چوریوں سے تنگ اگر پندرہ سولہ دیہاتوں کے رہنے والوں کا ایک نمائندہ وفد دئی تک جا پہنچا ہے۔ ان لوگوں نے باقاعدہ شکایت کی ہے کہ اگر اس مصیبت سے ان کو چھٹکارہ نہ دلایا گیا تو وہ اس پر زبردست احتجاجی تحریک شروع کر دیں گے!“

ڈپٹی کمانڈنٹ کی سنجیدگی دیکھ کر انسپیکٹر چوٹی لال بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ واقعی دال میں کچھ کالا ہے۔ اگر یہ کوئی عام قسم کا سمگلر ہوتا تو کم از کم اُسے زحمت نہ دی جاتی۔ حالانکہ اُس کے ذہن نے ابھی تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی بویشی چور اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورسز ہی کو بچا کر رکھ دے۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں سر! کہ اگر واقعی یہ اطلاع صحیح ہے جس پر ہم سرحد کی خصوصی ناکہ بندی کرنے جا رہے ہیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت نھتو کہ اس مرتبہ بچا نہیں سکے گی۔“

اُس نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”چوٹی لال۔ تم حیران تو ہو گے کہ آج میں کیسی باتیں کر رہا ہوں لیکن اپنی سابقہ نوکری اور تجربے کی بنیاد پر تم سے یہی کہوں گا کہ فی الحال کوئی دعویٰ نہ کرو۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تم ہزاری فورس کے لیے سرمایہ افتخار ہو اور کئی ناممکن اور بظاہر انتہائی مشکل مہمیں تم نے سر کی ہیں۔ لیکن اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ میں تمہیں یہی نصیحت کر دوں گا کہ اپنی چوکسی میں کمی نہ آنے دینا اور مقامی پوسٹ والوں کو اعتماد میں لیے بغیر ہی کوئی کارروائی کرنا۔ میں نے کمپنی ہیڈ کوارٹر کو ہدایت کر دی ہے کہ تمہیں جتنی فورس کی ضرورت ہو بھاری درخواست پر دے دی جائے اور ہاں انہیں بھی میں نے اندھیرے میں رکھا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس مرتبہ ناکہ بندی جاسوسوں کے ایک گروہ کے لیے کی جا رہی ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم نھتو خاں کی سرکوبی کے لیے جا رہے ہو۔ سمجھ گئے ناں۔“

ڈپٹی کمانڈنٹ نے اس طرح سرگوشی کے انداز میں اس کی طرف مٹکتے ہوئے بات کی تھی جیسے اُسے دیواروں سے بھی خطرہ ہو۔

جس طرح کمپنی کمانڈنٹ نے انسپیکٹر چوٹی لال کی شکل میں اپنا خصوصی فورس کا دستہ بنا رکھا تھا اسی طرح بی ایس ایف کی اینٹی جنس نے بھی اس علاقے میں اپنے مجذروں کا خصوصی جال بچھا رکھا تھا۔ یہ مجرمتی پوسٹوں سے رابطہ نہیں رکھتے تھے اور کوئی بھی اہم اطلاع ملنے پر براہ راست مقامی کمانڈر سے رابطہ کرتے تھے۔

موبن سنگھ کا شمار بھی ایسے ہی مجذروں میں ہوتا تھا۔

ڈپٹی کمانڈنٹ کا خاص آدمی ہونے کے سبب اُسے بہت سی رعایتیں حاصل تھیں۔ مقامی پوسٹ والوں کو تو کبھی اس کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔



صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔  
انسپیکٹر چوٹی لال نے اب اپنی آنکھوں سے وہ دُور بین لگائی تھی جس کے شیشے رات کے اندھیرے میں دن کی روشنی کی طرح منتظر عیاں کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔!!  
جس طرح ڈپٹی کمانڈنٹ صاحب نے اُسے مزمان سے متعلق اطلاعات منتقل کی تھیں اس کے بعد سے انسپیکٹر چوٹی لال نے تو یہی سمجھا تھا کہ آنے والے ایک گروپ کی صورت میں ہوں گے اور ان کے پاس جدید ترین آٹومیٹک اسلحہ ہوگا۔

لیکن —

اچانک ہی اگر وہ خود پر قابو نہ رکھتا تو اس کی ہنسی نکل جاتی کیونکہ اب دو ہیولے دُور بین کے شیشوں کی مدد سے نمایاں ہونے لگے تھے —  
یہ دونوں ایک دوسرے کے تقاب میں لیکن بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک دوسرے سے قریباً پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ درمیان میں رکھنے کے بعد بھارتی علاقے میں ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دونوں نے عام سی رائفیں اٹھا رکھی تھیں —  
آگے چلنے والے نے ٹین گن اور اُس کے تقاب میں آنے والے نے شاید کلاشنکوف تمام رکھی تھی۔

دونوں سیدھے انسپیکٹر چوٹی لال کے پھیلاتے ہوئے جال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ہی چوٹی لال نے انھیں رکتے دیکھا۔ آگے چلنے والے نے رُک کر اپنا بائیں ہاتھ بلند کیا تھا۔ یہ شاید کوئی اشارہ تھا جو اس نے اپنے تقاب میں آنے والے کو دیا اور وہ اس طرح اچانک رُکا تھا جیسے بجلی کے ٹپن سے اسے چلایا جا رہا ہو —  
آگے چلنے والا اب زمین پر اکڑواں بیٹھا شاید فضا میں خطرے کی بوسٹو گھنٹے میں کوشاں تھا یا پھر اپنے کانوں کی مدد سے کوئی آہٹ سُننے کا منتظر تھا۔

اگلا لمچوٹی لال کو چونکا دینے والا تھا جب آگے چلنے والے نے بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھی کو دائیں ہاتھ میں پکڑی ٹین گن لہرا کر خدا جلنے کیا سگس دیا اس نے بجلی کی سی

انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ موہن کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے وہ پکینی کمانڈر سے اجازت لیں گے جس کے بعد ہی انہیں کچھ کرنے کا اختیار ہوگا۔

موہن سنگھ کو اپنی اہمیت کا احساس تھا اور اُس نے بی ایس ایف کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مجبزی کے چکر میں اپنا دھندہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ مقامی سمگلروں سے اس کام میں باقاعدہ حصہ لیتا تھا اور جو کوئی اُسے حصہ دینے سے انکار کرتا اُس کے خلاف "ناک" لگوا کر اُس کو گرفتار کر دیتا۔

موہن کو ڈپٹی کمانڈنٹ نے بطور خاص یہ مہم سونپی تھی اور آج اُس کی طرف سے فراہم کردہ اطلاع کی بنیاد پر اُس نے انسپیکٹر چوٹی لال کی کمان میں اس علاقے میں ناکرہی کی ہوتی تھی۔

○

چوٹی لال نے اچانک ہی جھگت سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کا شکار اس طرف آیا ہے۔

جس جگہ اُن لوگوں نے تاکہ لگایا تھا وہاں سے قریباً ایک فرلانگ کی دُوری پر زمین میں وہ خصوصی آلات، دبا دیے گئے تھے جو بہت دُور سے آنے والے قدموں کی چاپ کٹی گنا بڑھ کر انہیں سُن سکتے تھے۔

یہ آلات حال ہی میں بی ایس ایف نے درآمد کیے تھے اور انہیں خاص موتوں پر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

"ہوشیار"

انسپیکٹر چوٹی لال نے اپنے ہاتھ میں کپڑے والی ٹاکی کے ذریعے اپنے جوانوں کو سگس پاس کر دیا اور اس کے ساتھی ایک خاص ترتیت سے پھیلاتے گئے مورچوں میں چوکس ہو کر بیٹھے گئے۔

انہیں اب چوٹی لال کے اگلے اشارے کا انتظار تھا جس کے بعد ہی انہوں نے فائرنگ شروع کرنی تھی۔ یہ تمام نوجوان ڈسپین کے سختی سے پابند اور کسی بھی ہنگامی

پھرتی سے اپنی کمر سے بندھے پھیلے میں ہاتھ ڈال کر شاید اُس میں سے گرنیڈ نکال لیا تھا۔ اچھوتی لال کو اب سمجھ آگئی تھی کہ اُس کے ڈپٹی کمانڈنٹ اتنے سیریس کیوں تھے۔ انسپکٹر چوٹی لال تو بڑے اطمینان سے ان کے لیے جال بچھاتے بیٹھا تھا کہ دونوں بکرے اُس کی مرضی کے مطابق اس میں پھنس جائیں گے اور وہ انہیں ”ہالٹ“ کہہ کر گرفتار کر لے گا۔

لیکن —

یہ تو انسان کم اور پھیلا دے زیادہ دکھاتی دے رہے تھے۔ جنھوں نے اچانک ہی اپنا رخ بدل لیا تھا اور اب تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح ایک دوسرے کی سمت اپنی پشت کر کے اچانک ہی دائیں ہاتھ گھوم رہے تھے —

اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اپنا موجودہ راستہ اچانک بدل کر اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اس طرف آنے کا منصوبہ بنایا ہوگا اور ان دونوں کے خالی ہاتھوں میں پکڑے دستی بم اس بات کا اشارہ دے رہے تھے کہ وہ زمین پر بیٹھی بطنوں کی طرح بی ایس ایف کے قابو آنے والے بھی نہیں ہیں —!

انسپکٹر چوٹی لال کے دل کی رھرکن اچانک ہی اس دقت بڑھ گئی جب اُس نے دیکھا کہ دونوں نے دائیں سمت چلتے چلتے اپنا رخ اچانک بدلا اور اب اس انداز میں بائیں طرف ایک دائرہ سبانا کر گھومے تھے کہ اپنی داست میں انھوں نے کم از کم سو ڈیڑھ سو گز دور دور تک پھیلے ناکہ بندوں سے خود کو محفوظ کر لیا تھا —

یہ جبراً اہم تھی دائرہ تھا جو انھوں نے کھیلا — دونوں کی بیسائی کا انداز تو یہ بتا رہا تھا جیسے وہ کس انتہائی تربیت یافتہ فوج کے کمانڈر گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی بھی قسم کی اچانک پیش آمدہ صورتحال سے نمٹنے کی انھوں نے خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ جس طرح انھوں نے دائیں ہاتھ دائرہ کاٹ کر اپنا رخ اچانک انسپکٹر چوٹی لال کے بائیں ہاتھ موڑا تھا۔ اگر وہ اسی طرح کا ایک اور سو ڈیڑھ سو گز کا دائرہ اس طرف سے بھی کاٹ جاتے تو پھر انسپکٹر چوٹی لال اور اُس کے مورچہ بند ساتھی سوائے ان کا منہ دیکھنے

کے اور کچھ نہ کر پاتے۔

اُن کی تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتیں —! وہ تو اپنی داست میں اس طرح جال پھیلائے بیٹھا تھا کہ دونوں ٹھیلوں کا بیج جانا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر وہ چند منٹ اور شش و پنج میں مبتلا رہتا تو دونوں بڑے اطمینان سے اس کی گرفت سے نکل جاتے گو کہ انسپکٹر چوٹی لال کے طے شدہ پلان کے مطابق ابھی یہ لوگ اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ وہ حملہ آور ہونا۔

لیکن —

وہ اس طرح بے بسی سے اپنی شکست کا تماشا تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”مود“

اُس نے چلاتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی۔

”ہالٹ۔ ہالٹ“

تمام مورچوں سے آدازیں بلند ہوئیں۔

لیکن —

دونوں نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں پکڑے دستی بم ایک دوسرے کے مخالف سمت میں بلند ہوتی لٹکار کے تقاب میں اس طرح پھینکے تھے کہ پہلے ہی ہتے میں بی ایس ایف کے دو جوان ٹھنڈے کر دیئے۔ ان بچانوں کو ایک گولی بھی فاتر کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اُن کے بازوؤں میں بچیلیاں بھر گئیں —

انھوں نے وقفے وقفے سے اس طرح دستی بم پھینکے تھے کہ انسپکٹر چوٹی لال اور اس کے ساتھی بکھلا کر رہ گئے۔ شاید اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ موقعہ آیا تھا کہ اُس کے ہمراہی نشانہ باندھے بغیر اندھا دھند فاترنگ کر رہے تھے۔

انھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دونوں گئے کس طرف ہیں اور وہ فاترنگ کس طرف

اس طرح تو جتن بھی اس کے پچھتے جاں سے نکل کر نہیں جاسکتا تھا جس طرح وہ دونوں نکل گئے تھے۔

اپنے بیس جوانوں کے خصوصی دستے کے ساتھ وہ سر جھکاتے مقامی پوسٹ کی طرف جا رہا تھا۔ پوسٹ کمانڈر نے اُس کی ایک جھک دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ چوٹی لال کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔ اُس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

یہی حال پکڑ پر موجود باقی جوانوں کا تھا۔ انہوں نے طویل مدت کے بعد پہلی مرتبہ چوٹی لال کو ناکام لوٹتے دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے انسپکٹر صاحب آپ اور خالی ہاتھ۔“

”پکٹ کمانڈر لکھی رام نے طنزیہ انداز سے کہا۔

”لکھی رام۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب گھر کے بھیدی نکا ڈھانے پڑیں جائیں تو یہی صورت حال پیش آیا کرتی ہے۔“

انسپکٹر چوٹی لال نے کہا۔

”میں دوسری بات کہوں گا ہمارا ج۔ برامت مانجے گا کبھی کبھی گھر کے لوگوں کو بھی گھر کے بھید میں شامل کر لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس طرح اپنی طاقت بڑھ جاتی ہے۔“

لکھی رام بھی پرلے درجے کا شاطر تھا۔ انسپکٹر چوٹی لال نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پکٹ کمانڈر سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

اُسے وہ رہ کر دونوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کھاتے جا رہا تھا۔ دونوں کی روانگی بھی جنوں کی طرح ہوتی تھی۔

جس طرح جن کسی انسان کے جسم سے نکلے ہوئے عامل کو کوئی نشانی دے کر جایا کرتے ہیں اسی طرح وہ دونوں بھی جاتے جاتے اُسے دو لاشوں کا تحفہ بھی دے گئے

کر رہے ہیں۔

انسپکٹر چوٹی لال نے دور بین گلی میں لٹکالی تھی اور بھگت سنگھ کو اشارہ کر دیا تھا جس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گن سے ”روشنی راؤ ونڈ“ فائر کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح کم از کم وہ لوگ دونوں کی صحیح پوزیشن کا اندازہ تو کر لیتے۔

لیکن

انہیں تو جیسے زمین نکل گئی تھی یا پھر آسمان نے اُچک لیا تھا کیونکہ فضا تو دن کی طرح روشن ہو گئی تھی لیکن وہاں سوائے گھاس کے چاروں طرف پھیلے جنگل کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس لمبی جنگلی گھاس کے آگے جس میدانی علاقے میں انہوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی وہاں سے دونوں اچانک غائب ہو کر شاید اسی جنگلی گھاس میں داخل ہو گئے تھے۔

سرحد کے دونوں اطراف میلوں تک پھیلتی اس جنگلی گھاس میں ان کے داخل ہونے جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب بھارت کی ساری فوج بھی اگر انہیں تلاش کرنے کے مشن پر نکل جاتی تو انہیں ڈھونڈ نہ پاتی۔

یہ جنگلی گھاس کا سلسلہ جسے مقامی لوگ ”بیلہ“ کہتے تھے۔ بانس کے درخت کی طرح بڑھتا اور جنگل کی آگ کی طرح پھینتا چلا جاتا تھا۔

انسپکٹر چوٹی لال کو کچھ اور تو نہ سوجھی اُس نے اپنی گن اٹھائی اور مورچے سے باہر نکل آیا۔ اُس کے ساتھی بھی اس کے تعاقب میں بیکے اور سب لوگ اندھا دھند گھاس کے اُس طویل سلسلے پر گولیوں کا مینہ برسانے لگے جس میں اُن کے خیال کے مطابق دونوں اچانک غائب ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ آسمان کی بلندی سے گرتے روشنی راؤ ونڈ کی زندگی ختم ہوتی چلی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مرتبہ پھر اندھیرا اُن کا مقدر بن گیا۔

انسپکٹر چوٹی لال کو زندگی میں پہلی مرتبہ اس نوعیت کی بے بسی کا احساس ہوا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا مقابلہ واقعی انسانوں سے تھا یا جنوں سے۔

چُونی لال نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔  
حوالہ بھگت سنگھ اُنٹے قدموں واپس لوٹ گیا اور لگے ہی لمحے دونوں بہاریئے  
اُس کے سامنے تھے۔  
اُن دونوں کا تعلق صوبہ بہار سے تھا اور حال ہی میں انہیں انسپکٹر چُونی لال کے  
خصوصی سکاڈ میں شامل کیا گیا تھا۔

”تم کون سی بیٹری پیتے ہو۔“  
انسپکٹر چُونی لال نے اچانک ہی اُن میں سے ایک سے سوال کیا۔  
”سُر! میں تو سگریٹ پیتا ہوں۔ یہ بیٹری پیتا ہے۔“  
ایک نے گھبرا کر دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”بے وقوف آج تمہاری دجہ سے دو اہم سنگھ ہمارے دو ساتھیوں کو مار کر نکل  
گئے۔ تمہاری معمولی غلطی کی دجہ سے۔“  
اُس نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔

”صاحب! میں سمجھا نہیں۔ دیشنوماں کی سوگندھ ہے صاحب اپن نے کچھ  
نہیں کیا۔“

بیٹری نوش بہاریئے نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔  
”دیکھو میں چاہوں تو ابھی تمہیں یہاں سے جیل کی کال کوٹھڑی میں پہنچا سکتا  
ہوں لیکن میں اپنے ہر ساتھی کو ایک موقعہ سنبھلنے کا ضرور دیا کرتا ہوں۔ تم آسام  
رائفل سے آتے ہو شاید تمہیں پنجاب کی طرف رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اُلو کے پٹھے  
گدھے کے نیچے۔ ہوا بچھم سے پورب کی سمت چل رہی تھی۔ تم نے بیٹری  
سنگار کھی ہو گی جس کا دُھواں اُس طرف گیا تھا جہر سے وہ دونوں آتے تھے۔  
تمہارے مورچے سے بمشکل پندرہ گز کی دُدری پردہ رکھا تھا۔ شاید اُس نے دھویں  
کی بوسونگھ لی تھی۔ ان لوگوں کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ سمجھ تم۔“  
انسپکٹر چُونی لال نے اتنے زور سے چلا کر یہ بات کی تھی کہ اُس کے باقی ساتھی

تھے۔ ا۔  
اس کے دو جوان مارے گئے تھے اور دشمن کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔  
یہ پچھتاوہ اُس کی جان کو آگیا تھا۔  
اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے جال کی طرف آتی یہ دونوں مچھلیاں اچانک  
کس طرح کھلے سمندر میں واپس لوٹ گئیں۔  
”کیس مقامی پکٹ سے تو انہیں خطرے کا سنگن نہیں مل گیا تھا؟“  
اس نے سوچا پھر خود ہی ”ناں“ میں گردن ہلا دی۔  
اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس بات کا تو بطور خاص خیال رکھا تھا  
اور پکٹ پر کڑی نظر رکھی تھی۔ یوں بھی اگر ایسا ہوتا تو وہ دونوں اس طرف کا رخ  
ہی نہ کرتے اور سرحد سے ہی واپس لوٹ جلتے۔

انہوں نے تو پاکستانی سرحد سے قریباً ایک کلومیٹر اندر ناک لگایا تھا اتنے نزدیک  
آکر اُن کے واپس لوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کہیں اس کے اپنے ساتھیوں میں تو کوئی آستین کا سانپ موجود نہیں؟  
کچھ دیر تک اس مفروضے پر ذہن لڑانے پر بھی اسے نفی میں جواب ملا اُس نے  
اپنی آنکھوں سے دُوبین لگا رکھی تھی اگر کسی نے کوئی سنگن دیا تھا تو اُسے ضرور نظر  
آجاتا۔!

اچانک ایک خیال اُس کے ذہن سے ٹکرایا اور اُس نے فوراً بھگت سنگھ کو  
اپنے پاس طلب کر لیا۔

”تین نمبر مورچے پر کون کون تھا؟“  
اُس نے بھگت سنگھ کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔  
”سُر! دونوں بہاریئے۔۔۔۔۔“  
”بلاؤ انہیں۔“

بھی اپنی جگہ لرز کر رہ گئے تھے۔

جس جوان نے یہ غلطی کی تھی وہ اچانک ہی زمین پر گرگا اور اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر معافی مانگنے لگا۔

”ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — اٹھو اور آئندہ کبھی ناکہ بندی کے دوران سگریٹ یا بیٹری نہ پینا — سمجھے —“

انسپکٹر چوٹی لال جانتا تھا کہ اُس نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔

یوں بھی اُس نے اپنے ساتھیوں کو اس نوعیت کی کوئی ہدایت جاری نہیں کی تھی نہ ہی اُسے اس بات کا اندازہ تھا کہ مفرد ہونے والوں کی قوتِ شامہ اتنی تیز ہو گی اور وہ آئیں گے بھی اس مورچے کے سامنے سے —

علی الصبح اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ بڑے بوجھل دل سے وہ بی ایس ایف کے ٹرک میں کپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف واپس جا رہا تھا —

دونوں باپ بیٹا گھنے درخت کی شاخوں میں بندروں کی طرح چھپے بیٹھے تھے۔!! سارا ڈرامہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اور اس کے اختتام پر جب بی ایس ایف کے سورسے اپنی شکست خوردہ گردنیں لٹکاتے واپس پوسٹ کی طرف جا رہے تھے تو بھی وہ اسی گھنے اور تناور درخت کے قریب سے گزر کر واپس لوٹے تھے — اُن کے فرشتوں کو بھی اس بات کا گمان نہیں رہا ہوگا کہ اُن کے مجرم لمبی جھنگلی گھاس میں ہیں بلکہ اُن کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر غائب ہوتے ہیں۔

نٹھو خاں اور اس کا بیٹا حنیف عام قسم کے سمگلر نہیں تھے — وہ تو کبھی سمگلر نہیں رہے تھے —

ان معزوں میں ضرور سمگلر تھے کہ انہیں مہینے میں دو تین مرتبہ سرحد کے آر پار آنا جانا پڑتا تھا لیکن وہ پاکستان سے ہمیشہ خالی ہاتھ آتے ادھر ادھر سے مال لے کر واپس جایا کرتے تھے —

لیکن —

یہ مال بھی وہ قیمتاً نہیں خریدتے تھے —

مفت حاصل کیا کرتے تھے —

تقسیم سے پہلے نٹھو کا گاؤں سرحد کے پار بھارتی علاقے میں تھا۔ گورداسپور کے اس گاؤں میں اُس کے آباء اجداد صدیوں سے رہتے آئے تھے۔ نٹھو چوری کے اس پیشے سے کب سے منسک تھا۔

اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا؟

اُسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اُن کے گھروں میں فرنگی پولیس کا آنا جانا رہتا تھا۔ کبھی پولیس والے اُس کے کسی بچچا کو گرفتار کرنے آتے تھے اور کبھی اس کے باپ کو لے جاتے —

دو تین مرتبہ اُس نے اپنے دادا کو بھی اُن کے ساتھ جاتے دیکھا تھا —

لیکن —

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب لوگ دو تین ماہ بعد ہی گھروں کو واپس لوٹ آیا کرتے تھے۔ یہ آگ بات کہ واپسی کے بعد کم از کم ایک مہینہ تک وہ ہٹنے چلنے کے قابل نہیں رہتے تھے کیونکہ پولیس اُن پر دخیانہ تشدد کرتی تھی اُن سے چوری کا مال نکالتے اور بیچ اُگلوانے کے لیے اُن پر تھوڑی ڈگری طریقے آزماتے جاتے تھے — کوئی

ایسی اذیت نہیں تھی جو انہیں جسمانی طور پر نہ پہنچاتی جاتی ہو —

اُن کے ایک کے بجائے پانچ پانچ ریمانڈ لے جاتے تھے اور ہر ریمانڈ پر نیا آفسر اُن پر مشق ستم ڈھایا کرتا تھا۔

لیکن —

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوتا۔

کیا مجال جو کبھی انہوں نے اپنی زبان کھولی ہو — حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ جانے کب سے چوری کے دھندے سے وابستہ تھے لیکن اُن میں سے کسی نے کبھی



اس الزام میں جیل تینوں کاٹی تھی کیونکہ ان پر پولیس کبھی الزام ہی ثابت نہیں کر سکی تھی۔ حوالاتی کی حیثیت سے ان کا قیام اسی وقت تک جیل میں ہوتا جب تک ان کا مقدمہ عدالت کے سامنے نہ جاتا۔

انگریز کا دور تھا انھیں بے شمار جہازوں کے ساتھ ایک خوبی اس دُور کی دہاں کا عدالتی نظام بھی تھا۔

جب تک ملزم کے خلاف پولیس بھروسہ ثبوت فراہم نہ کرتی عدالت سزا نہیں دیتی تھی اور ان کے خلاف ثبوت چوری کا مال ہی ہو سکتا تھا جو کبھی برآمد نہیں ہوتا تھا جہاں تک پولیس کے بنائے گواہوں کا تعلق تھا ان میں سے بیشتر گواہ تو وہ تھے جو عدالت میں نتھو کے بزرگوں کی دہشت ہی سے اپنے بیان تبدیل کر لیا کرتے تھے۔

پاکستان بنا تو نتھو اکیلا ہی زندہ رہ گیا تھا۔

اُس کا ایک ہی بھائی تھا جو ادھر دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ باقی تین بہنیں تھیں جن کے خاندان شریف اور کاروباری لوگ تھے۔

نتھو نے پاکستان بننے سے پہلے شادی کی تھی لیکن اپنے دھندے سے کبھی تائب نہ ہوا۔ وہ لوگ ادھر بھی ایک سرحدی گاؤں میں ہی آباد ہوتے تھے۔

سرحد کے پار بھارتی علاقے میں اُن دنوں ہزاروں کی تعداد میں گائیں اور بھینسیں ادارہ پھرتی رہتی تھیں۔ نتھو کا جب دل چاہتا سرحد پار سے آٹھ دس جانور ہانک کر ادھر لے آتا اور نزدیکی منڈی میں خریدت کر کے اپنا کام چلائے رکھا۔

دنوں طرف سرحدوں کی حد بندی ہو گئی اور کچھ یونٹیں بھی بن گئیں۔

لیکن

نتھو خاں کے لیے کچھ بھی سدراہ نہ بن سکا۔

اُس کے لیے اس سرحدی لکیر کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں رہی تھی کہ اب اُسے ایک کے بجائے دو مالک کی پولیس سے بچنا ہوتا تھا۔

بیرہ سال حنیف کی عمر تھی جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ سرحد

عبور کی اور کامیاب واپس لوٹا۔ پھر تو ہر تیسرے چوتھے پکڑ میں نتھو خاں اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

ایک سال میں اُن کے دو مقابلے بی ایس ایف سے ہوتے تھے لیکن دونوں میں بھارتی سرحدی پولیس اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

بھارتی سرحد سے وہ مال کسی نہ کسی طرح نکال لاتے تھے لیکن پاکستانی سرحد میں جب بھی رات کو گزرنے والے مویشیوں کا صحیح کھوجی کھرا اٹھاتے تو سیدھے نتھو خاں کے گاؤں جا پہنچتے۔

پندرہ سال کی عمر میں حنیف نے اپنے ملک کی تفتیش بھی کاٹی لی۔ جرم اُس کے خون میں رچ بس گیا تھا۔

اُس نے اپنے بڑوں سے ایک ہی بات سیکھی تھی کہ تیب ہی پولیس کے قبضے میں آؤ خالی ہاتھ آؤ۔ اور پولیس کو کبھی کچھ نہ دو۔

اُس کا چاچا کہا کرتا تھا دس دن کا پولیس ریباؤڈ دس سال جیل میں چکی پیسنے سے ہزار گنا بہتر ہے۔

یہ وہ اصول تھا جو اُسے اپنے باپ یعنی حنیف کے دادا کی طرف سے ملا تھا اور اب نسل در نسل انھیں منتقل ہو رہا تھا۔

چین شاہ جو اُس علاقے میں نیا نیا تعلیمات ہوتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے نتھو خاں کی شہرت سُن چکا تھا اُس نے اپنی پولیس تربیت کے مطابق اپنی دانست میں مجرم کے بڑے کمزور پہلو پر حملہ کیا تھا اور ایک روز جب نتھو خاں بھارتی علاقے میں چوری کرنے گیا ہوا تھا تو اُس کی غیر موجودگی میں گاؤں کے سکول سے واپس لوٹتے حنیف کو اپنے ساتھ ہانکنا ہوا تھا نے لے آیا۔

سال! چور کی اولاد۔ سکول میں پڑھنے جاتا ہے۔ ابھی کرتا ہوں تیسری پڑھائی۔

ادے کہاں گیا ہے تیرا باپ۔

چن شاہ نے پولیس کی مخصوص زبان میں نھتو خاں کو تین چار گالیاں مستادیں۔  
لیکن —

اس کے جواب میں منغلطات کا جو طومار حنیف نے باندھا اُس نے چن شاہ کو غصے سے پاگل ہی کر دیا۔ وہ اپنا ڈنڈا سنبھالتا اس طرح حنیف پر حملہ آور ہوا جیسے اُس کے جسم کی ساری ہڈیاں ایک ایک کر کے توڑ ڈالے گا۔ !!  
تھانے کا باقی عملہ تیار نہیں تھا —

اُن کے مُتہ نھتو خاں نے بند کر رکھے تھے اور ان میں سے بیشتر وہ تھے جو سرکار کے کم اور نھتو خاں کے زیادہ دفا دار تھے۔ انھوں نے پہلے تو یہی گوشش کی کہ چن شاہ اکیلا ہی حنیف سے نمٹے۔

لیکن —

جب تھانیدار صاحب نے انھیں گالیاں دیتے ہوئے اپنی مدد کے لیے پکارا تو بادلِ نخواستہ وہ بھی اس کی مدد کے لیے ہاتھ چلانے لگے۔ یہ الگ بات کہ انھوں نے پولیس کی زبان میں اپنے محسن کا حق ادا کرتے ہوئے ”ہاتھ ہلکا“ رکھا —  
حنیف خاں جب تک ہوش میں رہا تھانیدار کو گالیاں دیتا رہا —  
تین مرتبہ وہ اب تک بے ہوش ہو چکا تھا اور چن شاہ کو خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ اگر جو تھی مرتبہ بھی وہ بے ہوش ہو گیا تو دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گا —  
یوں بھی اگر اس کی کوئی ٹانگ یا ہاتھ تشدد سے ٹوٹ جلتے تو نھتو خاں اُسے بگنی کا ناچ پچا دیتا —

اُس کے ہماروں نے بتایا تھا کہ نھتو خاں بڑا سیاسی بد معاش ہے — !  
اُس نے انگریز کی پولیس کو سچا کر رکھ دیا تھا یہ لوگ اس کے سامنے کس بارغ کی مولیٰ تھے — !

مقامی تھانے کا حوالدار ہی سب سے پہلے رات گئے نھتو خاں کے گھر پہنچا

تھا —

”ماں جی —“

اُس نے نھتو کی بیوی سے کہا۔

”شیر کا بچہ ہے متھارا حنیفا — کیا مجال جو اُس نے ذرا کمزوری دکھائی ہو — بالکل باپ پر گیا ہے۔ باپ کی طرح اُس نے بھی پولیس کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ لیکن بچہ ہے ماں جی۔ چن شاہ بڑا ظالم تھانیدار ہے۔ رحم تو اُس کو چھو کر نہیں گزرا — کہیں طیش میں کوئی ہٹی سپلی نہ توڑ ڈالے — آپ کوئی بندوبست کر ہی لیں تو بہتر ہے — جانے نھتو خاں کب واپس لوٹے —“  
حنیف کی ماں نے ایک مرتبہ تو کلیجے کو ہاتھ ڈالا۔

لیکن —

دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی —

وہ نھتو خاں کی چچا زاد بھی تھی اور بچپن ہی سے یہ کچھ دیکھتی آ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ خبر کوئی گھبرا دینے والی خبر نہیں تھی لیکن اپنے لختِ جگر پر اور وہ بھی اتنی کم عمری میں ایسا وحشیانہ تشدد — ایک مرتبہ تو وہ سہم گئی۔  
نھتو خاں ہی گھر پر نہیں تھا۔

اگر وہ خود یہاں ہوتا تو پولیس کی کیا مجال تھی کہ اُس کے بیٹے پر ہاتھ ڈالتی۔  
انھوں نے نھتو خاں کی غیر موجودگی کا فائدہ ہی تو اٹھایا تھا — !  
اُسے اور تو کچھ نہ سوچھا اپنے دونوں کروں کو ساتھ لے کر ساتھ والے گاؤں میں اُس وکیل کے گھر پہنچ گئی جو نھتو خاں کا مستقل وکیل تھا۔

یہ کوئی معمولی وکیل نہیں تھا۔

نھتو خاں کے ساتھ رہ کر اُسے پولیس سے نمٹنے کا فن بڑی اچھی طرح آ گیا تھا۔ اُس نے دوسرے ہی لمحے شہر کا رخ کیا اور راتوں رات عدالت عالیہ سے بلیف لے کر اگلے روز دوپہر سے پہلے تھانے پہنچ گیا —

تھانے کا عملہ نھتو خاں کا دفا دار تھا انھوں نے بلیف کو اُس کمرے کے دروازے

ماتر تیاہاں کے چور بھی پولیس پر غالب رہتے تھے اس نے بھی اس میں عافیت جانی کہ عزت بچا کر یہاں سے نکل جاتے۔

تک پہنچا دیا جس میں حنیف خاں کو چن شاہ نے ہتھکڑی لگا کر بٹھایا ہوا تھا۔ چن شاہ خود تھانے سے باہر کسی کام سے گیا ہوا تھا جب عدالتی بلیف وہاں آ پہنچا اور اُس کی واپسی تک بلیف نے حنیف خاں کو ہتھکڑیوں سمیت برآمد کر لیا تھا۔ چن شاہ چکر اکر رہ گیا۔

”تھانیدارا۔۔۔ اس کا باپ یہاں ہوتا تو میں عدالت کی مدد بھی حاصل نہ کرتی میں نھو خاں کی بیوی ہوں۔ پولیس تو جاتر شکایت پر ہمارے گاؤں کا رخ نہیں کیا کرتی تو نے میرے بیٹے کو ناجائز گرفتار کر کے اُس پر تشدد کیا ہے۔ جب تک تیری بیٹی نہ اتروائی چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ یاد رکھنا۔۔۔“

نھو خاں کی بیوی نے جو بلیف کے ساتھ ہی تھانے میں آئی تھی اسے لٹکارتے ہوئے کہا۔

چن شاہ نے اپنی بیس سالہ ملازمت میں ایسی فاش نٹلی نہیں کی تھی۔ اُس نے روز نامے میں کوئی اندراج کیے بغیر حنیف کو جس بے جا میں رکھا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اسے اتنے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا ہو گا۔

تھانیدار چن شاہ کو تو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے جیسے تیبے وقت کو ٹالا اور نھو خاں کی واپسی پر بڑی بڑی بیچا تبتیں بھیج کر اس سے معافی کا خواستگار ہوا۔

نھو خاں کسی صورت اسے معاف نہ کرتا اگر مسجد کے مولوی فاضل شاہ صاحب اس کی طرف سے منت دار نہ ہوتے۔

”ٹھیک ہے شاہ جی۔ اگر آپ کا حکم ہے تو اُسے کہہ دیں کہ اس تحصیل سے اپنا تبادلہ کر دالے اور زندگی میں دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔“

بالآخر اُس نے فاضل شاہ صاحب کی بات مان لی۔

چن شاہ یوں بھی اب اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ دوبارہ اسی علاقے میں بھٹک

بات کچھ بھی رہی ہو نھو خاں نے اپنے بیٹے کا ٹسٹ لے لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حنیف اس کا صحیح جانشین ثابت ہوگا اب وہ اعتماد سے اُسے اپنے ساتھ کسی بھی مہم پر لے جاسکتا تھا۔

جب نھو خاں نے اس کام کا آغاز کیا تھا تو کسی بھی مہم پر روانگی کے وقت وہ لوگ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی رشی کا ٹکڑا اور کلہاڑی لے کر سرحد عبور کیا کرتے تھے۔

لیکن۔۔۔

اب زمانہ بدل گیا تھا۔

ڈاک سولے کی لڑائی کا دور ختم ہو چکا تھا اور جدید اسلحہ بد معاشوں کا ہتھیار بن گیا تھا۔

جب نھو خاں کے بزرگ یہ کام کرتے تھے تو نھتے دشمن پر حملہ کرنا اپنے لیے گالی سمھتے تھے لیکن اب دور ایسا آ گیا تھا کہ لوگ اپنے دشمن کے نھتے ہونے کے منتظر ہوا کرتے تھے۔

تب پشت سے حملہ کرنا بزدلی اور اب مردانگی جانا جاتا تھا۔

بد معاش اپنے دشمن کی عورتوں کو اپنے گھروں کی عورتوں کی طرح عزت اور مان دیا کرتے تھے لیکن اب دشمن کی ماں بہن کو سر بازار زسوا کرنا بہادری خیال کیا جانے لگا تھا۔

نھو خاں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں اسلحے کے بل بوتے پر اپنا دھندہ جاری رکھنا پڑے گا۔ وہ اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے کلاشنکوف ہاتھ میں اٹھائی تھی وگرنہ وہ لوگ تو ایک نالی یا دونالی بندوق سے زیادہ اپنے گھروں میں کچھ نہیں رکھا کرتے تھے۔

حنیف بھی یوں بڑھا جیسے بانس کا پودا بڑھتا ہے —  
اس کی جوانی قابل رشک تھی۔ نجانے کسی طرح مولوی صاحب کے مجبور کرنے پر  
اس نے سکول کی آٹھ جماعتیں پڑھ لی تھیں پھر کبھی سکول کا منہ نہ دیکھا۔ نزدیکی دیہاتوں  
کے چھوٹے موٹے بد معاش تو ان لوگوں سے سلام دعا رکھتا ہی اپنے لیے باعث شرف  
جاننے تھے۔

حنیف خاں نے کم عمری میں اسلحے کا استعمال سیکھ لیا تھا اور اپنے باپ کا بازو  
بن گیا تھا —

نخو خاں نے اب اپنے ساتھ اسلحے لے کر سرحد عبور کرنا شروع کر دی تھی اور  
بی ایس ایف کے ساتھ دو تین مقابلوں کے بعد سے اس نے مقامی سمگلروں کی طرح  
نیا کام سیکھ لیا تھا اسے وہ ناکہ بھرنا کہا کرتے تھے۔

سرحد پار سے جن چوروں کے ساتھ ان کا یارا نہ تھا وہ لوگ "مال" سرحد تک  
پہنچا کر اپنی طرف کا ناکہ لکیر دیا کرتے تھے جبکہ اس طرف سے ناکہ نخو خاں دے دیا  
کرتا اور دھندہ آرام سے چل رہا تھا۔  
اب اس نے آنا جانا بھی کم کر دیا تھا۔

لیکن —

اُس روز جب اچانک موہن سانسی اس سے ملنے آیا تو نخو خاں لالچ میں آگیا  
موہن سانسی اس کے دیرینہ ساتھی مکھے سانسی کا رشتہ دار تھا اور نخو خاں کے  
پاس سرحد پار سے بڑی اہم اطلاع لے کر آیا تھا۔

"نخو خاں — تین گھوڑیاں ہیں۔ ریس میں دوڑنے والی۔ ایک ایک کی قیمت  
لاکھ لاکھ روپے بنتی ہے۔ لاکھ روپیہ تو میرا آٹھ چکا ہے اب تک — تجھ سے بہتر  
نائب مجھے نظر نہیں آیا۔ مکھے سے تیرا ڈیریس لے کر اپنی جان پر کھیل کر تجھ تک  
پہنچا ہوں — آگے تیری مرضی —"  
موہن سانسی نے کہا۔

"موہن سہاں — میں نادائقوں کے ساتھ دھندہ نہیں کیا کرتا لیکن تو مکھے سانسی  
کا رشتہ دار ہے تو تیرے ساتھ کام کی حامی بھر رہا ہوں — سرحد تک مال تو پہنچا  
دے۔ اُس سے آگے میری ذمہ داری — میں زبان کا بندہ ہوں — جو قیمت گتی  
آدھا تیرا اور آدھا میرا۔ نقصان میں بھی ہم آدھے آدھے کے ذمہ دار ہوں گے مال  
خواہ ادھر پکڑا جائے یا ادھر پکڑا جائے —"  
"نخو خاں — تیرا حکم سراسر آنکھوں پر — میرا یہ پہلا چکر ہے۔ میں نے مال اپنے  
قبضے میں کر رکھا ہے —

دو گھوڑیوں پر تم باپ بیٹے بیٹھ جانا — میں سنبھال لوں گا۔ ہم اکٹھے ادھر  
آئیں گے اور جب تک مال فروخت نہ ہو میں — یہاں رہوں گا — میری بات  
مان اور "ناکہ بھرنے" کا چکر جانے دے۔ جو بیس تیس ہزار ان لوگوں کو دینے  
ہیں وہی ہمارے بچوں کے منہ میں جائیں گے — اور ہاں یہ کوئی عام گائیں  
بھینس نہیں ہیں — نسل دار گھوڑیاں ہیں کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے۔  
آگے تیری مرضی — میں ایک بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ جس راستے سے تمہیں  
لاڈل گا دیاں سے تالیاں بجاتے آنا کوئی مٹھاری ہوا کی طرف نہیں دیکھے گا —"  
موہن سنگھ نے اُسے مطمئن کر دیا۔

نخو خاں ایسا کچا بد معاش نہیں تھا —

اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور جانتا تھا کہ موہن سنگھ اُسے دھوکہ  
نہیں دے سکتا۔

"ٹھیک ہے موہن — میں پرسوں ہی آتا ہوں —"

نخو خاں نے فیصلہ کن لمحے میں کہا۔

تم مکھے سانسی کے گھر کی طرف آنا — گاڈوں کے باہر والی "بہک" (بھٹک)  
پر میں تمہارا منتظر ہوں گا — رات کا پہلا پہر ہو تو بہتر ہے، ہم صبح ہونے تک مال  
سمیت واپس پہنچ سکتے ہیں۔"

موہنے نے اپنی طرف سے مکمل جال بچھا دیا تھا۔

اُسی رات انھوں نے موہنے کو سرحد عبور کروا دی۔

حنیف اب بیس بائیس سال کا گھرو جوان تھا۔

جوانی بھی اُس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ نتھو خاں نے شروع ہی سے اُس کی پرورش اس انداز سے کی تھی کہ حنیف کا جسم بھی اُس کے ارادوں کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ گاؤں کے جس راستے سے وہ گزرتا۔ کئی جوانیاں اُس کے قدموں میں

بچھتی چلی جاتیں۔

لیکن۔

نتھو خاں نے بھی عقل مندی کی تھی۔

”بچہ! کبھی عورت، شراب اور جوئے کے چکر میں نہ پڑنا۔ کتے کی موت مارے جاؤ گے“

اُس نے یہ فقرہ اتنی مرتبہ حنیف سے کہا تھا کہ اُس کے لاشعور میں بس کر رہ گیا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ حنیف نے اب تک ان تینوں قبائلوں سے احتراز برتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ فولاد کی طرح مضبوط اور ارادوں کا دھنی نکلا تھا۔

بی ایس ایف کے ساتھ دو مقابلوں کے بعد سے نتھو خاں نے خود کو زیادہ ہی مستح رکھنا شروع کر دیا تھا اور آج بھی جب اُس نے سرحد عبور کرنا چاہی تو سجانے کیوں زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کا جی اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

”حنیف! یا تو آج ادھر ہی اٹک جا۔“

اُس نے سر شام ہی اپنے بیٹے سے کہا۔

”چاچا۔ تیرے منہ سے ایسی بات۔ کمال ہے۔ کیا میرے خون پر

شک کرنے لگا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے تو۔“

حنیف خاں نے حیرانگی سے باپ کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”نہیں بچے! جانے کیوں آج دل نہیں چاہ رہا۔ یوں بھی اب ہمیں اکتے

کسی مہم پر نہیں جانا چاہیے۔ تو جانتا ہے کہ اکیلی سفیان (اولاد) ہے تو میری۔ اور میں نہیں چاہتا کہ۔ یار میں نے اپنے حصے کی عمر گزار لی۔ تو سمجھتا کیوں نہیں؟ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کو کس طرح سمجھائے۔

”دیکھ چاچا۔ یہ پارٹی نئی ہے اور سودا بھی بڑا ہے۔ آج تو میں رکتے والا نہیں۔ پھر کبھی اس مسئلے پر بات کریں گے، اب منزل کھوٹی نہ کر اور اٹنڈ کو یاد کر کے چل دے۔“

حنیف نے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اچھا پتہ تیری مرضی۔ تیاری مکمل رکھنا۔“

دونوں نے تیاری مکمل کی تھی۔

دونوں کے پاس کمر سے بندھے پھیلوں میں پانچ پانچ گرنیڈ رکھے تھے۔ اس اپنے بیٹے کو ایک ہی سبق پڑھایا تھا۔

”جیسے ہی ہالٹ کی آواز آئے سالوں پر ہم پھینک دینا۔ یہ ہالٹ کا فراڈ ہی ہوتا ہے۔ ہم سے بہت تنگ ہیں یہ۔ کبھی سالے زندہ نہیں چھوڑیں گے اگر کبھی قابو آگئے۔ حنیف بچہ اپنی تو ان سے شکستہ سے ہی جنگ چل رہی ہے سمجھ گیا ناں۔“

چاچا۔ بے فکر ہو جا۔ انھوں نے ابھی حنیف کے ہاتھ نہیں دیکھے۔

اُس نے باپ کو اعتماد دلایا۔

دونوں تربیت کے مطابق سفر کر رہے تھے۔ آگے نتھو خاں تھا اور اس کے پیچھے پندرہ بیس گز کا فاصلہ چھوڑ کر حنیف آ رہا تھا۔ مکھن سانس کے گاؤں کا راستہ سب محفوظ تھا انھیں آدھے سے زیادہ سفر ”بیلے“ ہی میں طے کرنا پڑتا تھا اس کے بعد کھیتوں کے ایک مختصر سلسلے سے گزر کر وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو جایا کرتے تھے۔“

”بیلے“ کے خاتمے پر درختوں کے گہرے جھنڈ آتے تھے جہاں سے ایک مرتبہ پہلے



بھی دونوں بی ایس ایف کا مقابلہ کر کے فرار ہو چکے تھے۔  
ابھی وہ درختوں کے جھنڈے کے نزدیک ہی پہنچے تھے جب اچانک ہی نتھو خاں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اُس نے کہیں دُور سے اپنی سمت آتے سگریٹ کے دھوئیں کی بو بڑھتی لی تھی۔

حساس ناک اور کان اُسے درختے میں ملے تھے۔  
ان حالات میں تو یوں بھی اُن کی کلا کر دگی کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔

یہ کوئی کھیٹوں کا سلسلہ نہیں تھا جہاں رات کو کسان موجود ہوں۔ یہاں سواتے بی ایس ایف کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا یا پھر اُن کے قبیلے کا کوئی فرد ہوتا لیکن اس کے بھی امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

نتھو خاں نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا کہ معمولی سا خطرہ محسوس کرتے ہی اپنا راستہ بدل لو۔ گو کہ دھوئیں کی بدبو اُسے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوئی تھی۔  
لیکن۔۔۔

اُس نے دوسرے ہی لمحے راستہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چل پائے تھے جب اچانک "ہالٹ" "ہالٹ" کی آوازیں بلند ہوئیں جس کے ساتھ ہی دونوں باپ بیٹے نے پہلے سے احتیاط ہاتھوں پر پکڑے دستی بموں کے پن نکال کر آوازوں کی سمت اُچھال دیئے اور اس عمل کو تب تک دُہراتے رہے جب تک اُن کے پاس بموں کا ذخیرہ ختم نہیں ہو گیا۔ اندھیرا، بموں کے دھماکے اور اڑنے والی دُھول نے انھیں چند سینکڑی مہلت دلا دی اور یہ مہلت ان کے کام آئی۔ نتھو خاں کے تعاقب میں حنیف بھی لنگور کی سی پھرتی سے نزدیکی درخت پر چڑھتا چلا گیا۔

جب انسپکٹر چوٹی لال کے حکم پر تھکت سنگھ نے روشنی راؤ کو دیکھتے ہی شردہ کیے تو دونوں نے اپنے جسموں کو درخت کے گھنے پتوں اور ٹہنیوں میں اس طرح چھپایا تھا کہ وہ درخت ہی کا حصہ دکھائی دینے لگے تھے۔

بی ایس ایف کے جوانوں نے اپنے افسر کے تعاقب میں جنگلی گھاس پر اپنا نصف نکال لیا تھا۔ کسی نے آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتے بھی تو انہیں نہ دیکھ پاتے۔

یہ ضرور تھا کہ اگر انسپکٹر چوٹی لال طیش میں آ کر جنگلی گھاس کی بھینٹ چڑھانے والی گولیوں کا کچھ حصہ۔ درختوں پر بھی پھینک دیتا تو اسے زندہ نہیں تو دلائل ضرور مل جاتیں۔

دونوں نے بڑے اطمینان سے بی ایس ایف کی بھاگ دوڑ دیکھی تھی اور کل سکون ہونے پر ہی درخت سے نیچے اتر آتے تھے۔

اب کوئی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں دوبارہ یہیں سے گزریں گے۔ جبکہ نتھو خاں کوئی اور بھی فیصلہ کر چکا تھا۔  
موہن سنگھ کی غداروں نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ نتھو خاں موہن کو سزا دینے پر تیار ہوا تھا۔ اُس نے غدار کو معاف کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

"حنیف۔۔۔ تو واپس چلا جا"

"لیکن کیوں چاچا"

حنیف نے باپ کے بدلتے تیوروں سے حالات کا اندازہ تو کر لیا تھا لیکن اتمامِ محبت کے لیے پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا۔

"دیکھ بچے۔۔۔ ہر بات میں ضد نہیں کرتے۔ تو کیا چاہے گا کہ میری نسل ہی ختم ہو جائے۔ میں موہن کو معاف نہیں کر سکتا۔ اگر میں مارا گیا تو میرا بدلہ ضرور لینا۔ ان سالوں نے کیا سمجھ رکھا ہے نتھو خاں کو۔ کیا یاد کریں گے یہ بھی۔۔۔"

اس نے موٹی سی گال دیتے ہوئے کہا۔

"چاچا۔۔۔ دل تو نہیں مانتا لیکن تیرا حکم ہے تو واپس جانا ہوں۔"

حنیف نے آج پہلی مرتبہ اپنے باپ کو اس موڑ میں دیکھا تھا۔

جا بچہ — اللہ تیرا حافظ ہو —“  
اُس نے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپکی اور اُس کی طرف دیکھے بغیر دائیں طرف  
گھوم گیا۔

حنیف خاں اپنی جگہ کھڑا اُس وقت تک اپنے باپ کو نظریں جمائے دیکھتا رہا  
جب تک کہ اُسے اندھیرے کی چادر نے نہیں نکل گیا۔  
اس کے بعد ہی وہ بوجھل قدموں سے چلتا پاکستانی سرحد کی طرف واپس آیا  
تھا۔ سرحد عبور کرنے کے بعد وہ اپنے باپ کے انتظار میں گاؤں سے باہر بھی اُس  
لاسنے پر چھپ کر بیٹھ رہا جس سے گزر کر اُس کے باپ نے واپس آنا تھا۔

ننھو خاں غصے کی آگ میں جھل رہا تھا۔  
اگلے ایک گھنٹے بعد وہ اپنے دیرینہ ساتھی مکھے سانسی کے گھر موجود تھا۔  
مکھا اسے اچانک اپنے ہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”ننھو — تو! اس طرح اچانک —“  
”تجھے میرے آنے کی خبر نہیں تھی کیا“

ننھو خاں نے حیران پریشان مکھے سانسی کی بات کاٹتے ہوئے کہا —  
”یار تیرا گھر ہے جب جی چاہے آ — لیکن آج تو اس طرف نہ ہی آتا تو بہتر  
تھا۔ آج تو بہتر گولی چلی ہے — بڑی فائرنگ ہوئی ہے۔“

مکھے نے اُسے مکان کے اندر ایک محفوظ کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا —  
”جانتے ہو مکھے یہ گولی کس پر چلی ہے؟“  
ننھو خاں نے اپنے دیرینہ دوست سے پوچھا۔

”کیوں پہلیاں بھجوا رہا ہے یار — کُل کر بات کر — مسئلہ کیا ہے۔ تو نے  
مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔“  
مکھا واقعی پریشان ہو رہا تھا۔

”مکھے یہ فائرنگ مجھ پر ہوئی تھی — بس یوں جان لے کہ ابھی کچھ دن کی  
زندگی باقی ہے جو بچ گیا اور یہ سارا کیا دھرا تیرے اس رشتہ دار موتے کا ہے۔“  
ننھو خاں نے کہا —

”موہن سنگھ کا — وہ تو سیکورٹی والوں کا پُرانا ٹاؤٹ ہے۔ وہ سالہ تیرے  
پاس کہاں پہنچ گیا۔“

ننھو خاں ٹونٹے میں تو نہیں بول رہا —

ننھو خاں نے اندازہ کر لیا تھا کہ مکھے کو کسی بات کی خبر نہیں اور موہن سنگھ نے  
اُسے بھی دھوکہ دیا ہے۔ اُس نے مکھے سانسی کو ساری کہانی سنا دی۔

ننھو خاں — وقت کھوٹا نہ کر — یہ حساب ابھی برابر ہو جائے تو بہتر ہے  
ورنہ صبح تک وہ ہماری پہنچ سے باہر ہو جائے گا — اُٹھ میرے ساتھ چل —“

مکھا سانسی بھی یاروں کا یار تھا —

اُس کا اور ننھو خاں کا تیس برس کا یار نہ تھا۔ وہ اس دوستی کو داؤ پر نہیں  
لگا سکتا تھا۔ موہنا اسی گاؤں کا رہائشی تھا اور گاؤں کے باہر اپنی حویلی میں گہری نیند  
کے مزے لے رہا تھا جب موت کے دونوں فرشتے اس کے سر ہاتے جا کھڑے ہوتے  
انہوں نے حویلی کے اس کمرہ کا جس میں موہنا سو رہا تھا دروازہ ایک ہی جھٹکے  
سے توڑ ڈالا —

حویلی میں شاید اور کوئی نہیں تھا نہ ہی موہن سنگھ نے اس کی ضرورت محسوس کی  
تھی کہ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ رکھتا۔

دونوں کو وہاں اچانک دیکھ کر ہی اُس کی آدھی جان نکل گئی تھی —

”کیا بات ہے موہن یہاں گھبرا گیا — اوتے میں تیرا رشتہ دار ہوں اور  
یہ میرا یار ننھو خاں، ڈرنے والی کیا بات ہے بھئی۔“  
مکھے سانسی نے اپنے ہاتھ میں کپڑی کھاڑی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے  
ہوئے کہا۔

”مم میں کچھ سمجھا نہیں بھاؤ جی۔“  
 موہنے نے بشکل آواز نکالی۔

”خبردار جو مجھے کسی رشتے سے پکارا۔ کتے کی اولاد۔ تُو نے کیا نتھو خاں  
 کو بھی کوئی عام سا سٹمک سمجھ لیا تھا۔“

”مجھے نے اُس کے منہ پر اتنا زور دار تھپڑ مارا تھا کہ وہ چار پائی سے اُلٹ کر  
 دُور جاگرا اور اب دیوار کے ساتھ ہی ٹمک گیا تھا۔“

”کہاں ہیں گھوڑیاں موہن سیماں۔ دیکھ لو ہم تو اپنے وعدے کے مطابق  
 آگئے ہیں لیکن گتا ہے تُو نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔“  
 اس مرتبہ نتھو خاں کی باری تھی۔!

”نتھو خاں۔ میری حویلی پر بندھے سارے جانور کھول لو۔ میں تمہیں خود  
 سرحد تک چھوڑ کر آؤں گا لیکن پرمانا (خدا) کے لیے مجھے شتا (معاف) کر دو۔ مجھ  
 سے غلطی ہوگئی۔“

موہن سنگھ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں موہن سیماں غلطی تجھ سے نہیں مجھ سے ہوتی ہے۔ میں نے تجھے  
 پہچانتے میں غلطی کی۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ تُو نے میرے یار کا نام لے کر مجھے  
 دھوکہ دیا۔ لیکن اب میں غلطی نہیں دُہراؤں گا۔“

نتھو خاں نے پھینکارتے ہوئے کہا۔

”کہہ کر کیا مطلب۔“

موہن سنگھ کا رنگ مرنے سے پہلے ہی زرد پڑ گیا تھا۔

”موہن سیماں ہم تیرے اُن مالکوں کے لیے جن کا تُو کرتا ہے۔ تیری لاش  
 کا تھفہ چھوڑ کر جاؤں گے تاکہ اہل حق اس بات کا علم ہو کہ کبھی کبھی وقت کا پتہ اُلٹا  
 بھی گھوم جاتا ہے۔“

نتھو خاں کی آواز اُسے کسی ڈراؤنے گھنڈر سے بلند ہوتی بھوتوں کی چیخ کی

”طرح سنائی دی اور موہن سنگھ کے بارے بدن میں خوف سراپت کر گیا۔  
 ”مجھے۔ تُو۔ تو ایک مس کے ساتھ مل کر اپنے دھرم کے بندے کو قتل کرے  
 گا۔ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ دیکھ لے۔ تُو بھی بیچ نہیں سکے گا۔ یہ  
 تجھے بھی مار ڈالے گا۔“

موہن سنگھ نے ابھی تک اپنے حواس قائم رکھے تھے اور چاہا تھا کہ دھرم کے نام  
 پر ہم دونوں کو آپس میں ٹکرا کر اپنی جان بچالے۔

”تیرے جیسے ہزار ذلیل انسان میں اس ایک مسئلے پر نچھادر کر سکتا ہوں موہنے۔!  
 ”مجھے کا پارہ آسمان کو پھو رہا تھا۔“

”مجھے تُو بھی بیچ نہیں سکے گا۔ اگر میں مارا گیا تو صبح ہونے سے پہلے بی ایف  
 والے تیری بھی نکال بوٹی کر دیں گے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر مجھے کچھ بھی ہوا تو  
 یہ تیرے کارن ہوگا۔ اب بھی وقت ہے تو نکل جا اسے بھی لے جا۔ میں کالی ماں  
 کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

حرام خورد۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی تُو مکاری اور حرام خوری سے باز نہیں  
 آ رہا۔ تجھے تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔“

اتنا کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور  
 زردوار دار اس کے سر پر کیا۔

”بس۔ مجھے یاد بس کر۔ میں نے بھی اس سے حساب برابر کرتا ہے۔“

نتھو خاں نے مجھے کے ہاتھ سے کلہاڑی پکڑ لی۔

موہن کے سر سے خون کا قوارہ اُبل پڑا تھا۔

دو بزدلوں کی طرح تیج رہا تھا۔

لیکن۔

نتھو خاں کے ایک ہی دار نے اس کی ساری چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔

اُس کی گردن تن سے جُدا ہو کر دُور جاگری تھی۔

دونوں دوست اطمینان سے باہر آگئے —

انہوں نے دروازے کو دوبارہ بند کر دیا تھا اور اب سرحد کی طرف واپس جا رہے تھے —

”کھنکھناتے ہیں — جیوندیاں دے دے میلے۔ تو واپس لوٹ جا یا ر —“

اُس نے اپنے دوست سے گاؤں کی حدود سے نکلنے ہی کہا۔  
”نہیں ننھو خاں — میرا دل نہیں مانتا۔ تجھے سرحد تک چھوڑ کر جاؤں گا۔“  
”کھنکھناتے ہیں —“

ننھو خاں کو اچانک ہی خیال آیا تھا کہ صبح جب بی ایس ایف والوں کو نوین سنگھ کی لاش ملے گی تو وہ فوراً کھنکھناتے سانس کو پکڑیں گے کیونکہ کھنکھناتے کا نام ہی اُس نے استعمال کیا تھا اور اس قتل کا شک بھی اس پر ہی جانے لگا۔  
کیس بی ایس ایف والے طیش میں آکر اُسے مار ہی نہ ڈالیں یہی سوچ کر اُس نے اپنے دوست سے کہا تھا۔

”کھنکھناتے ہیں — تو چل میرے ساتھ۔ ابھی تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

”پاگل ہو گیا ہے کیا — میں جانتا ہوں جو تو سوچ رہا ہے — لیکن میرے اچانک غائب ہو جانے سے تو ان کا کیس میرے خلاف اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔“  
”نہیں ننھو خاں — میں واپس اپنے گھر جاؤں گا۔ مجھے یہ لوگ جان سے نہیں مار سکتے — سر تیج میرا خاص آدمی ہے اور لڑکے بھی سیانے ہیں وہ تھانے پکھری کو سنبھال لیں گے — میرا ایک آدھ ریمانڈ لیں گے یہ لوگ — میں کاٹ لوں گا۔“  
”مجھے اس کی پروا نہیں — اور ہاں۔ اگلے میلے شادی ہے نرملہ کی — کیس بے وقوفی نہ کر بیٹھنا میں نے یہ بات تجھ سے چھپائی ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے نرملہ کی شادی پر تیرے لیے جال بچھا رکھا ہوگا — خیال رکھنا۔“

کھنکھناتے ہیں —

”یار کھنکھناتے ہیں اب مجھ پر اتنی پابندیاں تو نہ لگا — اپنی بیٹی کی شادی میں بھی نہ

آؤں —“

ننھو کو اس بات کا دکھ ہوا تھا۔

”ننھو یار وقت بڑی تیزی سے نکل رہا ہے۔ پہلے والے حالات نہیں رہے۔“

اب سرحدیں بھی بہت غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں میری بات مان لے۔ حنیف اکیلا ہے اُس کی خاطر اب تو سرحد پار آنا جانا چھوڑ دے — یار ابھی میں تو نہیں مر گیا — میں ہر ماہ باقاعدگی سے تجھے مال پہنچا دیا کروں گا۔ میں نے اب دُنیا سے کیا لینا ہے — پانچ بیٹے ہیں۔ میری جگہ سنبھالنے کو — ننھو خاں یار اس مقابلے کے بعد تو اب تیرے لیے یہاں آنا خود کشی کے مترادف ہوگا۔“

چلتے چلتے کھنکھناتے ہیں —

”کھنکھناتے ہیں — مجھے بزدل بنا رہا ہے کیا۔“

ننھو نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

”نہیں ننھو یار — تو غلط نہ سمجھ۔ میں نے کہا ناں کہ حالات بدل رہے ہیں۔“

اب یہ سالے جس کو پکڑتے ہیں اُس پر جاسوسی کا مقدمہ بنا دیتے ہیں اور موہنے کی موت کے بعد تو وہ فوراً یہی مقدمہ بناتے گے — بس کام چلنا چاہیے ننھو خاں — وہ تو چل ہی رہا ہے۔ میری زندگی تک تو چلتا رہے گا۔“

ننھو خاں نے اس کی طرف زخمی نظروں سے دیکھا اور خاموشی اختیار کر لی۔

وہ بڑے بو بھل دل اور قدموں سے سرحد تک آیا تھا۔ راستہ ایسا تھا کہ جس پر

رُک کر وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ۳۰ سال پُرانے یار سے

بہت باتیں کرے اور اُسے کہے کہ وہ اپنے یہ الفاظ واپس لے —

لیکن —

کوئی ایسی طاقت تھی جس نے اُسے بولنے سے مانع رکھا۔

خدا جانے آج وہ اتنا بزدل کیسے ہو گیا تھا —

اُس کے دل و دماغ نے اُس سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ کھنکھناتے ہیں کہہ رہا ہے

دہی سچ ہے اور وہ اُس کی بات مان لے —

واقعی اس نے کبھی اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا —

حنیف خاں اس کی واحد اولاد تھی۔ دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر مر گئیں تھیں جن کے بعد ڈاکٹر نے اُسے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کو بھی اپنی بیٹیوں کے پاس نہیں پہنچانا چاہتا تو آئندہ ساری زندگی اس کے بطن سے اولاد کی خواہش نہ کرے —

صغرا اس کی بیوی ہی نہیں —

دُکھ سکھ کی پرانی ساتھی تھی —

اُس کے بچاکی بیٹی تھی دونوں نے بچپن سے جوانی تک کا وقت بھی اکٹھے ہی گزارا تھا۔ جراثم کی اس دُنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ ابھی اتنا بے حس نہیں ہوا تھا کہ صغرا سے متعلق اس کے احساسات کو موت ہی آجاتی —

وہ تو تصور میں بھی اُسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خدا جانے اس نے کبھی مرتبہ صغرا سے کہا تھا کہ وہ اُسے خود سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں جانے دے گا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ صغرا نے اپنی ہوش میں کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی —

اُسے اپنے خاوند سے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی —

اُس نے زندگی بھر ختو خاں کو کسی بات پر نہیں ٹوکا تھا — اُسے کبھی نہیں کہا

تھا کہ وہ سرحد پار نہ جایا کرے۔

لیکن —

جیسے ہی وہ گھر سے اپنے قدم باہر رکھتا تھا۔ صغرا سجدے میں گر کر خدا کے حضور گڑ گڑا کر اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگتی تھی —

کسی نادیدہ طاقت نے متعدد مرتبہ اُس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی کہ ختو خاں تم اپنی بہادری، چالاکی یا مکاری کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اپنی بیوی کی دعاؤں

کے مدد سے زندہ پھرتے ہو —

اُس نے دوبارہ صغرا کے بطن سے بچہ نہیں پیدا ہونے دیا۔ ساری زندگی صغرا اُس کی منت سماجت کرتی رہی کہ مزید اولاد کے لیے وہ دوسری شادی کرے۔

لیکن —

ختو خاں کبھی نہ مانا۔ وہ اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا صغرا کے ہوتے ہوئے وہ کبھی اپنی زندگی میں کسی دوسری عورت کو قدم بھی رکھنے دے گا۔

آج اچانک کھٹے نے اُس کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف دلاتی تو وہ لرز کر رہ گیا۔

واقعی اس کے لیے حنیف کی زندگی بہت قیمتی تھی —

اگر حنیف کو کچھ ہو گیا تو صغرا مرجائے گی —

پھر اس کی زندگی کا مقصد ہی کہیں باقی رہ جائے گا؛

اس نے سوچا اور گردن جھکالی —

دونوں سرحد کے نزدیک پہنچ گئے تھے —

"بس یار کھٹے — بڑا ساتھ ہو گیا — اب توجا — وہ سامنے تو ہے سرحد"

اس نے اپنے دیرینہ دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ختو خاں —"

فرط جذبات سے مغلوب ہو کر کھٹے نے اُسے گلے لگا لیا اُس کے مُنہ سے اور

کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

جلنے کیوں اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آخری مرتبہ ایک دوسرے کو مل رہے ہیں۔

"اللہ سیل —"

ختو خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ب راکھا"



بھتے سانسى نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا  
 دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو بھيگتی آنکھوں سے رخصت کیا تھا۔  
 رات دو پہر ڈھل چکی تھی جب نتھو خاں اپنے گاؤں پہنچا۔ سرحد سے اُس  
 کے گاؤں کا فاصلہ بمشکل آٹھ دس کلومیٹر تھا۔  
 گاؤں کے باہر ہی حنیف اس کا منتظر تھا۔  
 دونوں باپ بیٹا اکٹھے گھر میں داخل ہوئے تو صنراں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

## ریاست شاہ

نتھو خاں کو بھتے سانسى نے جو بات کہہ دی تھی اُس نے ایک مرتبہ تو نتھو کو ہلا  
 کر رکھ دیا اُس روز زندگی میں پہلی مرتبہ نتھو نے سنجیدگی سے سوچا کہ واقعی اُس کے  
 پاس حنیف کے علاوہ اور کیا ہے۔  
 یہ تو خود غرضی کی انتہا ہوتی اگر وہ حنیف کو بھی اپنے ساتھ کسی سرحدی مقابلے  
 میں مروا دیتا۔ پھر زندگی کی گاڑی کو کس طرح گھسیٹے؟ اُس نے تو اپنے بڑوں سے زندگی  
 میں جیسے کا یہی ایک طریقہ سیکھا تھا۔  
 یہ تو صنراں کی عقل مندی تھی کہ اُس نے گاؤں کی خاصی زمین خرید کر اپنے بیٹے  
 کے نام لگا دی تھی تاکہ مستقبل میں اُسے معاشی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے وگرنہ تو  
 یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اُن کے پاس کچھ جمع بھی رہتا۔ کیونکہ نتھو خاں نے جو کمایا جس طرح  
 کمایا اسی طرح اُڑا بھی دیا۔

اس روز پہلی مرتبہ اس نے ریاست علی کی پیشکش پر غور کیا تھا۔  
 ریاست علی اُن کے علاقے کا ایم پی اے اور نزدیکی دیہات کا رہنے والا تھا۔ اُس  
 نے دوسرے عیاشی سیاست دانوں کی طرح اپنی کوٹھی تو شہر کی ماڈرن آبادی میں بنا  
 رکھی تھی لیکن اپنا حلقہ انتخاب نہیں بدلا تھا۔

ریاست علی کے آباد اجداد نسل در نسل حکمرانوں کی غلامی کرتے آئے تھے۔ اُس  
 کے حلقہ انتخاب کے بڑے بوڑھے بتایا کرتے تھے کہ اُن لوگوں نے قیام پاکستان سے چند  
 سال پہلے اپنی ذات بدل لی تھی اس سے پہلے ان کا تعلق چھوٹی ذات کے لوگوں سے

تھا جنہیں گاؤں کے لوگ اپنی زبان میں "کئی مکین" کہتے ہیں۔

ریاست علی کے پردادا نے انگریزوں کے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا تھا۔ وہ انگریزوں کا ٹاؤٹ تھا اور اس علاقے میں سرگرم عمل تحریک آزادی کے مجاہدوں کی جاسوسی کیا کرتا تھا۔ اپنی اتنی خدمات کے عوض وہ مزارعے سے مالک کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اُس نے اس علاقے کے بڑے بڑے ڈاکو انگریز پولیس کو گرفتار کر دیتے تھے ایک ایسے ہی ڈاکو کو جسے مقامی لوگ اپنے لیے رحمت خداوندی خیال کرتے تھے لیکن جو انگریزوں کے نزدیک ڈاکو اور قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک روز ریاست علی کے پردادا نے بہانے سے اپنے ہاں بلایا اور کھانے میں زہر دے کر مار ڈالا۔

اس کی اس حرکت کو اس ڈاکو کے ساتھیوں نے معاف نہیں کیا اور اتنی اذیت ناک موت سے دوچار کیا کہ اگر اس خاندان میں غیرت نام کی کوئی چیز ہوتی تو دوبارہ کبھی اس ذلیل کام میں ہاتھ نہ ڈالتے۔

لیکن —

پردادا کی موت کا جو انعام انہیں ملا۔ اُس نے تو خاندان کی آنکھیں ہی کھول کر رکھ دیں۔ ایک دن علاقے کا انگریز ڈپٹی کمشنر دہاں آیا اور اُس نے ریاست علی کے دادا کو گھوڑی پر چڑھ کر اُسے بھگاتے رہنے کی تلقین کی اور چند گھنٹوں کے اندر وہ لوگ سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک بنا دیئے گئے۔ اراضی کے حقیقی مالکوں کو اُن کے مزارعے بن کر باقی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ریاست علی کے دادا کے ہاتھ اتنی بڑی جاگیر کیا گئی اُس کے تو خون کا خمیر ہی بدل گیا اور لوگ حیران رہ گئے کہ اب سرکار دربار میں اُس کے نام کے ساتھ شاہ کا لاحقہ بھی استعمال ہونے لگا ہے

بندو اُس کا نام تھا جو اب بندے علی شاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جاگیر پر بسنے والوں کو سختی سے اس بات کا پابند کر دیا تھا کہ اُسے شاہ صاحب کہہ کر

پکارا جلتے اگر کسی نے اُس کا شجرہ جلنے کی کوشش کی تو بندے علی شاہ نے اُسے تھانے بھجوا دیا۔!

ریاست علی کے والد کی زندگی میں چند لوگ ہی ایسے زندہ رہ گئے تھے کہ جنہیں ان کی اصلیت کا علم ہو۔ اسی دوران پاکستان کی تحریک آزادی نے زور پکڑنا شروع کیا تو ریاست علی کا باپ انگریز کاپٹن غلام بہر نے کے ناطے جی جان سے اُن کی خدمت میں جُت گیا۔ پھر اُس نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

سرکار دربار سے تعلقات کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اُسے سیاست کی سُدھ بُوہ ہو گئی اور اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ پاکستان کو معرض وجود میں آنے سے اب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی کیونکہ قدرت، اس فیصلے پر صا د کر چکی ہے۔

انگریز نے برصغیر سے جلنے کا فیصلہ کیا تو قیام پاکستان سے پیشکل چند ماہ پہلے ریاست علی شاہ کے والد نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی —

اُس کے انگریز آقا اسے ایسے سیاسی دائرے میں کھینکتے تھے کہ جن سے اُس زمانے کے سیدھے سادھے مسلمانوں کی آشنائی نہیں تھی۔ شاہ صاحب نے وہ سارے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی سطح سے اُٹھ کر تحصیل اور پھر ضلع کی سطح کے لیڈر بن گئے۔

جن بے چاروں کے ساتھ اُن کے بڑوں نے ظلم کیے تھے اُن کی آواز سیاست کے نفاذ خانے میں طوطی کی آواز جتنی حیثیت بھی اختیار نہ کر سکی تہ ہی کسی کے پاس اتنا وقت تھا کہ بیٹھ کر اُن کی دکھوں بھری داستان سنا رہے —

شاہ صاحب نے اپنی ماضی کی تربیت کے بل بوتے پر اس علاقے کی ایڈرٹیپ سے تعلقات قائم کر لیے وہ بھی کوئی بہت، اچھے لوگ نہیں تھے۔ ان میں زیادہ تعداد اُن زخمی پرستوں کی تھی جو ہوا کے بدلے رُخ کے ساتھ اُڑتے ہوئے علم لیگ کے دامن میں آکرے تھے اور اب اُس کی ڈنلی بجا رہے تھے۔

بڑے اور چھوٹے چوروں نے مل کر مقامی عوام کا استحصال شروع کیا اور یہ

ہے۔ اُن کی پارٹی ”سرکاری پارٹی“ ہوتی تھی —  
جو پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی یہ لوگ اُس کے نکلنوار اور عمدے دار ہوتے تھے۔

جیسے ہی اقتدار سے رخصتی ہوتی یہ بھی اُس سے رخصت مانگ لیتے —  
اپنے ماضی کے تجربے کی بنیاد پر بڑے شاہ صاحب کو اس بات کا گیان ہو جاتا  
تھا کہ موجودہ سرکار کی کب چھٹی ہونے والی ہے اور چھٹی ہونے سے چند ماہ پہلے وہ  
اپوزیشن میں شامل ہو کر اگلی حکومت میں اپنی سیٹ محفوظ کر لیتے —

بڑے شاہ صاحب کو بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہر شرعی عیب لگا ہوتا تھا۔ اُس  
زمانے میں حکیم، وید اور سنیاہی شاید اصلی نسخہ جات تیار کرتے ہوں۔ اب ہر چیز نقلی  
ہو رہی تھی جب خوراک اصلی نہ رہی تو نئے اور کشتے کہاں اصلی رہتے —  
بڑے شاہ صاحب کی عمر ستر سال ہونے کو آ رہی تھی

لیکن —

ابھی تک وہ جنسی بے راہروی سے نہیں ہٹے تھے —  
انہوں نے اپنی زندگی میں باقاعدہ شادیاں پانچ کی تھیں۔ اب بھی ان کی تین  
شریکِ حیات زندہ تھیں تیسری کو تو وہ چار پانچ سال پہلے ہی بیاہ کر لائے تھے

یہ سب کچھ اُن دی ریکارڈ تھا —

آف دی ریکارڈ وہ کیا کیا کُل کھلاتے تھے۔ اس کا علم ہر کسی کو تو نہیں تھا پھر بھی  
اُن کے حلقہ احباب کو ضرور تھا۔ شاہ صاحب کے شہر کی طوائفوں سے تعلقات کوئی  
رازی کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے جسم کو قائم دائم رکھنے کے لیے اپنے بڑوں کی  
طرح گشتہ جات کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اپنی  
جنسی جس کو تسکین پہنچا سکتے تھے۔

لیکن —

اب پہلے والا زمانہ نہیں رہا تھا — !  
تب تو گاؤں کا حکیم بھی کوئی کام کی دوا دے دیتا تھا۔

رسم پاکستان بننے کے بعد زیادہ زور شور سے جاری رکھی۔  
ریاست علی شاہ کا باپ جب تک زندہ رہا علاقے میں ایم پی اے، ایم این اے  
کوئٹہ، چیئرمین وغیرہ وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہو کر حکومت کے مزے لوٹتا رہا۔ سترہ  
اٹھارہ سال کی عمر سے اس نے ریاست علی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور عہدوں کی  
بندربانٹ باپ اور بیٹوں کے درمیان ہی رہتی تھی۔ اس علاقے کے تمام بڑے عہدوں  
پر شاہ خاندان ہی قابض رہتا جن لوگوں نے قیام پاکستان کے لیے اپنی جانوں کے  
نذرانے پیش کیے تھے اپنی لاکھوں کی جائیدادوں سے ہاتھ دھوئے تھے وہ بے بس  
یہ تماشا دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی زبان اگر ان کے خلاف زہرا نگل دیتی تو اپنی مکارانہ  
سیاست کے نل بوتے پر یہ لوگ بولنے والے کا منہ دولت کے زور سے بند کر دیتے  
اگر دولت کام نہ آتی تو ڈنڈا کام آجاتا اور ان کے اکثر مخالفین حادثاتی موت  
کا شکار ہو جاتے۔

کوئی ایکسٹرنٹ میں مارا جاتا —

کوئی دریا میں ڈوب جاتا —

کسی کو سانپ ڈس لیتا —

لیکن —

اصل میں یہ سب شاہ فیملی کا شکار ہوتے تھے۔ اُن کے مخالفین ان کے خلاف  
طوفان کھڑا کرتے۔

تھانے کچھروں میں مقدمات چلتے —

دکیوں کی بچتیں ہوتیں —

لیکن —

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر میں یہی ثابت ہوتا کہ مرنے والا اتفاقی  
یا حادثاتی موت سے دوچار ہوا ہے کسی نے اُسے نہیں مارا —  
ریاست علی شاہ کا باپ اور باقی خاندان کسی ایک پارٹی سے کبھی وابستہ نہیں

شاہ صاحب نے دوسرے غفلت کے ایک گاڈن سے ایک سنیاسی کو اس کی شہرت سُن کر طلب کیا تھا اور اُسے اپنے ہاں مہمان رکھ کر اُس سے چاندی کا کشتہ تیار کروا رہے تھے۔۔۔!

سنیاسی نے اپنی دانست میں تو کوئی غلطی نہیں کی تھی اور ہر دفعہ محنت سے چاندی کو آج دی۔

کبھی کوئی آج کم یا زیادہ رہ گئی ہوگی شاید اسی کے سبب کشتہ چاندی کشتہ زہر میں تبدیل ہو گیا۔

شاہ صاحب نے پہلی خوراک خالص مکھن کے ہاتھ کیالی اُن کا تو کلیجہ ہی کٹ گیا۔۔۔!!

بستر پر لیٹے لیٹے کپڑے گندے کرتے رہتے۔ ایک وہ وقت بھی آ گیا جب ریاست علی شاہ نے جو بڑھی بے جینی سے اپنے والد صاحب کی موت کا منظر تہا۔ اُن کی چارپائی دوسری خوبلی میں جہاں اس کی تیسری والدہ صاحبہ فردکش تھیں پہنچا دی۔

شاہ صاحب نے اس خوبلی میں اسی حالت میں دم توڑا کہ اُن کے جسم سے بدبو کے بھجور کے اٹھ رہے تھے۔

اُن کے مخالفین تو اسے مکاناتِ عمل سے تشبیہ دیتے تھے لیکن سنیاسی کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب نے اُس کی ہدایت کے برعکس کشتہ زیادہ مقدار میں کھا لیا تھا یہی اُن کی موت کا سبب بن گیا۔

ریاست علی شاہ نے سنیاسی کی ٹھکانی اپنے غنڈوں سے اچھی طرح کر دانے کے بعد ایک روز اُسے کرایہ دے کر اس شرط پر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ آئندہ ساری زندگی نزدیک و دُور کے کم از کم سو دیہاتوں میں اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔

باپ کی موردنی گدی پر بیٹے کا حق ہی بتا تھا۔ ریاست علی شاہ یونین کونسل کا چیئرمین تھا اور بڑے شاہ صاحب ایم پی اے تھے۔ اب اُن کی موت پر جو گدی خالی ہوتی تھی اُس پر ضمنی الیکشن ہونے والے تھے۔

یہ ضمنی الیکشن بھی معمول کی کارروائی ہوتے۔ ریاست شاہ جانتا تھا کہ اس علاقے میں آئندہ ہزار سال تک بھی اگر الیکشن ہوتے رہے تو اس کے خاندان سے ایم پی اے، ایم این اے اور چیئرمین شپ کوئی نہیں چھین سکتا۔

وہ تو نجانے کب سے بڑے شاہ صاحب کی موت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

لیکن —  
شاہ صاحب نے تو حد کر دی تھی اور مرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اُلٹا شادی پر شادی کیے چلے جا رہے تھے —

والد کی موت کی رسومات سے فارغ ہوتے ہی ریاست شاہ نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی دونوں ماڈن سے جن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی اُن کے حصے کی جاتیاد اپنے نام کھوا لی اسے خطرہ تھا کہ کہیں دوسرے بھائی یہ کام اُس سے پہلے نہ کر لیں پھر الیکشن کی تیاریوں میں جُت گیا۔

ریاست شاہ کے تو دو ہم دگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اُسے اپنی زندگی میں کوئی ایسی خیر بھی سُسنے کو ملے گی۔ اُس روز جب نذیر موچی نے آکر بتایا۔  
”شاہ جی — پلوال والے سردار بھی الیکشن کی تیاری کر رہے ہیں“ —

ایک لمحے کے لیے تو اُسے اپنی قوتِ سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ نذیر موچی سے تصدیق کی کہ اُس نے کیا یہی فقرہ کہا ہے اور جب اُس نے بتایا کہ واقعی ”پلوال“ کا سردار اُس کے خلاف الیکشن کی تیاری کر رہا ہے تو اُسے زبردست ذہنی دھچکا لگا۔

”سالے — سکھوں کی اولاد — ہم سے متھا لگائیں گے“ —

اس نے نفرت سے ہونٹ سکڑے۔

”اوتے نذیرے ذرا خبردار رہنا۔ سمجھے! ہمیں ایک ایک پل کی رپورٹ چاہیے۔ پتہ لگاؤ اُن کے پیچھے کون ہے۔ ٹھیک ہے وہ مالدار اسامی ہے لیکن اس علاقے میں کسی بدعماش پارٹی کی مدد کے بغیر کوئی الیکشن نہیں لڑ سکتا۔“

فضل شاہ نے کہا جو ریاست علی شاہ کا سوتیلا بھائی اور ریاست شاہ کے ایم پی اے ہو جانے کی صورت میں جیتیرین کی گدی پر نظریں جماتے بیٹھا تھا۔

”شاہ جی آپ کے نمک خوار ہیں۔ بے فکر رہیں۔ ایک ایک پل کی خبر دوں گا۔ آپ کو۔“

نذیر موچی نے ہاتھ باندھتے ہوئے انکساری دکھائی۔

”بھائی جان۔ میرا ایک مشورہ ہے۔“

اُس نے نذیر موچی کی روانگی کے بعد علیحدگی میں ریاست شاہ سے کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔ کہو کہو۔“

ریاست شاہ جس کے ابھی تک اس خبر سے حواس ٹھکانے نہیں آ رہے تھے

بولاً۔

”یہ سردار بڑی جوڑ ہے۔ اس کے متعلق اندازے کی غلطی نہ کرنا۔“

ہمیں اُس کے نزدیکی دیہاتوں سے دوچار بندے لینے پڑیں گے ورنہ کم از کم پندرہ

بیس دیہاتوں کے دوٹ وہ بدعماش سے ہی لے جاتے گا۔“

فضل شاہ نے اپنی راتے پیش کی۔

”تمہارے خیال سے کون سا آدمی وہاں ایسا ہے جسے ہم سردارے کے مقابلے

پر لاسکتے ہیں۔“

ریاست شاہ نے اُس کی بات کی نثر میں اترنے کے بعد پوچھا۔

”نخوخواں۔“

فضل شاہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”نخوچور۔ شاہ جی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ مانا وہ سرحد پار کا بدعماش

ہے اُس نے تین چار بڑے جاندار مقابلے بھی کیے ہیں لیکن...“

”بھائی صاحب۔ میرے ڈیرے پر روزانہ کم از کم دس دیہاتوں کے بدعماش روٹی کھاتے ہیں۔ میں آپ کو آج بتا دوں کہ ان سو پچاس دیہاتوں میں اس سے زیادہ دلیر اور سیاسی بندہ ہمیں نہیں مل سکتا۔ میری نظر اس سے زیادہ اُس کے بیٹے چینی پر ہے۔ تین چار تفتیشیں کاٹ چکا ہے وہ اور کیا مجال جو پولیس کو پلہ پکڑا یا ہو۔ جانتے ہو کوئی پولیس والا اُس کے گاؤں کی طرف منہ نہیں کرتا۔ شاہ جی۔ سردارے نے اگر ہم سے پہلے اُسے ہاتھ میں لے لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

فضل شاہ کی آخری بات نے ریاست شاہ کے دماغ کے سارے تار جھنجھا کر رکھ دیتے تھے۔

واقعی اگر اس سے پہلے سردارے نے نخوخواں کو ہاتھ میں لے لیا تو...؟

”فضل شاہ۔ تم آج ہی اُس سے رابطہ کرو۔ آج ہی فوراً۔“

اُس نے بے چینی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی جان۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں اگر نخو سے بات بن

گئی تو سردار اُن علاقوں میں کسی سے بدعماش سے دوٹ نہیں لے سکے گا۔ اور

یوں بھی ایک دہی ایسا بدعماش ہے جو سردارے سے ٹکر لے سکے۔“

فضل شاہ نے اُسے مطمئن کر داتے ہوئے کہا۔



فضل شاہ نے نذیر موچی کے ذریعے ہی نخوخواں کو ملاقات کا پینام بھیجا تھا۔

نخوخواں پہلے تو حیران ہو کہہ ان لوگوں کو اس سے کیا کام آں پڑا۔

”اوتے کوئی چکر تو تھیں ہے۔ سچ بچ بتانا۔“

حنیف نے جو اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا نذیر موچی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔



”نخو خاں تیرے ساتھ کوئی چکر کر کے اس علاقے میں کوئی زندہ رہ سکتا ہے۔ خدا کی قسم میں صرف شاہ صاحب کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ انہوں نے تمہارے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے“ اُس نے گلگھیا تے ہوتے کہا۔

”ٹھیک ہے شاہ صاحب سے کہہ دینا کہ وہ ملاقات کے لیے ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ ہمیں تو اُن سے کوئی کام نہیں۔ کنواں تو پیاسے کے پاس چل کر نہیں جایا کرتا“۔

حنیف نے کہا۔

نذیر موچی نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ لڑکا اپنے باپ کے بھی پُر کاٹے گا۔ یوں بھی اسے فضل شاہ نے بطور خاص ہدایت کی تھی کہ نخو خاں کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

”ٹھیک ہے۔ نخو خاں۔ تم بھی صبح بات کہہ رہے ہو۔ اگر انہیں کام ہے تو خود آئیں، کوئی اگر بڑا ہے تو اپنے گھر ہے تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔“

نذیر موچی نے اُس کی چا پوسی کرتے ہوتے کہا۔

نخو خاں نے دیر بعد وہ نخو خاں کے جواب سمیت فضل شاہ کے قریب کھڑا تھا۔

”دماغ خراب ہے سالے کا۔“

فضل شاہ سیخ پا ہو گیا۔

”شاہ جی۔ ہوشیاری سے۔ سوچ سمجھ کر۔ آپ نے اگر چیئر مین حاصل کرنی ہے تو دماغ کو ٹھنڈا رکھا کریں۔ یاد رکھیں اگر ریاست شاہ صاحب انکیشن ہار گئے تو آپ قیامت نہک چیئر مین یونین کونسل نہیں بن پائیں گے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔ اور یوں بھی شاہ جی مطلب کے لیے گدھے کو باپ بنا لینے میں کیا ہرج ہے۔“

ایسی باتیں اُس سے نذیر موچی ہی کر سکتا تھا۔

نذیر موچی تھا تو کئی مہینے لیکن فضل شاہ کی بڑی کمزوری بن چکا تھا۔ وہ ایک ہی دقت میں دونوں کو اندھیرے میں رکھ کر اپنا اُٹو سیدھا رکھتا تھا۔

دونوں کو عورتیں فراہم کرنا اُس کا دھنڈا تھا۔

دونوں بھائی جانتے تھے کہ نذیر موچی بڑے فردوس ہے۔ اُس نے نزدیک دُور کے دیہاتوں سے کئی عورتوں کو درغلا کر اغوا کیا اور پھر انہیں بازارِ حُسن کی زمینت بنا ڈالا۔

لیکن۔

دونوں کسی نہ کسی طرح اس کام میں اس کے حصہ دار تھے۔

نذیر موچی بھی اُن کا پشت در پشت خادم تھا اور اس خاندان کی ہر کمزور رگ پر اُس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جسے اس نے پہلے ان دونوں کی عیاشی کا سامان نہ بنایا ہو۔ اس کے بعد ہی انہیں بازارِ حُسن میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس طرح اس نے فضل شاہ اور ریاست شاہ کو ایک طرح سے اپنی کمزوری بنا لیا تھا اور خود اُن کی کمزوری بن چکا تھا۔

”نذیرے۔ تیری بات تو ٹھیک ہے لیکن اس طرح اگر اس علاقے کے چور اُٹھ کر ہمارے منہ لگنے لگے تو پھر ہماری سیاست تو ہو چکی۔“

”بادشاہ ہو! دقت کو سمجھا کر دو۔ آپ کے بڑے بوڑھوں نے حالات کو سمجھ کر اور دماغ ٹھنڈا رکھ کر ہی یہ مقام حاصل کیا تھا۔ اللہ بخشے میرا دادا بتایا کرتا تھا کہ آپ کے دادا جان بڑے شاہ صاحب انگریزوں۔۔۔۔۔“

”بس زیادہ بک بک نہ کیا کر اور نخو خاں کو کہہ دے کہ ہم کل کسی دقت آئیں گے۔“

اس نے نذیر موچی کی بات کاٹتے ہوتے کہا۔

○

اگلے روز جب دہپہر کے وقت فضل شاہ اپنے چھ سات، باڈی گارڈز کے ساتھ

جیب پر بیٹھا نھو خاں کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو اُس کے دماغ میں رہ رہ کر نذیر موچی کی یہ بات گونج رہی تھی کہ اگر ریاست شاہ الیکشن ہار گیا تو وہ قیامت نگر یونین کونسل کا چیئرمین نہیں بن سکے گا۔

اس کے شیطانی دماغ نے تو اُسے بہت دُور کی سمجھائی تھی لیکن فی الوقت اُس نے نھو خاں کی حمایت ریاست شاہ کے لیے حاصل کرنا بھی ضروری جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سردار اس علاقے کا بد معاش اور مانا ہوا سنگلر ہے۔ اس کے پاس ریاست شاہ کے مقابلے میں خرچ کرنے کے لیے دولت بھی بہت تھی اور بد معاش بھی۔

دولت میں تو یہ لوگ اُس کا مقابلہ کر لیتے۔

لیکن —

بد معاشی کی بات اور تھی —

اس میدان میں سردار اُن پر بھاری تھا۔ اگر انھیں نھو خاں کی مدد مل جاتی تو اُن کا پلڑا بھاری ہو سکتا تھا۔

نھو خاں اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی حویلی پر فضل شاہ کا منتظر تھا۔ اپنی دانست میں فضل شاہ نے اپنے ساتھ جدید اسلحے سے لیس مسلح بد معاشوں کا جلوس لاکرا انھیں مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ انگ بات کہ نھو خاں یا اُس کے بیٹے پر اس نائنٹس کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

نھو خاں نے اُن کے لیے ان کی توقع سے بڑھ کر کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کھانے سے فراغت پر فضل شاہ اُسے اکیلے ایک کمرے میں لے گیا تھا۔

”نھو خاں ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک ہی گُر سکھایا ہے — آدمی کی پہچان ہم جوانوں کی قدر کرنے والے لوگ ہیں۔ تمھاری شہرت جب ہم تک پہنچی تو شاہ صاحب نے فوراً مجھے حکم دیا کہ تم سے رابطہ کروں — نھو خاں یہ ملک بندوں سے بھرا پلڑا ہے لیکن مرد نہیں ملتے — بہت نھوڑے ایسے ہیں جو پورے دنوں کے ہیں۔ میں

تمھارے پاس دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں — تم نے خود کو کنویں میں بند کر رکھا ہے۔ اب ان چوری چکاریوں میں کچھ نہیں پڑا — کوئی بڑا ڈاکہ مارو — ایک ہی ڈاکے میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر لو — ان دیہاتوں میں ہزاروں ایکڑ سرکاری اراضی پڑی ہے یہ کس کے لیے ہے — ہمارے لیے — ہمارے دوستوں کے لیے — تم جانتے ہو سرکار دربار میں کسی کو ہمارے فیصلے کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی — بڑے شاہ صاحب کی موت سے خالی ہونے والی سیٹ پر ریاست شاہ سے زیادہ کس کا حق ہو سکتا ہے — ہماری کسی سے دشمنی نہیں — ہم پچاس سال سے سیاست کرتے آرہے ہیں — ہمیں علم ہے کہ حکومت سے کس طرح نمٹا جاتا ہے — حکومت کرنا ہمارا حق ہے اگر سردارے جیسے ٹھانی کیرے اسمیلیوں میں پہنچ گئے تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی —“

فضل شاہ بولتا چلا جا رہا تھا —

کھانے سے پہلے اُس نے دلائی شراب کی جو آدھی بوتل چڑھائی تھی اُس نے اب اثر دکھانا شروع کیا تھا لیکن اُس کے حواس قائم تھے۔

”نھو خاں — ہم تمھاری مدد چاہتے ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ تمھیں پیروں کی طرح پوجتے ہیں اگر تم کہو گے تو وہ صرف ہمیں دوٹ ڈالیں گے — ہمیں الیکشن میں تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی — گاڑیاں، اسلحہ، بندے، روپیہ جو چاہو۔ جتنا چاہو لے لو — اور ہاں یہ دوستی صرف مطلب نکلانے کے لیے نہیں ہے — جس زمین پر ہاتھ رکھو گے اُس کا قبضہ تمھیں دلا دیں گے اور سرکار دربار میں تمھارے جائز ناجائز سارے کام ہوں گے۔“

فضل شاہ نے اُس کی طرف جھکے ہوئے سرگوشی کی۔

”شاہ جی — میں آپ کا شکر گزار ہوں — لیکن ہم لوگ سیاست کو کیا سمجھیں گے۔“

نھو خاں ابھی اُسے اور ٹوٹنا چاہتا تھا۔

آج جب دہ سرحد سے واپس لوٹا تھا تو اس واقعہ کو تین روز ہونے کو آرہے تھے۔ اب اس کے لیے فضل شاہ کی پیشکش ٹھکرانا ممکن نہیں رہا تھا۔

اُس روز شام ڈلے ننھو خاں اپنے بیٹے سمیت شاہ صاحب کی جوہلی پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی آمد کی خبر سن کر ریاست شاہ خود اُس کے استقبال کے لیے آیا تھا۔ اُس نے ننھو خاں کے لیے خصوصی اہتمام کی ہدایت کر دی تھی۔

دونوں باپ بیٹے کو یہاں اس طرح عزت دی جا رہی تھی جیسے ریاست شاہ کے بجائے وہی اس علاقے کے مالک ہوں۔ اُن کا استقبال کرنے والوں میں مقامی بدماش تو تھے ہی علاقے کے مشرفا۔ بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں نوٹوں اور پھولوں کے ہار تھام رکھے تھے۔

انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں باپ بیٹے کو ہاروں سے لاد دیا۔ دونوں کے اعزاز میں شاندار ضیافت سجائی گئی تھی جس میں نزدیک دُور کے دیہانوں سے سینکڑوں لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ دونوں باپ بیٹوں کو اپنی اہمیت کا علم بھی ہو گیا کیونکہ اس ضیافت کے اختتام پر تھان نامہ نگاروں کے سامنے ریاست شاہ اور فضل شاہ نے دونوں باپ بیٹے کو معززین علاقہ کے رُوپ میں پیش کرتے ہوئے اُن کی نصابی ریبھی اُتر د دی تھیں اور یہ خبر بھی جاری کر دی تھی کہ آنے والے انتخابات میں انھوں نے ریاست شاہ کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔

ننھو خاں کی طرف سے ریاست شاہ کی حمایت میں پہلے سے لکھا ہوا بیان فضل شاہ کے کارندوں نے فوراً ہی اخبار نویسوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ غرض دونوں کو متاثر کرنے کے لیے ریاست شاہ نے ڈرامے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

رات ڈھل رہی تھی جب انھوں نے واپس جانے کی اجازت چاہی "میں ننھو خاں — اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ہمارے ڈیرے

"ہم سمجھائیں گے ننھو خاں — ہم سمجھائیں گے۔ ارے تمہیں کو سنا بنا دیں گے علاقے کا۔ تمہا نیندار کی جرات نہیں ہوگی کہ تمہارے سامنے ادبچی آواز سے بول سکے۔ سرکار دربار میں کرسی ملے گی تمہیں۔"

فضل شاہ نے تمقہ لگاتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔ میں ایک دروز میں آپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دوں گا۔ مجھے اپنے بیٹے سے زمشورہ کرنے دیجئے۔"

ننھو خاں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ننھو خاں تمہارا بیٹا بڑا گھبر و جوان ہے۔ لیکن اکیلا ہے۔ اُسے سرحد کے آ پار والے دھندے سے الگ کر لو۔ اُس نے تمہاری نسل کو آگے چلانا ہے۔

سیاست میں آجاؤ۔ آرام سے گھر بیٹھے عیش کر دو گے۔ تمہارے پاس بدمعاشوں کی پوری فوج موجود ہے تمہیں کیا ضرورت ہے ان جھنجھٹوں میں پڑنے کی۔"

فضل شاہ نے بیٹے کے نام پر اس کی کمزورگی دبا دی۔

"ٹھیک ہے شاہ جی — میں بھی سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا ناں کہ میں سرکار کو دو تین روز تک جواب پہنچا دوں گا۔"

ننھو خاں اب بھی وقت کو ٹال رہا تھا۔

"یہ رکھ لو — ہماری طرف سے پہلاندرا نہ ہے۔ تمہیں فیصلہ کرنے

میں آسانی رہے گی۔"

یہ کہتے ہوئے فضل شاہ نے اپنے دائیں ہاتھ دھرا بریف کیس اُس کی طرف

بڑھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ جس طرح جلوس کی شکل میں آتے تھے اسی طرح واپس لوٹ گئے۔ ان کی روانگی کے بعد ننھو خاں نے بریف کیس کھولا تو وہاں پچاس ہزار روپے موجود تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ فضل شاہ جو کچھ کہہ رہا

ہے۔ سچ ہے اور وہ اس دوستی کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔

پر آتے ہو تو آج رات ہمارے ہی مہمان رہو گے۔“  
فضل شاہ نے اُس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے دوسرا  
کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا۔

اُس کا شیطان ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔  
اس نے کھلے گریباں کی قمیص میں سے حنیف خاں کے بازوؤں کی پٹری مچھلیا  
دیکھ لی تھیں۔

اسے حنیف خاں کی صورت میں مستقبل میں اپنا آہنی حصار نظر آ رہا تھا اور اسے  
حنیف خاں کو آج ہی قابو کرنا تھا۔

نہتو خاں کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے اُسے رات ٹھہرنے پر مجبور کر  
دیا۔!

فضل شاہ اسے اپنے ساتھ ہی حویلی کے دوسرے حصے میں لے گیا تھا۔ جہاں  
ریاست شاہ پہلے سے اُس کا منتظر تھا۔

دونوں کو مصروف گفتگو چھوڑ کر وہ باہر آ گیا۔  
ایک طویل برآمدہ طے کرنے پر اُسے نذیر مویجی کی صورت دکھائی دی۔

”یہاں کیا جھک مار رہے ہو۔ کچھ بندوبست ہو یا نہیں؟  
اُس نے نذیر کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

”شاہ جی۔ ایسا بال لایا ہوں کہ حنیف خاں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں  
گی۔“

اس نے جھپٹتے ہی کہا۔  
”نذیرے شکار بیچ کر نہ جانے پاتے۔ ایسا نیکنجہ ڈالو کہ کبھی نکل نہ سکے۔“  
فضل شاہ کے چہرے پر برستی لعنت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

”شاہ جی۔ آج تک کوئی بیچ کر جا بھی سکا ہے۔ ایسے کئی نذیرے کی  
زندگی میں آتے اور گتے۔ آپ دیکھتے رہتے۔ اگر آپ کا بندہ بے دام نہ بنا

دوں تو نذیر نام نہیں میرا۔“  
نذیر مویجی نے بے حیائی سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔  
”پیسوں کی پرواہ نہ کرنا۔ لیکن پہلا حملہ زور دار ہونا چاہیے۔“  
فضل شاہ ابھی تک غیر مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

”شاہ جی۔ شہر سے زہراں بائی کو لایا ہوں۔ اپنے کوٹھے سے باہر قدم  
نہیں نکالتی۔ میرا مولا ہی جانتا ہے کیا کیا نخرے اٹھانے پڑے ہیں۔ ایک  
مرتبہ تو حنیف خاں کے ہوش اڑا کر رکھ دے گی۔“

نذیر مویجی اپنے نمبر اور فضل شاہ کا خرچ بڑھا رہا تھا۔  
”شاہ جی۔ گتے ہیں آپ کے۔ غلام ہیں آپ کے۔ جو بات آپ نے

ایک مرتبہ کہہ دی۔ وہ کہہ کر بے فکر ہو جایا کیجئے۔“  
اُس نے فضل شاہ کی تسلی کر داتے ہوئے کہا۔



مین اُن لمحات میں جب ریاست شاہ نہتو خاں اور علالتے کے دیگر معززین  
کے ساتھ حویلی کے دوسرے حصے میں گپ شپ کر رہا تھا اور انہوں نے نہتو خاں  
کا دل پہلانے کے لئے نذیر دیک ڈور کے دیہاتوں سے ہیر اور مرزا صاحبان گانے والے  
اکٹھے کر رکھے تھے، حویلی کے دوسرے حصے میں زہراں بائی کے بجرے کا آغاز ہو  
چکا تھا۔!

یہ بجر چونکہ حنیف خاں کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ لہذا اسی کو مہمان خصوصی  
ہی حیثیت دی جا رہی تھی۔

زہراں بائی کے ایک ایک بل پر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔!  
وہ جان بوجھ کر حنیف خاں پر گر تہی چلی جاتی تھی جبکہ نذیر اور فضل شاہ حنیف  
خاں کے سر سے نوٹوں کے بندل بچھا کر رہے تھے۔!  
حنیف خاں کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

اُس کا باپ خاندانی بد معاش تھا —  
 وہ جانتا تھا کہ آگ اور گھی کے ملاپ سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اُس نے  
 ساری زندگی غیر عورت کے جسم کو چھو کر نہیں دیکھا تھا۔  
 اُس نے حنیف خان کو ایک ہی بات سنجائی تھی کہ عورت کا ساتھ مرد کو بُرزد  
 بنا دیتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا —

”پُتر! جوان بڑی بڑی تفتیش کاٹ لیتے ہیں۔ لیکن عورت ذات کے دام میں  
 پھنسنے کے بعد اُن کی جواں مردی صباں کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اُسے خوف  
 آنے لگتا ہے — سب کچھ چھوڑ کر وہ عورت کا ہو جاتا ہے — سب کچھ چھوڑ کر —  
 نحقہ خان نے اپنے بیٹے کو دودھ گھی میں پالا تھا۔ اُسے جواں مرد بنا یا تھا۔ اُس  
 کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر دلیری بھری تھی۔

لیکن —

حنیف خان تو ایک ہی جھٹکے میں منہ کے بل آن گرا — !  
 اُسے آج پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کا ”چاچا“ تو اس سے ساری زندگی  
 جھوٹ بولتا آیا تھا —

عورت کا قرب تو مرد کو دلیر کر دیتا ہے —

زہراں بائی کے سامنے وہ ”راجا اندر“ بنا خود کو دُنیا کا سب سے بڑا جواں مرد  
 سمجھ رہا تھا۔ جب وہ بل کھا کر لہراتی ہوتی اس کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ  
 کر اُس کے گالوں پر نذیر موچی اور فضل شاہ کی طرف سے رکھے گئے نوٹ اٹھاتے  
 ہوتے اس کے گالوں پر ہلکی سی چٹکی بھرتی اور اس کی طرف جھک کر اپنے گریبان  
 کی نمائش کرتی تو حنیف خان کے خون میں چنگاریاں چٹختے لگتیں —

اُسے اپنا انگ انگ مستی میں ڈوبا محسوس ہوتا —

اس کا سینہ پھول کر چھ انچ اور پھیل جاتا —

بازوؤں کی پھیلیاں ترپنے لگتیں —

زہراں بائی کوئی مہاراجہ پٹیلہ کے دربار کی طوائف تو تھی نہیں — !  
 اُسے خیطر رقم دے کر یہاں اسی مقصد کے لئے بلایا گیا تھا۔ حادثات کا دھارا  
 مخالف سمت بہہ رہا تھا۔ اُسے بھی علم تھا کہ اب تو گھر کا خراج چلانا کاردار ہے۔  
 بازار ۲ گھنٹے میں دو تین گھنٹے کے لئے کھلتا تھا۔

اور ماحول — ایسا دہشت زدہ کہ تماش بین ادھر کارُخ کرتے خوف کھاتے  
 تھے۔ پولیس والے تو یہاں رات دیر گئے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے گاہوں کو ہانک کر  
 تھانے لے جاتے تھے وہ تماش بینوں کو کہاں معاف کرتے — !  
 فضل شاہ کی طرف سے اُسے بیس ہزار روپے اس کے ناز و ادا کی قیمت نہیں  
 دی گئی تھی۔

نذیر موچی نے اُس کی ماں سے صاف کہہ دیا تھا۔

”بی بی — خیال رکھنا رات، وہیں گزارنی ہے زہراں بائی نے — اور ہر  
 صورت یہ کارنامہ انجام دینا ہے۔ شاہ صاحب کا حکم ہے“ —  
 ”نذیرے مولاتیرا بیڑہ غرق کرے ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہم سے اب ایسے دھڑے  
 بھی کروائے گا“ —

دے کی دائمی مریض عنایت بائی نے کہا۔

”ٹھیک ہے بی بی تیری مرضی — نہ لے۔ میں تو تیری بھلائی کو کہہ رہا تھا۔ اس  
 سے آدھی رقم میں کسی تھیسٹر میں کام کرنے والی کو لے جاتا ہوں — وہ تو پُراتے تعلقات  
 کی شرم مار گئی کہ میں تیرے پاس . . .“

یہ کہتے ہوئے اُس نے اٹھنا چاہا تو بوڑھی نانکھہ پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

اُس نے کھانتے کھانتے نذیر موچی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا —

”کمال ہو گئی — غصے والی بات کیا ہو گئی ہم سے — لا ادھر کر —“

اُس نے کھانسی رکنے پر کہتے ہوئے جھپٹ کر نذیرے کے ہاتھ سے دس ہزار روپے  
 کا بٹل کھینچ لیا اور اُسے گننے بیٹھ گئی۔

”نذیرے تیرا بیڑہ غرق ہو جائے۔ یہ تو دس ہزار ہیں۔“  
 اُس نے اپنے پان دان کا ڈھکن اٹھا کر نوٹ اس کے نیچے رکھتے ہوئے کہا  
 ”سمجھا کر بی بی۔ دس پندرہ ہزار تو وہاں ہو جائیں گے۔ اتنی رقم تو میں  
 مجرے کے چکر میں دلوا دوں گا۔ اگر پھر بھی کوئی کسر رہ گئی تو وہ بھی نکل جائے  
 گی۔“

نذیرا بھی اپنے میدان کا شمشور تھا۔

اس نے ساری زندگی ”دلّالی“ کی کمائی کھائی تھی۔  
 کچروں کی رگ رگ سے اُسے آشنائی تھی:

نذیرے تجھ پر اعتبار کر رہی ہوں۔ بچی کا خیال رکھنا۔ زیادہ دیر نہیں ہونی

چاہیے۔

صبح ناشتہ کرتے ہی اُسے روانہ کر دینا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔

عنایت بائی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بی بی۔ ہمارا تمہارا کوئی نیا ساتھ نہیں۔ پُرانا ساتھ ہے اور رہنا ہے۔

ایک دوسرے سے اگر ہم تعاون نہیں کریں گے تو کون کرے گا“

نذیر موچی نے اُس کی طرف دیکھ کر حسبِ عادت آنکھ دبائی تھی۔

زہراں بائی اور اس کے سازندوں کو وہ اپنے ساتھ ہی شاہ صاحب کی بچیز

جیب میں لے کر آیا تھا۔ زہراں کو اس کی ماں نے ساری بات سمجھا دی تھی اب

نذیر موچی نے اس کے شکار کی نشاندہی کرنی تھی۔

زہراں بائی نے جب پہلی نظر میں اپنے شکار کو دیکھا تو اسے حنیف خاں پر دم

بھی آیا تھا کہ اب تمہاں سنبھال کر رکھی اُس کی جوانی یوں کوٹریوں کے مول بنے

جا رہی تھی۔

لیکن

رحم کرنا اس کے پیشے کی توہین کے مترادف تھا۔

اُس نے اپنے کام کی قیمت وصول کر لی تھی اور اب اُسے بہر صورت ”خوشگوار  
 فریضہ“ انجام دینا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ فضل شاہ اور ریاست شاہ کی منقافی سیاست پر کتنی مضبوط  
 گرفت ہے اور جب بھی ان پر کوئی بُرا دقت آتا تھا تو یہی لوگ ان کی مدد کو آتے  
 تھے۔

منقافی تھانے کچھری سے منٹنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو شاہ صاحب

کا خصوصی کرم تھا کہ اس کا کوٹھا ابھی تک پولیس والوں کی دست بُرد سے محفوظ تھا

اور بازار کی دوسری طوائفوں کے برعکس وہ تھانے میں صرف ماہانہ پہنچا کر ہی اپنا اُلو

میدھا کر رہی تھی ورنہ تو ہر دوسرے تیسرے روز تھانیداروں کی طرف سے کوئی نہ کوئی

فرمائش ہوتی رہتی تھی اور اس کجنت تھانے میں کوئی ایک تھانیدار تو تھا نہیں

یہاں تو موئے پانچ چھ چھوٹے بڑے تھانیدار تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر

تماش بین جن کی فرمائش شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی تھیں۔

عنایتی کے لیے یوں بھی اب یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ گزشتہ دو سال میں اس

نے قریباً آٹھ مرتبہ زہرا بائی کی ”نٹھ“ کی رسم ادا کر لی تھی اور اس کے ذریعے اتنے

پیسے کمائے تھی کہ اسی سے تین مکان کیے بعد دیگرے خریدے تھے اور ان کا کرایہ بھی

کچھ کم نہیں تھا۔

## گرفت

بُڑھ ختم ہو گیا تھا۔

رات ایک پہر ڈھل رہی تھی جب زہراں بائی نے نذیر موچی کو آنکھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ زہراں بائی نے اسے سنگل دے دیا تھا کہ شکار قابو آچکا ہے اور اب وہ کسی بھی لمحے اس مُرغے کو ذبح کر سکتی ہے۔

سازندے بڑھی ہوشیاری سے ایک ایک کر کے ہرک گئے تھے۔ اب وہاں زہراں بائی، فضل شاہ، نذیر اور حنیف خاں ہی رہ گئے تھے۔ زہراں بائی نے اس درمیان حنیف خان کو اس اس انداز سے اپنا آپ دکھایا تھا کہ اس کی رال بے ساختہ ٹپکنے لگی تھی۔

”نذیرے — کچھ پانی دھانی کا بندوبست کر د حنیف خان ہمارا مہمان ہے۔“

مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے!

فضل شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جو حکم شاہ جی —“

نذیر موچی اتنا کہہ کر اٹھا اور اس الماری کی طرف چل دیا جس میں انگور کی بیٹی بند تھی اور اس کے استعمال کا وقت ہی تھا۔

اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے اس نے زہراں بائی کو آنکھ کا اشارہ کر دیا تھا۔ اب حنیف سے اس طرح چپٹ کر بیٹھ گئی تھی کہ حنیف خاں کو ہوش خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ نذیر موچی نے شراب کے گلاس خود تیار کیے اور حنیف خان کا گلاس

زہراں بائی کو تھا دیا جس نے کمال ہوشیاری سے حنیف خان کے ”ناں ناں“ کرنے کے باوجود گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اُس کے درجنوں مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ سرحد عبور کی تھی۔ سانیوں کے ساتھ وہ لوگ سمگلنگ کا دھندہ کرتے تھے جن کے ہر گھر میں غیر قانونی شراب تیار کی جاتی تھی۔

لیکن —

کیا مجال جو آج تک اس نے اسے چھو کر بھی دیکھا ہو۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زہراں بائی نے پورا پیگ اُس کے حلق میں اتار دیا۔ جس نے رہی سہی کسر روپی کر کے جلتی پرتیل کا کام کیا۔

حنیف خان کو اپنے وجود میں خون کی جگہ سرور و انبساط کی لہریں دوڑتی دکھائی دینے لگی تھیں۔

”مجھے تو نیند آرہی ہے — میں چلوں۔“

یہ کہتے ہوئے منصوبے کے مطابق فضل شاہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر گھنی مونچھوں کے نیچے جم گئی تھی۔

نذیر موچی نے اُس کے لیے واقعی بڑا معرکہ مار لیا تھا۔ جو اُس کے تعاقب میں

اب خود بھی باہر آ گیا تھا۔

”واہ نذیرے کمال کر دیا تو نے۔ خوش کر دیا ہے مجھے بلے بلے —“

فضل شاہ نے اُس کی گھر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی آپ کے نمک خوار ہیں۔ آپ کے حکم پر آسمان سے تارے توڑ کر

لا سکتے ہیں۔ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا۔“

نذیرے نے اسیل مُرغ کی طرح گردن پھلائی۔

دونوں آرام کرنے کے لیے حویلی کے دوسرے حصے میں چلے گئے۔ اب اس

کمرے میں حنیف خان، زہراں بائی اور شیطان باقی رہ گئے تھے۔

شراب و شباب کے نشے میں مدہوش حنیف خان کو اُس نے سہارا دے کر آرام پینگ پر لٹایا اور خود اُس کے پہلو میں لیٹ گئی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

حنیف خان کو کچھ سمجھ نہ آسکی۔ وہ خود دُنیا مافیہا سے بے خبر عیش و نشاط کے ایسے ایسے جہانوں کی سیر پر نکل گیا تھا جن کا تصور اُس نے جیتے جی کبھی نہیں کیا تھا۔ زہرا بائی نے فضل شاہ کا حتیٰ تک ضرورت سے زیادہ ہی ادا کر دیا تھا۔ اُسے بھی مدتوں بعد حنیف خان جیسا جواں مرد میسر آیا تھا۔

وہ پیشہ ور طوائف ہونے کے علاوہ ایک عورت بھی تھی اور آج اُس پر یہی عورت ضرورت سے زیادہ غالب آگئی تھی۔ اُس نے جی بھر کے تسکین حاصل کی اور دیر گتے تک حنیف خان کو سرور و انبساط کے پنگھوڑے میں ڈالے رکھا۔



حنیف خان کو ہوش آیا تو اُسے احساس ہوا کہ رات عالم مدہوشی میں اُس نے وہ کچھ کر دیا ہے جس سے اُس کے باپ نے ساری زندگی اُسے روکے رکھا۔ نتھو خاں نے حنیف کو کنواری لڑکیوں کی طرح اپنا بدن سنبھال کر رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ اُس کا بیٹا یوں ایک معمولی سی طوائف کے ہاتھوں اپنی عصمت لٹا بیٹھے گا۔

حنیف خان کو احساس تھا کہ جس گناہ کا ارتکاب اُس سے ہو گیا ہے اگر اس کا بھینک بھی اُس کے باپ کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ اُسے کوئی مار کر خودکشی کر لے گا۔

لیکن —

دوسری طرف اُسے اپنا بدن پھول کی طرح ہلکا پھلکا دکھاتی دینے لگا تھا۔ خود کو ابھی تک فضا میں تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں زہرا بائی صوفے پر ٹیک لگاتے بیٹھی تھی۔ اُسے اٹھنے دیکھ کر وہ حنیف خان کے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔

”اب مجھے اکیلی نہ چھوڑنا۔ اگر مرد ہو تو آج کی رات کو ضرور یاد رکھنا۔“ اُس نے اس انداز سے حنیف خان کو کہا تھا کہ بیک وقت اس کی مردانگی اور بہت کو چیلنج کر دیا تھا۔

حنیف خان نے گردن جھکالی —

زہرا بائی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس سے لپٹ گئی۔

”حنیف شہر میں مجھے ملنے آؤ گے“ —

اُس نے اچانک ہی اُس پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں — آؤں گا“

حنیف خان کے لیے سواتے ہاں کے اندر کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا شیطان نے پہلی ہی رات اس کے اندر بڑا مقبوط مورچہ جمایا تھا۔

”مردوں والا وعدہ کرتا۔“

زہرا بائی نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”تم بار بار میری مردانگی کو کیوں آزما رہی ہو — کہہ دیا ناں — کہ ضرور آؤں گا“

حنیف خان نے چڑھ کر کہا۔

”حنیف تم تو برا مان گئے۔ دراصل ہم بُرے لوگ ہیں حنیفے لیکن ہمارے

بیلے میں بھی دل ہوتا ہے۔ حنیف خان۔ میں گانے والی طوائف ہوں —

پیشہ در عورت نہیں — مولا حسین کی قسم ہے۔۔۔“

اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے باقاعدہ اُسے یہاں شروع کر دیتے۔

حنیف خان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا دل مٹھی میں لے کر زور سے

بھینچ دیا ہو۔ روتی روتی طوائف کے آنسو اُس کی مردانگی کو گھلانے کے لیے کافی تھے۔

”زہرا خدایا کے لیے چُپ ہو جاؤ میری زبان پر اعتبار کرو — میں تم سے وعدہ

کرتا ہوں کہ میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا — میں تمہارے پاس آؤں گا۔“



اُسے اب طوائف سے محبت سی ہوتی لگی تھی۔

”حنیف خاں۔ یہ بات نادر سے اور میرے درمیان رہنی چاہیے۔ تم نذیر موبچی کو اعتماد میں لے لینا۔ اُس کا آنا جانا ہمارے ہاں رہتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا حنیف خاں اگر شاہ جی کو علم ہوا کہ میں نے تمہارے ساتھ... تو وہ مجھے گولی مار دیں گے۔“

وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”تمہارے شاہ جی کی ایسی تیبی۔“

اُس نے فضل شاہ کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”اُس کی جرات نہیں کہ تمہاری طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔ زہرا بے فکر رہنا۔ میں فضل شاہ کی...“

”نہیں نہیں حنیف خدا کے لیے ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔“

اُس نے حنیف خاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”حنیف اگر تم میرا ساتھ دو تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی لیکن میری التجا ہے کہ فضل شاہ سے بنائے رکھنا۔ اُس کے بہت بے ہاتھ ہیں۔ وہ ممکن ہے طاقت میں تمہارا مقابلہ نہ کر سکے لیکن سیاست میں تم اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

حنیف اگر تم نے فضل شاہ سے دوستی قائم کر لی تو ساری زندگی سُکھ سے گزرے گی میری بھی اور تمہاری بھی۔ حنیف میرے ساتھ وعدہ کر دے کہ تم فضل شاہ سے کبھی نہیں بگاڑو گے۔“

اُس نے بے وقوف نوجوان سے دوسرا وعدہ بھی لے لیا۔

زہرا بھی عنایت بائی کی بیٹی تھی۔

سات پُشتوں سے وہ لوگ یہی پیشہ کرتے آ رہے تھے۔

مرد کو آنکھوں میں تو لٹا اور اُس کا صحیح صحیح مول لگانا ہی تو اُس نے سیکھا تھا۔ اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ حنیف خاں کی شکل میں اُسے مستقبل کا ایک مضبوط سہارا

میرا آسکتا ہے۔

ایسے بے وقوف اور مالدار بہادروں کی اس سے زیادہ ضرورت اور کے

ہی سکتی تھی۔

اگر یہ شخص فضل شاہ کی کمزوری بن جاتا تو بھی زہرا بائی اُسے اپنی کمزوری بنا کر فضل شاہ کے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔

اُس نے بجائے فضل شاہ کے ہاتھوں میں کھیلنے کے اُسے خود اپنے ہاتھوں

کھلانے کا منصوبہ ابھی سے بنا لیا تھا۔

اُس کے پاس حنیف خاں کو دینے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس نے پہلی ہی رات حنیف خاں کو جگر دیا تھا اور مستقبل میں اس جگر کو مستقل کر کے وہ فضل شاہ کی کمزوری بھی بن سکتی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ اُس کے لیے بہت بڑی کامیابی ہوتی۔

اُس نے پندرہ بیس منٹ کی گفتگو ہی میں حنیف خاں کو باندھ کر رکھ دیا تھا اور اب اُس کے اندر موجود تر بیت یافتہ طوائف نے اُسے یقین دلادیا تھا کہ یہ بچہ اُس کے جال میں مکمل پھنس چکا ہے۔

حُسن کے مضبوط پتھرے میں باندھ کر وہ اُسے جب چاہتی اپنی مرضی سے چوری کھلا کر اپنی مرضی کی بولی بولنے پر مجبور کر سکتی تھی۔



اچانک ہی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

زہرا نے خود اُٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے نذیر موبچی دانت نکالے کھڑا تھا۔

”بھئی کیا رازد نیاز کی باتیں چل رہی تھیں۔ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔“

اُس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”نذیر سے اپنے ہمان سے پوچھ لو۔ ہم نے اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں

کی“

”مجھے اس کا انداز گفتگو پسند نہیں آیا۔“

اس کے باہر نکلتے ہی زہراں باقی نے کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں حنیف خاں کہ فضل شاہ کو اپنی مٹھی میں لے لو۔ اور اس کینے کو نکال باہر کر دو۔“ اس نے تو جیسے شاہ جی پر کوئی جادو کر دیا ہے۔ بہت سر جھٹھا رکھا ہے اسے شاہ جی نے۔ دونوں ہاتھوں سے انھیں لوٹ رہا ہے۔ حنیف خاں اگر تم ذرا سی دانشمندی کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

زہراں باقی نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے زہراں تم جیسا کہو گی دسیا ہی ہوگا۔ بے فکر رہنا میں شہر میں ضرور ملنے آؤں گا تم سے۔ اگر اس نے کوئی خخرہ وغیرہ کیا تو اکیلا ہی آ جاؤں گا۔ مجھے کوئی شہر والے کھا تو نہیں جائیں گے۔“

اُس نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”ناں حنیف خاں خدا کے لیے یہ غضب نہ کرنا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اگر تم اکیلے آتے تو میری ماں کو فوراً شک گزرے گا اور وہ مجھے ایسا غائب کروائے گی کہ پھر میرا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ تم ابھی اس موزی کے ساتھ ہی آنا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی ماں کا اعتماد حاصل کر لوں گی۔“

زہراں باقی نے مستقبل کے خدشات کو ذہن میں ابھی سے رکھتے ہوئے کہا۔

”تمھاری مرضی زہراں باقی۔ لیکن اتنی پابندیاں لگانا ٹھیک نہیں۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا دیا۔

”نہیں حنیف خاں۔ کس کی مجال ہے جو تم جیسے جوان مرد پر پابندی لگا سکے۔ میں تو احتیاط کا دامن تھامنے کی بات کر رہی ہوں۔ اور میں کوئی ایسی گرمی پڑی طوائف نہیں ہوں۔ وقت آنے پر تمھارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔“

اس نے سنبھل کر کہا۔

”اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا زہراں کہ کون کس کے لیے کیا کر

اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق کہا۔

”کیوں حنیف خاں۔ ٹھیک ہے ناں۔“

نذیر موچی نے بے شرمی سے آنکھ دیا۔

”وہ ٹھیک ہے یار۔ بڑا مزہ آیا بھتی۔“

حنیف خاں نے چار پائی سے کھڑے ہو کر زوردار انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”تو یہ بات ہے۔ اچھا یار حنیف ذرا جلدی سے ہنا دھو کر تیار ہو جاؤ پھر

دوسری سوئی میں نختو خاں کے سامنے آنا۔ تاکہ اُسے کوئی شک نہ گزرے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ تم ادھر شاہ صاحب کے ساتھ رات دیر گئے ہمک باتیں کرتے رہے ہو۔ اور سو رہے ہو۔“

نذیر نے دوبارہ بے حیاتی سے عادت کے مطابق آنکھ دیا پھر وہ زہراں باقی

سے مخاطب ہوا۔

”جلدی جلدی ناشتہ کر لو۔ گاڑی تیار ہے۔ سامان تم لوگوں کا میں نے گاڑی میں رکھوا دیا ہے۔ اندھیرے مٹے ہی نکل جاؤ۔ اور ماں خبردار اگر کبھی بھولے سے بھی اس رات کا ذکر تمھاری زبان پر آیا۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔“

اُس نے زہراں کی طرف دیکھا۔

”نذیرے تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ مجھے کیا بے وقوف سمجھتا ہے

اور جب بھی حنیف خاں کا دل چاہے اسے ہمارے ہاں لے آنا۔ مجھے اس کی خدمت کر کے بہت خوشی ہوگی۔ یوں بھی شہر یہاں سے زیادہ محفوظ ہے۔“

زہراں نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمھارے رات رات میں کچھ زیادہ ہی پر پُرزے نہیں نکل آتے۔ اچھا

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم تیار ہی کر دو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

سکتا ہے۔“

حنیف خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اُس کے لیے محبت کا دریا موجزن تھا۔ زہرا نے اداکاری کے سارے گر آج ہی آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔  
”خدا کے لیے ابھی سے مُنہ سے ایسی باتیں نہ نکالو۔“  
اُس نے بھرتی ہوئی آوازیں کہا اور حنیف خاں سے لپٹ گئی۔

○

زہرا بائی شہر واپس لوٹ گئی۔  
حنیف خان اپنے باپ کے ساتھ اپنے گاؤں چلا آیا۔ اُس نے اپنے باپ کو رات کے واقعات کی ہوا بھی نہیں لگتے دی تھی۔

لیکن —

اپنے گھر آنے کے بعد حنیف خان کو احساس ہوا کہ وہ تو اپنے جسم کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ اپنا دل تو وہ ریاست شاہ کی حویلی میں زہرا بائی کے پاس ہی گروہی رکھ آیا تھا۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ چھین جانے کا احساس ہوا۔ یہ احساس اتنا جان لیوا تھا کہ حنیف خاں کی ساری مردانگی اس کے سامنے دھری کی دھری رہ گئی۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اڑ کر زہرا بائی کے پاس پہنچ جائے اور اپنی آتش شوق کو بجھائے

لیکن —

یہاں معاملات کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔

ریاست شاہ نے ایک خلیفہ رقم نھو خاں کو بطور ایڈوائس دے کر اُسے اپنا پابند کر لیا تھا اور نھو خاں نے اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ اس مرتبہ اُس نے الیکشن میں ریاست شاہ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کی برادری میں نھو خاں کو بیرون والی حیثیت حاصل تھی یہاں کس کی مجال تھی کہ اس کے حکم کی

سرتانی کرتا۔

نھو خاں اگلے روز مزید حیران رہ گیا جب مقامی تھانیدار اُسے گھوڑی پر سوار اپنی حویلی کی طرف آتا دکھائی دیا تو اُس کے دل و دماغ میں نئے نئے خدشات سر اٹھانے لگے۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا کہ کوئی نئی مصیبت آگئی اور حنیف خان کو اشارے سے وہاں سے کھسک جانے کے لیے کہہ دیا۔ یہ اس کا اصول تھا کہ دونوں باپ بیٹے کبھی اکٹھے جیل نہیں جاتے تھے۔

خلاف معمول تھانیدار اکیلا ہی گھوڑی پر سوار اس طرف آ رہا تھا اس کے لیے ایک طرح سے دستی کا اشارہ بھی تھا۔

نھو خاں جانتا تھا کہ تھانیدار کی اس گاڑی میں اس طرح آمد کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اب اُسے اپنا دشمن سمجھتا بصورت دیگر وہ اس طرف اکیلا نہ آتا۔

”سناؤ تھانیدار جی — کس طرح ادھر بھول پڑے؟“

نھو خاں نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

”نھو خاں — اب ہمارے اور تیرے درمیان کوئی دوسری بات نہیں رہ گئی۔ شاہ صاحب کا خاص حکم ہے کہ تیرا خیال رکھا جائے۔ ہم تیرے تابعدار ہیں نھو خاں۔ آج سے پہلے والی باتیں بھول جانا — اور ہاں اب کوئی واردات ہمارے علم میں لاتے بغیر نہ کرنا — سمجھ گئے ناں — تاکہ ہم مناسب منصوبہ بندی پہلے سے کر لیا کریں۔“  
تھانیدار نے ڈیرے پر بچھی چار بائی پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

نھو خاں سمجھ گیا کہ فضل شاہ نے تھانیدار کو پکا کر دیا ہے۔ اُسے جلد ہی اندازہ ہونے لگا تھا کہ فضل شاہ کی سرکار دربار میں بہت پہنچ ہے ورنہ یہی تھانیدار جو چند روز پہلے تک اُس کے خون کا پیاسا تھا اس طرح اُس کی خدمت میں سلام کرنے نہ آتا۔ اُس نے تھانیدار کے لیے دودھ منگو لیا تھا اور اب دونوں راز نیازی کی باتوں میں مشغول تھے۔

تھانیدار اُس سے اس طرح کھل رہا تھا جیسے جراتم کی دُنیا میں اُس کا کوئی دینے والا

ساتھی رہا ہو۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد ہی مطلب کی بات پر آتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں تھوڑا سا شروع کیا۔

تھوڑا سا — قدرت نے تجھے بڑا سنہری موقعہ دیا ہے۔ شاہ صاحب کی دوستی سے جتنا جی چاہے فائدہ اٹھالے۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا ہمارا حصہ ایمانداری سے دینا رہے اور ہاں شاہ صاحب سے کہہ دینا کہ میرا تبادلہ یہاں سے نہ ہونے پائے۔ جب تک میں اس تھانے کا انچارج ہوں تو اس تھانے کی حدود میں آنے والے تمام دیہاتوں کا انچارج رہے گا۔ تھوڑا سا میری بات مان لے۔ لعنت بیجج اب سرحد پار کرنے پر، اُس طرف اب بہت سختی ہونے لگی ہے۔ ادھر ہی سے مال اکٹھا کر لیا کر۔ اور اکٹھا بھی کیا کرنا بس اپنا حصہ وصول کر لیا کر۔ ارے تجھ سے کون چھپا ہے اس علاقے میں رستہ گیر تو رستہ گیری میں اپنا حصہ بیا کر دھڑلے سے اور ہمارا ہمیں پہنچا دیا کر۔ اللہ اللہ خیر صلاً“

تھوڑا سا کبھی حیرانگی سے اُس کا منہ دیکھنے لگتا اور کبھی تشویش میں مبتلا ہو جاتا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قانون کا کوئی رکھوالا اس طرح محض چند لمحوں کے عوض اپنا ضمیر بھی گروی رکھ دیا کرتا ہے۔

لیکن —

یہ اُس کی خام خیالی تھی —

اُس نے دراصل آج تک مجرم ہی دیکھے تھے۔ اُس کا واسطہ اپنے جیسے لوگوں ہی سے رہا تھا جو مجرم کرتے تھے اور سزا پاتے تھے۔ اُن لوگوں سے خیر کی توقع عبث تھی۔

لیکن —

یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہ رہی تھی —

یہاں تو قانون کے محافظ اُسے نئے نئے راستے سمجھا رہے تھے۔

”تھوڑا سا — بیٹا بہت گنگا میں نہالے —“

اس کے دل نے کہا۔

ساری زندگی سرحدوں پر دھکے کھانے اور ہر لمحے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے سے یہ بہت بہتر تھا کہ وہ پولیس کے تعاون سے اپنی بد معاشی قائم کر لے۔ اس طرح نہ ہینگ لگتی اور نہ پھٹکری اور نہ رنگ بھی خوب چرٹھتا۔

”چوہدری صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کے دارے نیارے ہو جائیں گے۔ یہاں کے بعد پھر پولیس نوکری کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اگر آپ کا تعاون رہا تو تین چار ماہ میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر وا دوں گا۔“

تھوڑا سا نے بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

جواب میں تھانیدار اس کے ”زالوں“ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹ گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے تھوڑا سا سے بڑی رازداری سے کہا۔

”تھوڑا سا — شاہ صاحب کو بہ صورت کامیاب ہونا چاہیے۔ ایک بات یاد رکھنا سرکار دربار میں کسی کی عزت تب تک قائم رہتی ہے جب تک اس کا تعلق اس دربار سے بندھا رہے۔ ورنہ تو یہ لوگ جھپوٹی ہوئی ہڈی کی طرح اُسے پرے پھینک دیتے ہیں۔ شاہ اگر ایم پی اے نہ بنا تو پھر ہمارا بھی ”رام بولو“ ہو جائے گا۔ یہ پلوال والے سردار بھی سالے ایک ممبر کے بد معاش ہیں۔ بس سیاست میں فضل شاہ سے مار کھا جاتے ہیں ورنہ دولت تو اُن کے پاس بھی کم نہیں تو تو جانتا ہی ہے۔ سرداروں کا آنا جانا سرحد کے دوسری طرف لگا رہتا ہے۔ آج تک اُن کا مال پکڑنے کی کسی نے ہمت نہیں کی۔“

”میں سمجھتا ہوں چوہدری صاحب — میں جانتا ہوں سرکار کو — آپ مطمئن ہو جائیں میں تو اس سردار کے بچے کی ضمانت ضبط کر وا دوں گا۔ اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔“

اُس نے تھانیدار کو یقین دہانی کر داتی۔

”چنگا بھتی رب را کھا“

تھانیدار نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دم رخصت اس کے لئے گئی اور دیگر اجناس نتھو خاں نے الگ سے باندھ دی تھیں۔

”خیر ہے۔ شام کو منشی آ کر لے جائے گا“

تھانیدار نے ان چیزوں پر ایک نگاہ غلط ڈالتے ہوئے کہا

”مہربانی چوہدری صاحب“

نتھو خاں نے ہاتھ باندھے۔

تھانیدار نتھو خاں کا دماغ خراب کر کے چلا گیا۔ جس نے اُس کی روانگی کے کچھ دیر بعد ہی اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کوئی چھوٹا موٹا ہاتھ نہیں مارے گا بلکہ موقعہ محل کی مناسبت سے کوئی بڑا کام کرے گا

لیکن

اس کے لیے ریاست شاہ کا الیکشن میں کامیاب ہونا ضروری تھا۔

○

پہلوں میں یہ خیریم کے دھماکے کی طرح پھٹی کہ ریاست شاہ نے نتھو خاں کو خرید لیا ہے اور اس الیکشن پر نتھو کی برادری کے قریباً ڈھائی تین سو ووٹ تو سیدھے ریاست شاہ کو جائیں گے جبکہ اپنے اشرور سوخ سے وہ ارد گرد کے آٹھ دس دیہاتوں کے دوڑ زبھی کھینچ لے جائے گا کیونکہ ان دیہاتوں کا ہر تیسرا گھر لوہیس کا مستقل گاہک تھا۔ ان لوگوں نے جرائم نہیں چھوڑنا تھا اور پولیس نے ان کو۔ اس سردار ان لوگوں کو جیسی بھی گارنٹی دیتا لیکن یہ کبھی نتھو خاں کی بات نہیں ٹال سکتے تھے کیونکہ فضل شاہ اور ریاست شاہ کی مقامی تھانے پر مکمل گرفت تھی اور مقامی ریاست میں تھانے کا کردار ہی دراصل سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔

دیہاتیوں کو اس بات کا علم تھا کہ جس پورنگ سٹیشن سے تھانے دار کی مرضی کے

خلاف امیدوار کے زیادہ ووٹ نکل آئے اس کے نزدیک دیہاتوں کی کم بختی آ جاتے گی۔

یوں بھی نتھو خاں کے اُن لوگوں پر بڑے احسانات تھے۔ اکثر چوری چکاری کے کیس وہ خود ہی سمجھال لیا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں درجنوں ایسے گھر موجود تھے جن کی بیٹیوں کو نتھو خاں نے اپنے پیسے سے بیاہا تھا اور یہ لوگ اس کے احسانات کو یوں بھلا نہیں سکتے تھے۔

سردار کے آباء اجداد سکھوں سے مسلمان ہوتے تھے۔

جائیداد اور دھن دولت سے اس خاندان کو شاہ فیلی سے کچھ کم لگاؤ نہیں تھا۔ سردار کا پورا خاندان سمکنگ کے دھندے میں لوث تھا۔ سرحد کے اس طرف اگر اُن کے مسلمان رشتہ دار موجود تھے تو دوسری طرف اُن کے سکھ رشتہ دار ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔

کبھی کبھی تو مقامی لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ اُن لوگوں نے شاید جائیدادیں بچانے اور دونوں حکومتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہی اپنا دھرم بدلا تھا ورنہ ان کی عادتیں اپنے بزرگوں والی ہی تھیں۔

سرداروں کا شاہ فیلی سے پہلی مرتبہ متھا نہیں لگا تھا۔

اب تک یہ لوگ یونین کونسل اور اسمبلی کے انتخابات پر اثر انداز ہوتے آتے تھے اور سردار نے اس ضمن میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا تھا۔

لیکن

اس مرتبہ سردار رشید نے خود میدان میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”یہ نتھو خاں کہاں سے ٹپک پڑا اس کا کیا واسطہ ہے اس سارے دھندے سے۔ سالانہ چور کہاں سے مصیبت بن کر آ گیا“

سردار رشید نے جو اس وقت اپنے مقامی چچوں کے ساتھ کاغذات جمع کر رہا تھا واپس آیا تھا، کہا۔

سردار صاحب! یہ سارا گھڑاگ فضل شاہ نے پھیلا یا ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ فضل شاہ کو چارہ ڈالیں۔ بڑے شاہ کے مرنے کے بعد یقیناً وہ ریاست شاہ کے برابر اُٹنا چاہے گا۔ سردار صاحب آخر وہ سوتیلے بھائی ہیں۔“

عالم داد نے کہا جو گزشتہ دس سال سے یہاں کا کونسلر منتخب ہوتا آ رہا تھا اور ریاست شاہ کا ڈسا ہوا بھی تھا۔

”عالم داد۔ بیچوں والی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔ تم جلتے ہو کہ ابھی یونین کونسل کا مرحلہ نہیں آیا۔ فضل شاہ کو یقین ہے اور ایسا ہوگا بھی کہ ریاست شاہ ایم پی اے بننے کے بعد فضل شاہ کو یونین کونسل کا اپنی جگہ چیرمین بنا دے گا۔ اس کا دماغ خراب ہوا ہے جو ہمارے ساتھ آن ملے۔ ہاں اگر میں الیکشن جیت گیا تب تو ممکن ہے کچھ ہو جائے۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ریاست شاہ ہار جائے گا۔ عالم داد تم جس طرح بھی ممکن ہے نختو خاں کو توڑو۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ کچھ بھی۔“

سردار رشید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے سردار صاحب ہم ادھر ہی ہلہ مارتے ہیں۔ یہاں کے پانچ چھ سو ووٹ فیصلہ کن کردار ادا کریں گے۔ میرے ایک دو کام کے بندے ہیں وہاں۔ کل انھیں بلاتا ہوں اور کوئی راستہ نکالتے ہیں۔“

عالم داد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

عالم داد بڑا کایاں آدمی تھا۔

پولیس کا سابقہ حوالدار جسے کرپشن کے الزام میں ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے آج دو مرتبہ اراضی کا مالک اور مقامی کونسلر بن چکا تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ اور غیر قانونی ہتھکنڈوں میں نزدیک دُور کے دیہات میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔

عالم داد کو امید تھی کہ اگر سردار کا میاب ہو گیا تو اس کے دارے نیارے ہو جائیں گے کیونکہ سردار رشید کی آڑ میں وہ ہر شکار کھیل سکتا تھا۔

عالم داد سے نختو خاں کا کچھ پریشیدہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دُنیا میں نختو کی اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ اس کا بیٹا حنیف خاں ہے۔ اگر کسی طرح وہ لوگ حنیف کو قابو کر لیتے تو ان کے لیے بہت کچھ جو بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا ممکن ہو جاتا۔

سردار کے ڈیرے سے اُٹھ کر وہ سیدھا اپنی حویلی پہنچا اور اب گھوڑی پر بیٹھ کر ریاست شاہ کے ملحقہ گاؤں سنگھ پور جا رہا تھا جہاں سے اُسے معلومات اکٹھی کرنی تھیں کہ آخر ریاست شاہ نے نختو خاں کو قابو کس طرح کیا ہے کیونکہ نختو خاں ذرا اناگ قسم کا بد معاش تھا۔ اُس کا گھٹیا قسم کی سیاست سے کبھی دُور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا پھر وہ شاہ فیملی کے قابو کس طرح آ گیا۔

سنگھ پورہ میں وہ اپنی شناخت خفیہ رکھ کر ہی جایا کرتا تھا۔ یہاں کا ایک بد معاش جو پانڈی کا کام کرتا تھا۔ فضل شاہ کا خاص آدمی تھا۔

لیکن۔

عالم داد کے لیے ایسے خاص آدمی قابو کرنا مشکل کام بھی نہیں تھا۔

اُس نے گاؤں کے باہر ہی بنے شرفو کے ڈیرے کا رخ کیا۔ شرفو ڈیرے ہی پر موجود تھا۔

عالم داد کو گھوڑی پر آتے دیکھ کر اس کی باجھیں کھل اُٹھیں۔

”آؤ۔ آؤ۔ حوالدار جی۔ السلام علیکم۔ آج تو کیڑی کے گھر نارائن آگئے۔“

اُس نے حُتھ ایک طرف رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے عالم داد کا استقبال کیا۔

”دعلیم السلام۔ سنا بھی شرفو۔ کیا حال ہے تیرا۔ میں نے سوچا تو اب کہاں آتے گامیں ہی خیریت معلوم کرتا جاؤں۔“

عالم داد نے گھوڑی سے اُتر کر اُس سے گرجوشتی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”شرفو — مجھے کل تک علم ہونا چاہیے کہ نختو خاں کو کن شرائط پر ریاست شاہ نے اپنے جال میں پھنسا یا ہے۔ تم یہ سمجھنا کہ یہ زندگی موت والا معاملہ ہے۔ اگر ریاست شاہ ایم پی اے بن گیا تو اپنی بچھڑی سمجھو۔ زمین کی آمدن پر نہ تم گزارہ کر سکتے ہو نہ ہی میں۔“

”حوالدار صاحب کل کیوں آج ہی کیوں نہیں — میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں اس روز محفل میں موجود تھا۔ یہ سارا کھیل حنیف خاں کے ذریعے کھیلا گیا ہے۔ نذیر موچی نے حنیف خاں کو فضل شاہ کے سہم پر بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔ حوالدار صاحب اب تو یہ سمجھو کہ اگر نختو خاں ریاست شاہ کو چھوڑ دے تو بھی حنیف خاں اُسے نہیں چھوڑے گا انھوں نے حنیف خاں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔“

شرفو نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا —

”وہ کیسے اوتے؟“

عالم داد بے چین ہوا جاتا تھا۔

”شہر کی مشہور طوائف زہراں بائی کے ذریعے —“ شرفو نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بات کی ”ہاں حوالدار صاحب ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ مجھے تو زہراں بائی کی آمد ہی مشکوک دکھائی دی تھی — اور جب فضل شاہ نے حنیف خاں کے لیے الگ سے دوسری حویلی میں مجرے کا بندوبست کروایا تو میرا ماتھا تپ ہی ٹھنکا تھا۔ میں بھی نذیر موچی کے ساتھ دو تین مرتبہ عنایت بائی کے ڈیرے پر جا چکا ہوں۔ آپ جانتے تو ہیں اُسے — ہمارے ہاں سے بھی وہ ماہین نکال کر لے گیا تھا۔ میں نے ہی اُس کی مدد کی تھی — یہاں میرے پاس تین چار روز پہلے وہ شراب کے نشے میں سب کچھ بتا گیا ہے — حوالدار صاحب فضل شاہ نے بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔ زہراں بائی کے ذریعے — زہراں بائی نے حنیف خاں کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے — اب اُس کے بچ نکلنے کا سوال

ڈیرے پر اس وقت وہ اکیلا ہی موجود تھا۔ دو مزارے اپنے کام میں مصروف تھے یوں بھی شرفو بڑا ہوشیار بد معاش تھا اپنے گرد زیادہ بھیڑ جمع کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے جس کے بعد عالم داد مطلب کی بات پر آگیا۔

”یہ کیا خبریں مل رہی ہیں کیا جادو ڈال دیا ہے فضل شاہ نے نختو خاں پر۔ عالم داد نے کہا۔

کیا بات ہے حوالدار صاحب۔ ارادے نیک دکھائی نہیں دیتے — شرفو بھی اس کی رگ رگ کو پچانتا تھا یہ الگ بات کہ عالم داد کے اس پر بے پناہ احسانات کی وجہ سے اُس نے عالم داد کا ہر حکم مانا تھا۔

”وہاں یار — یہی سمجھ لو۔ تم تو جانتے ہو کہ سرداروں کے ایم پی اے بنے بغیر اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی — اگر تم ہمت کر دو تو مجھے یونین کونسل کا چیئرمین بنا سکتے ہو — پھر تو موج ہی موج ہوگی — ہم تو یوں بھی کچھ معلوم ہے یاؤں کے یار ہیں — دردی جب پینا ہوتی تھی تب بھی تیرے سارے کام کیے — اب بھی کریں گے۔“

عالم داد نے اس کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”تو یہ بات ہے۔۔۔“

شرفو نے گردن ثانی۔

”مجھے علم ہے تم آج کل فضل شاہ کے بہت نزدیک ہو رہے ہو لیکن جملے مختارے کچھ کام سنبھالنے بھی ہیں۔

شرفو — اگر فضل شاہ کو کبھی اس کا شک بھی ہو گیا تو تم۔۔۔“

”بے فکر رہیں حوالدار صاحب۔“

شرفو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عالم داد کیا کہنا

چاہتا ہے اور یہ تھا بھی سچ —

ہی پیدا نہیں ہوتا۔“<sup>۱</sup>  
 ”اچھا — تو یہ بات ہے۔“  
 عالم داد کو سب کچھ سمجھ آ رہا تھا۔  
 ”ہاں جی — یہی بات ہے۔“  
 شرفو نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔  
 ”ٹھیک ہے تم بھی سمجھنا ہماری ملاقات نہیں ہوتی۔“  
 عالم داد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”میں ہر طرح حاضر ہوں حوالدار صاحب — میرے لیے آپ پہلے ہیں باقی  
 سب کچھ بعد میں — اور ہاں — چاند کی ڈھلتی تاریکیں شروع ہونے والی  
 ہیں — اگر آپ کا حکم ہو تو آپ کی زمینوں سے ایک دو چکر پار کے لگو  
 دوں۔“

شرفو نے موقعہ غنیمت جانا۔

”شرفو — ہم تو یاروں کے یار ہیں — جب تمہارا جی چاہے۔ بس ولکٹ  
 کا حصہ ذرا انگ سے نکال لینا — تم تو جانتے ہی ہو اُن لوگوں کو قابو کرنا ذرا  
 مشکل ہوتا ہے۔“

عالم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بے فکر رہیں حوالدار صاحب — اگر پہلے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا  
 تو اب بھی نہیں ملے گا۔“

آپ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کے حکم کے غلام ہیں۔

شرفو نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

عالم داد نے واپسی کا سفر بڑی احتیاط سے طے کیا تھا۔

اُس نے جان بوجھ کر ایسے راستے اپنائے تھے جن سے گزرتے ہوئے کسی شناسا  
 چہرے سے اس کی ملاقات نہ ہو سکے کیونکہ وہ ایک مشہور آدمی تھا اور اس بات

ہا بھی اُسے علم تھا کہ اگر فضل شاہ کو اُس کی یہاں آمد کا علم ہو گیا تو ضرور وہ اُس  
 کا نوٹس لے گا اور عین ممکن ہے کہ شرفو اُن کی نظر میں آجائے جبکہ وہ شرفو کو  
 کسی قیمت پر ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا ابھی اُس نے شرفو سے بہت کام لینے  
 تھے۔

اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں ایک منصوبہ  
 طے کر لیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے سے وہ کم از کم فضل شاہ اور حنیف خاں  
 کے درمیان کچھ تفریق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اور —

یہی اُس کا منشا تھا۔



» بائی تمھاری مرضی ہے جھلے یہ پانچ سو روپے بھی نہ دو لیکن یاد رکھنا پولیس سے دشمنی لے کر تم کو ٹھا نہیں سجا سکتیں خواہ تمھاری کتنی ہی بی بی بی بی کیوں نہ ہو۔ «  
 « کہیں اس موٹے تھا نیندار کو سمندر خاں نے تو نہیں بھڑکا دیا۔ «  
 اُس کو رہ رہ کر یہی ایک خیال ستا رہا تھا۔

» سلام چوہدری صاحب «  
 اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے موج دین کو فرشتی سلام کیا۔  
 « کیسی ہو عنایت بائی۔ «

موج دین نے سید پر دانت کاڑتے ہوئے کہا۔  
 « مولا کا شکر ہے حضور۔ آپ کے ہوتے ہوئے بھلا ہمیں کوئی شکایت ہو سکتی ہے۔ «

عنایت نے خاص طوائفانہ انداز سے جواب دیا۔

» بھئی اب تو تمھاری بڑی بڑی فرمائشیں آنے لگی ہیں۔ اب تو ہمیں بھی تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خدا جانے تمھاری لڑکی نے کیا جاؤ چلا رکھا ہے۔ «  
 موج دین نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا تی۔

» حضور باندی ہے آپ کی۔ «

عنایت بائی کی باچھیں کھلیں اور اُس کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔

» عنایت بائی تم جانتی ہو میں ذرا دکھری ٹاٹپ کا بندہ ہوں۔ میں یہ عورتوں والے دھندے میں نہیں پڑتا۔ لیکن اپنے ایک سبب کی فرمائش پر تمھارے پاس آنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ «

تم جانتی ہو پلوال والے سرداروں کو۔ «

موج دین نے اب سلیم کیے ہوتے مرنے کی ٹانگ پر دانت جھاتے تھے۔  
 « کیسی بات کرتے ہیں سرکار۔ سردار صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ابھی

## نتی چال

اے ایس آئی موج دین کی عنایت بائی کے یہاں آمد کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جب نوکر نے بتایا کہ چھوٹے تھا نیندار صاحب آئے ہیں پہلے تو عنایت بائی کے پاؤں تلے زمین ہی برک گئی۔

» یا مولا خیر۔ «

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

» اکیلا آیا ہے یا سپاہی بھی ساتھ ہیں۔ «

اُس نے نوکر سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

» بی بی بالکل اکیلا ہے اور سول وردی میں۔ وہ تو میں نے پہچان لیا

ورنہ اُس کو شاید کوئی پہچان ہی نہ سکتا ہو۔ «

نوکر نے اپنی دانست میں اُس کی تسلی کر دائی۔

لیکن

عنایت بائی پھر بھی خاصی گھبرائی ہوتی اُس کمرے میں داخل ہوتی تھی جہاں اُس کی آمد سے پہلے ہی نوکر نے موج دین کے سامنے بوتل اور پھلوں والی ٹوکری رکھ دی تھی اور اب اُس کے لیے گولڈ لیف سگریٹ کی ڈبی لیتے جا رہا تھا۔

عنایت بائی کو ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُس نے اگلے ہی روز جب بازار کے پولیس ٹاؤٹ سمندر خاں کو زیادہ بھتہ دینے سے انکار کیا تھا تو اُس نے کہا تھا۔

چند روز پہلے ہی ہم اُن کے علاقے میں مجرہ کر کے آئے ہیں“  
 عنایت بائی نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

”بس اپنی خوش قسمتی جانو کہ سرداروں کو تمھاری بیٹی کا گانا پسند آگیا ہے۔  
 اور انھوں نے اگلے ہفتے تمھاری بیٹی کا مجرہ رکھ لیا ہے۔ سردار صاحب کے  
 بیٹے کی منگنی ہے۔ تمھارا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔“

موج دین نے کہا۔

”لیکن سرکار۔“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ گھر آئی مایا کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔ یہ لو کپڑا اٹھوائیں۔“

یہ کہتے ہوئے موج دین نے اپنی داسکٹ کی جیب سے نوٹوں کا بندل نکال کر  
 اُس کی طرف بڑھا دیا۔

عنایت بائی نے آنکھوں آنکھوں میں جانچ لیا تھا کہ یہ کم از کم بیس ہزار روپے  
 ہیں۔ اپنی آئندہ زندگی میں وہ اتنے بڑے اٹھوائس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”جن لوگوں نے اٹھوائس یہ دیا ہے اُن کی حیثیت کا اندازہ کر لینا۔  
 سرکار دربار میں اُن کی بہت چلتی ہے۔ اگر تمھاری بیٹی نے سردار صاحب کو  
 خوش کر دیا تو یاد رکھنا کہ اس شہر میں کوئی تمھاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔

عنایت بائی تیرے تو دارے نیارے ہو گئے۔“

موج دین نے اُس کی طرف دیکھ کر بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

”عنایت بائی کی رال ٹپک پڑی تھی۔“

اُس کے ذہن میں موجود تمام خدشات پر یہ نوٹ غالب آگئے تھے۔ جنہوں  
 نے ”ساتی“ (اٹھوائس) اتنی زیادہ پیجی تھی اور وہ بھی مقامی تھانیدار کے ہاتھوں۔  
 وہ تو اُسے نہال کر سکتے تھے۔

”بس چودھری صاحب ذرا دل کو دھڑکا سا لگا ہے کہیں ریاست شاہ ناراض  
 نہ ہو جائے آپ کو تو علم ہے کہ اُن کی سیاسی دشمنی ہے اور ہمارے ریاست شاہ کا

خانہ میں آنا جانا لگا رہتا ہے کہیں ہم غریب دو بزدل کی لڑائی ہیں۔۔۔۔۔“  
 عنایت بائی نے کہنا چاہا لیکن موج دین نے اُس کی بات کاٹ دی۔

”عنایت بائی۔ اپنا دماغ صحیح رکھو۔ آج تک پولیس والے تم سے لیتے  
 ہی آتے ہیں۔ آج سردار صاحب کی وجہ سے تمھیں پولیس کے ہاتھوں سے ۲۰ ہزار

روپیہ موصول ہوا ہے۔ تمھاری مت ماری گئی ہے کیا۔ اپنے دماغ سے  
 یہ دہم نکال دو۔ مجھے علم نہیں کہ ریاست شاہ اس کا نوٹس لے گا یا نہیں۔

لیکن تم ایک بات ضرور یاد رکھنا کہ اٹھوائس پکڑنے کے بعد اگر تمھاری نیت بے ایمان  
 ہو گئی تو زمین کے کسی کونے پر تمھیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ میری بات سمجھ گئی ہو  
 ناں۔“

موج دین نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں اُسے سمجھایا۔

”ہاں جی ہاں جی چودھری صاحب مولانا کرے ایسی سوچ بھی کبھی میرے دماغ

میں آئے میں تو یوں ہی۔“

”بس تم یوں ہی۔“ جی ایسی بات دوبارہ نہ کرنا۔ یاد رکھنا اگلے ہفتے۔

سردار صاحب کی گاڑی بھتیں لینے آئے گی۔ اور ہاں ایک دو لڑکیاں بھی ساتھ

لے جانا۔ سردار صاحب کو خوش ہونا چاہیے اس میں تمھاری اور ہماری بھی

سلامتی ہے۔ سمجھ گئی ناں۔“

موج دین نے پھر آنکھ دبائی۔

”بالکل سمجھ گئی ہوں چودھری صاحب۔ سردار صاحب کا دل خوش کر

دوں گی۔ بس ذرا خیال رکھنا بچیاں ہیں۔ زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔“

عنایت بائی نے طوائفوں کے مخصوص انداز میں کہا۔

”ارے چُپ کر۔ زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ کیا عرس پر جا رہی

ہیں۔ زیادتی کی کچھ لگتی۔ زیادہ نخرے نہ دکھا۔ اور ہاں آج شام کو

بڑے چودھری صاحب اور میرے لیے بھی الگ سے مال بھیج دینا۔ بڑا

چوہدری ذرا شوقین مزاج آدمی ہے کہیں اپنے جیسی کوئی نہ بھیج دینا — سمجھ گئی ناں —“

موج دین نے مرغا ختم کر کے اُسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

”جو حکم چوہدری صاحب — آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں بھلا آپ کا حکم ہم کیسے ٹال سکتے ہیں — بہتر ہوتا اگر بڑے چوہدری صاحب غریب خانے پر ہی۔“  
موج دین نے اُس کے ”غریب خانے“ کو موٹی سی گال دے کر اس کی بات کاٹ دی۔

”زیادہ چالاک نہ بنو — تھانے کے ساتھ دہلی بلڈ ہنگ چوہدری صاحب کے پاس ہی ہے اور رات دس بجے کے فوراً بعد لڑکیاں پہنچ جائیں۔“  
اتنا کہہ کر موج دین نے سگریٹ کی دہ ڈٹی جو ابھی نوکر نے وہاں لا کر رکھی تھی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی اور اگڑتا ہوا باہر نکل آیا۔  
عنایت بائی نوکرانیوں کی طرح اس کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہوئے اسے دروازے تک چھوڑنے گئی تھی۔

”یہ سُوڑ کیا لینے آیا تھا۔“

اُس کے واپس لوٹتے ہی زہراں بائی نے دریافت کیا۔

”یہ طوائف کا کوٹھا ہے بی بی رانی — یہاں سے کوئی کیا لے جاتے گا۔ یہاں تو جو بھی آئے گا دینے کے لیے ہی آئے گا — تھانیدار ہو گا سالہا سرکار کا۔“  
ہیں اس سے کیا لینا دینا ہماری تو اپنی سرکار ہے۔“  
یہ کہتے ہوئے عنایت بائی نے بندل میں سے کچھ نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھائے اور باقی نوٹوں کو سیف میں تالا لگا کر اس کی چابی دوبارہ اپنے ازار بند سے باندھ لی۔  
”لڑکیوں کو ساتھ لے جا کر کچھ شاپنگ وغیرہ کر آمیری بنو — تیری ہانگ

بڑی بڑھنے لگی ہے۔“

عنایت بائی نے اس کی بلائیں لینے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا — میں تھانے میں نہیں جاؤں گی — شرفیال کا حشر یاد نہیں تمہیں کیا — اس موٹے موج دین کے پاس گئی تھی لیکن وہاں کس کس نے اُسے نہیں زچھا — یہ تو وحشی ہیں وحشی۔ ورنہ کس کے — یہ نہیں ہو گا بی بی۔“  
زہراں کو بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

”ارے لعنت بھیجتی ہوں میں ایسی سوچ پر بھی — میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے جو اس بڑھاپے میں اب اپنی بیٹی کو پخوانے کے لیے کتوں کے سامنے پھینکیوں گی۔ یہ جو دو سائڈنیاں پال رکھی ہیں ان کا کیا میں نے نکاح پڑھوانا ہے — بیٹی تو کیوں اپنے دماغ میں ایسی باتیں لاتی ہے — اپنی ماں کو کیا سمجھتی ہے تو۔ میرے جیتے جی بھلا ایسا ممکن ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے باقاعدہ ٹسوے بہانے شروع کر دیئے۔

”ارے بی بی تو تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو جاتی ہے میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ اچھا اب چُپ ہو جا۔ میری اچھی بی بی — اور بتا کہ کیا بات تھی۔“

زہراں بائی نے اپنی ماں سے لپٹتے ہوئے پوچھا۔

”بس بیٹی جب سے تو شاہ پود میں مجرا کر کے آئی ہے نزدیک دُور کے دیہاتوں میں تو دسوم مچی ہوتی ہے — پلوال کے سردار بہت بڑے آدمی ہیں، سرکار دربار میں بڑی پہنچ ہے اُن کی — کر دڑوں کی جانتادوں کے مالک ہیں — ریس میدان کے گھوڑے دوڑتے ہیں — انھوں نے اپنے بیٹے کی بنگلی پر تیرے مجرے کا پروگرام رکھا ہے اب تو اندازہ کر لے کتنے بڑے لوگ ہیں جنھوں نے مجرے کی ساتی (ایڈوائس) بھی تھانیدار کے ہاتھ روانہ کی ہے — موج دین کہہ رہا تھا لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم آمدن نہیں ہوگی۔

اور ہاں ان دونوں عرام خوردوں کو بھی کچھ نرت بھاؤ تبا دنیا — وہ مٹا اُتار  
 آیا نہیں ابھی تک — کبھی کبھی ان سے طوائفوں والے کام بھی لے لیا کر۔  
 آخر یہ بھی تیری نام نہاد سہی بنیں تو ہیں —“  
 عنایت باقی کی بات کے خاتمے پر دونوں ماں بیٹی نے اکٹھا قہقہہ بلند کیا  
 تھا — !!

”اور ہاں — آج رات کے لیے ان دونوں کو تیار کروا دے — تھلنے  
 والے کبخت اپنا حصہ بھی تو وصول کریں گے“ —  
 عنایت باقی نے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اپنی ناتب کو ہدایت  
 کی —

”کیوں نہیں بی بی — اور کیا ہم نے ان سے ”نرت بھاؤ“ کرولنے ہیں۔“  
 زہراں باقی نے بے شرمیوں کی طرح قہقہہ لگایا —  
 اُس کے ہمہ دنگان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اُن کے ساتھ کتنا بڑا  
 کیسل کیبلا جا رہا ہے۔

اس کے ذہن میں تو ان خدشات نے بھی جزم نہیں لیا تھا جو اس کی ماں کے  
 لاشور میں کینچوروں کی طرح سرسرا رہے تھے۔

سرداروں کا نام ایک طوائف زادی کی حیثیت سے اُس کے لیے اجنبی نہیں  
 تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ بھی ریاست شاہ سے کسی طرح کم پاتے کے نہیں ہیں  
 اور اُن کی طرف سے زہراں باقی کا مجرہ دیکھنے کی خواہش اُس کے لیے کوئی معمولی  
 اعزاز نہیں تھا۔ اُس کی گردن خواخواہ تن گئی۔

میکبر سے اس کی ناک معمول سے کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔

اب اُسے اپنے حلقہ احباب خصوصاً اس بازار میں موجود اپنی برادری تک  
 یہ خبر پہنچانی تھی تاکہ وہ جل بھس کر کباب ہوں اور زہراں باقی کو مزید گردن پھیلانے  
 کا موقع ملے۔ اس بازار میں اُس کی سگی خالہ کی بیٹیاں بھی بیٹھتی تھیں جنہوں نے

دو تین فلموں میں ایکسٹرا رول کر لیے تھے اُن کا تو دماغ ہی خراب ہونے لگا تھا۔  
 ”اب ایک ایک کو جلاؤں گی — ایک ایک کو — کیا کہتی تھی — خانگی  
 ایسی طوائف جو جسم فردشی بھی کرتی ہو، کی اولاد — اب دیکھوں گی ایک  
 ایک کو —“

اُس نے دل ہی دل میں کہا —

دہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

اپنی دونوں ”نام نہاد بہنوں“ کو جنھیں اُس کی ماں نے کم عمری ہی میں کہیں سے  
 فریدا تھا اور اب اُن بے چاریوں کو جسم فردشی پر لگا رکھا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر  
 وہ فوراً شاپنگ کے لیے سول بازار روانہ ہو گئی —

اُس کی ماں نے خریداری کے لیے اُسے خاصی رقم دی تھی —!

زہراں باقی نے اپنی دونوں ساتھیوں کے ساتھ اپنی مرضی کی خریداری جی بھر  
 کے کی — اُس نے نت نئے ڈیزائن کے شوٹ خریدے —

آخر اب وہ کوئی معمولی طوائف نہیں تھی —

اُس بازار میں شاید ایک آدھ ہی ایسی اور ہوگی جس کو ایڈوانس بینک کے  
 ۲۰ ہزار روپے آتے ہوں —

اُسے علم تھا کہ پلوال میں مجرہ کے دوران اُس کا ڈنکا کہاں کہاں بچ سکتا ہے۔  
 اس نے اپنی دانست میں آنے والا مجرہ سُنتے والوں کے دلوں پر پھیریاں چلانے کا  
 مکمل بندوبست کر لیا تھا —

سہ پہر تک خریداری سے فارغ ہو کر وہ ٹیکسی لے کر اپنے گھر پہنچی۔

گھر پہنچنے پر ایک اور خوشگوار حیرت سے اس کا سامنا ہوا۔

نذیر مویجی اور ضیف خان اس کے منتظر تھے۔

زہراں باقی ایسی طوائف زادی نہیں تھی جو ایک ہی رات میں اپنا دل کسی

تماش بین کے قدموں میں پھینک آتی — ایسے بجانے کتنے اس کی زندگی میں آئے اور چلے گئے تھے — وہ خاندانی طوائف تھی۔

اُس کی زندگی کا واحد مقصد تھا دولت اینٹھنا — دولت مندوں کو جھمانی اور ذہنی تسکین پہنچا کر اُن کی جیبیں خالی کرنا —

اور —

اس دھندے میں وہ بڑی کامیاب تھی — اپنی ماں سے بھی دوہا تھ آگے۔

لیکن —

حنیف خاں کی مردانگی اور سادگی نے اُسے متاثر ضرور کیا تھا — !

اس نے گو کہ حنیف خاں کے ساتھ ایک ہی رات گزار لی تھی لیکن ایک نکل مرد کے ساتھ یہ اس کی زندگی کی پہلی اور بھرپور رات تھی۔

ایک ایسی رات جس کی خواہش اُس جیسی کوئی بھی طوائف کر سکتی تھی۔

اس سے پہلے اُس کا واسطہ تماش میزوں سے تھا — شرابیوں اور زانیوں سے تھا اور یہ پیشہ در لوگ خود تو لطف اندوز ہو سکتے تھے اُسے کسی لطف سے آشنا نہیں کر سکتے تھے جبکہ حنیف خاں نے اپنی مردانگی سے اپنا آپ منوایا تھا۔

اُس نے بظاہر تو حنیف خاں سے وہی سلوک کیا تھا جس کی قیمت اُسے پہلے سے

ادا کر دی گئی تھی۔

لیکن —

ایک ہوشیار طوائف ہونے کے ناطے اُسے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ حنیف خاں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ جس علاقے میں شاہ فیصل کا ڈیرہ تھا وہاں چپے چپے پر

ایسے سنگھڑ اور بد معاش موجود تھے۔ ریاست شاہ نے یہاں سے بد معاشوں کی فوج بھرتی کر رکھی تھی پھر اُسے کیا ضرورت پڑی تھی جو اُس کے لئے خاص اہتمام کرتا — ضرور اُس میں کوئی خاص بات تھی۔

اور —

یہی وہ لالچ تھا جس نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ حنیف خاں کو دوبارہ اپنے پاس آنے

کی دعوت دے گو کہ نذیر موچی کی طرف سے عنایت بائی کو اس سلسلے میں خصوصی ادائیگی بھی کر دی گئی تھی لیکن یہاں کاروبار سے زیادہ ذاتی لالچ ڈرا آیا تھا۔

ردایتی طوائفوں کی طرح اُس نے حنیف خاں کو خوش آمدید کہا۔ اس کی ماں نے نذیر موچی کو خود سنبھال لیا تھا جبکہ بیٹی کو حنیف خاں پر چھوڑ دیا تھا۔

اس بات کی تو اسے کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ یہاں آنے والا یونہی واپس نہیں چلا جائے گا۔ انہیں کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتے گا۔

زہراں بائی نے بطور خاص اپنے نوکر کو چیلنے اور ایک پیٹری لانے کا حکم دیا تھا۔ اُمید تھی کہ اس بہادر اور بے خوف عاشق سے معمول سے کچھ زیادہ ہی مال ملے گا اس طرح

امین فضل اور ریاست شاہ کے سامنے بھی اپنے نمبر بنانے کا موقع مل سکتا تھا کیونکہ فضل شاہ نے بطور خاص اُسے ہدایت کی تھی کہ حنیف خاں کو اپنی مٹھی میں کم از کم ایکشن بہک ضرور

جھڑ کر رکھے۔

”بی بی — ہمارا بھی خیال رکھا کر — تیرے لیے کیسی کیسی آسامیاں لاتا ہوں — اسے معمولی ہستی نہ سمجھنا پانچ دس ہزار فی چکر دینا اس کے لیے معمولی بات ہے اور

ہاں شاہ صاحب کی طرف سے جو کچھ ملے گا وہ بونس سمجھ لینا —“

نذیر موچی دوسرے کمرے میں دیسی شراب کی بوتل سامنے رکھے عنایت بائی کو بتا رہا تھا۔ عنایت بائی کو اس کی اوقات کا علم تھا۔ وہ نذیر موچی کو دیکھتے ہی اپنے نوکر

کو اشارہ کر دیا کرتی تھی جو اس بازار کے ایک خفیہ اڈے سے اُس کے لیے دیسی شراب کا اڈھالے آتا تھا جس کو وہ جوں ک توں نذیر موچی کے سامنے دکھ دیا کرتی تھی —

”تذیرے — یہ بھی کوئی معمولی کوٹھا نہیں جس پر جس کا جی چاہے منہ اٹھا کر چلا آئے۔ عنایت بائی کا ڈیرہ ہے — مولانا سلامت رکھے میری زہراں کو — پولیس کے بڑے بڑے افسر اس کا گانا سننے کے لیے ایڈوانس ٹکٹ کر داتے ہیں —“

عنایت بائی نے بھی اپنے لیے الماری میں رکھی دوسری دلایتی شراب کی بوتل سے

جام تیار کیا اور اب وہی سامنے رکھے جو گفتگو تھی۔

”بی بی۔ جو بات شاہ صاحب کی ہے اُس کا مقابلہ کسی اور سے کیا“

نذیر موبچی کو اب نشہ ہونے لگا تھا۔

”دیکھ نذیر سے ہم تو فضل شاہ کی عزت سید بادشاہ ہونے کے ناطے کرتے ہیں۔

ورنہ ہمیں کسی سے کیا لینا دینا۔ اور تو جانتا ہے کہ طوائف کے لیے اُس کے کوٹھے پر

آنے والا ہر شخص قابلِ احترام ہوتا ہے۔ یہ جو پچھلے دو تین ہفتوں سے تُو نے شاہ صاحب

شاہ صاحب کی رٹ لگا رکھی ہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ بات کو سوچ سمجھ کر کیا

کر۔ تو اب ہماری برادری کا بندہ ہے۔ تیرا دھندہ بھی ہماری دجہ سے چل رہا

ہے۔ یہ جو بچیاں تو اغوا کر کے میرے پاس لاتا ہے انھیں تو یورپ اور امریکہ میں تر لے جائیں

سکتا ہے ہی اپنے گاؤں میں ان کا پیشہ کروا سکتا ہے۔ تیرا دھندہ بھی ہماری دجہ ہی

سے ہے۔ اپنی بات کیا کر۔ ہمیں اس سے کیا کہ شاہ صاحب کوئی بڑا آدمی ہے یا چھوٹا

آدمی“

عنایت بائی نے بھی موقع مناسب جان کر گیند اس کے کورٹ میں پھینک دیا وہ

اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ سرداروں کے ہاں مجرے پر جانے سے شاہ صاحبان اس کے لیے کس

حد تک مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔

یوں بھی نذیر ایک طرح سے اُن کا اپنا آدمی تھا۔ اگر کل کلاں کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تو

وہ نذیر موبچی کے ذریعے ہی اُسے کنٹرول کر سکتی تھی۔

دوسری طرف نذیر موبچی اس گفتگو سے اچانک یوں چونکا تھا جیسے کسی نے چیونٹی پھر

کر اُسے گہری نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

”کیا کہہ رہی ہو بی بی ہوش میں تو ہو۔“

نذیر موبچی کے لیے واقعی عنایت بائی کا یہ لہجہ قدرے اجنبی سا تھا۔

”میں تو ہوش میں اب آئی ہوں نذیر سے۔ مجھے تو اپنی قدر و قیمت کا احساس

ہوا ہے۔ سرداروں نے ۲۰ ہزار کی سائی (ایڈوانس) دی ہے زہراں کے مجرے کے لیے“

وہ سکی کا گھونٹ حلق میں اُنڈھیلے ہوئے عنایت بائی نے اس کے سر پر ٹام بوم

پھینک ہی دیا۔

”کہہ کہ کیا مطلب۔ کون سے سردار؟“

نذیر موبچی کو اچانک جھٹکا لگا۔

”تم کوئی چوچے ہو۔ تمہیں علم نہیں کون سے سردار۔ بلوال والے اور کون سے؟“

عنایت بائی نے اپنا پیگ ختم کرتے ہوئے گلاس ایک طرف رکھ کر آداتے بے نیازی

سے جواب دیا۔

”نینتی بائی تمہارا داغ تو ٹھیک ہے۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی

ہے کہ یہ سردار کون ہیں؟ شاہ صاحب کے مخالف۔ اُن کے خلاف الیکشن لڑ رہا ہے سردار

رشید۔“

نذیر موبچی نے اپنی دانست میں اُسے بڑی اہم اطلاع دی تھی۔

نذیر سے سو سن کر۔ تجھے شاید چڑھنے لگی ہے۔ انسانوں کی طرح پی۔

ہمیں کیا لینا دینا سیاست، بازی سے۔ اگر سردار رشید ریاست شاہ کا مخالف ہے تو کیا

میں کو ٹھانڈ کر کے کوئی بوتیک شاپ کھول لوں گی۔ ہمارا تو دھندہ یہی ہے۔

باپ دادا بھی کرتے آتے ہیں اور ہم بھی کرتے رہیں گے۔ سمجھ یا نہیں۔ تم اس چکر

میں نہ پڑو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے پاس آج کل دوسرے شہر کی ایک پارٹی

آئی ہوئی ہے۔ اگر کوئی لڑکی نظر میں ہے تو آج کل میں ہی لے آ۔ اچھے مٹل بکا

دول لگی۔“

عنایت بائی کے کانوں پر جوں بھی رینگتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”عنایت بائی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا کے لیے یہ حرکت نہ کر بیٹھنا۔

فضل شاہ تمہارا کہان بچہ کو کہو“ کروا دے گا۔ تم اس کی بیخ کا اندازہ نہیں کر سکتی،

بائی۔ میں تو کسی نہ کسی چکر میں اپنی جان چھڑا ہی لوں گا۔ تم پر بڑی آفت آئے گی۔“

”ارے مرگے مجھ پر آفت لانے والے۔ بڑا آیا ریاست شاہ کا چچہ۔ کیا کر

لے گا وہ میرا — کیا بگاڑے گا — میں کوئی کارخانہ فیکٹری لگا کر نہیں بیٹھی — کوٹھیا  
سجا کر بیٹھی ہوں وہ کیا میرے مقابلے میں کوٹھیا سجا کر بیٹھ جائے گا —  
عنایت بائی نے اس کی بات سختی سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیکھ عنایت بائی اپنا داغ اب بھی درست کر لے — میرے لیے بڑے  
ٹھکانے اور موجود ہیں۔ میں اپنا ماں ملک کے کسی بھی کونے میں فروخت کر لوں گا۔  
پر یاد رکھنا اگر تُو نے شاہ صاحب کو ناراض کیا تو اپنے پاؤں پر خور ہی کھلاڑی مارا  
دالی بات ہوگی۔ میں کہتا ہوں اب بھی دقت ہے سائی داپس لوٹا دے — اب  
بھی دقت ہے —“

اپنی دانست میں نذیر مومچی نے اُسے چپتاؤنی دن تھی۔

لیکن —

عنایت بائی کو شاید سسک کا ایک ہی پیگ چڑھ گیا تھا وہ بھڑک اٹھی —  
”کیا کرے گا تیرا ریا ست، شاہ — کیا کر لے گا — جا پنا راستہ ناپ۔ تیرا  
داغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے دھکیاں دے رہا ہے — دیکھ لوں گی میں فضل شاہ  
کو جس — ہم کوئی کسی کا ریا کھاتے ہیں۔ اپنی محنت کی کمائی کاتے ہیں — کسی کی مرضی  
کی زندگی گزارنی ہوتی تو کسی کا گھر بسا کر نہ بیٹھ جاتیں —“  
عنایت بائی نے اُسے قرباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نذیر مومچی بھی جراتم کی دُنیا کا پُرانا کھلاڑی تھا —!

اُسے سمجھ آگئی تھی کہ ضرور کسی نے اُس کے خلاف خطرناک کھیل کھیلا ہے۔ ضرور  
سزا داروں کو علم ہوا ہوگا کہ زہراں بائی کا مجرہ اپنے پاس کر دانے سے وہ ریا ست  
کے خلاف کوئی طرمان کھڑا کر سکتے ہیں — تب ہی انہوں نے یہ چال چلی ہے ورنہ  
انہیں ایسی درجنوں عنایت اور زہراں بائیاں مل سکتی تھیں!

کہیں یہ نھتو خان کو توڑنے کی سازش، تو نہیں!

کہیں اُن لوگوں کو علم تو نہیں ہوئی کہ حنیف خاں کا دل زہراں بائی پر آ گیا؟

اور انہوں نے ۰۰۰۰؟

اُس کے شیطانی ذہن نے چند سیکنڈ کے اندر کئی مفروضات قائم کر لیے — اور  
وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ضرور داں میں کچھ کالا تھا۔  
کوئی گہری سازش ہوتی تھی —

”کیا وہ بھی اس سازش کا حصہ بن جائے؟“

یہی تھا وہ سوال جو اس کے دماغ میں فی الوقت چل رہا تھا۔

نذیر مومچی نے کچی گوئیاں نہیں کھلی تھیں۔ وہ ہر طرح کے حالات سے اپنے شیطانی  
ذہن کے ساتھ فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اب بھی اُسے حالات سے فائدہ اٹھانا  
تھا۔ اُس کی زندگی کا اصول تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا وزن بھاری پلڑے کی طرف ڈالتا تھا۔

”دیکھو عنایت بائی — میں تمہارا بچن ہوں۔ دشمن نہیں۔ تمہاری بات ٹھیک ہے۔  
مجھے بھی شاہ صاحب سے کیا لینا دینا۔ میں نے بھی اُن کی آڑ اپنے جراتم کی پردہ پوشی ہی  
کے لیے رکھی ہے۔ تم جانتی ہو جو لڑکی شینہ اس وقت تمہاری بہن کے قبضے میں ہے  
اور جس کی کمائی سے اُس نے اس ملک کے سب سے بڑے شہر میں اتنی جا بجا دکھڑی کر لی  
ہے۔ اس کے اغوا کا پرچہ مجھ پر ہوا تھا۔ یہ شاہ صاحب کی مہربانی ہی تھی کہ انہوں نے  
لڑکی کے لواحقین پر دباؤ ڈال کر میرا نام پرچے سے خارج کر دیا تھا ورنہ تو میں ساری زندگی  
جیل کی دیواروں میں مسڑنا رہتا۔ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم شاہ صاحب کی غلام بن جاؤ لیکن  
جو کام حکمت سے ہو جاتے وہی اچھا ہے۔ اگر گڑ دینے سے دشمن مرتا ہے تو اُسے زہر  
کیوں دیا جائے —“

نذیر مومچی نے فوراً ہی پینتیرا بدلا۔

”دیکھ ناں نذیرے — اب تو ہی انصاف کر۔ آخر ہم نے بھی اپنی سفید پوشی  
قائم رکھنی ہوتی ہے۔ بازار کا مال تیرے سامنے ہے — شام ڈھلتی نہیں کہ پولیس کا  
گشت شروع ہو جاتا ہے — دروازوں پر پردے لگے ہیں۔ شریف گاہک اس طرف  
آتے ہوتے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے اور پُچے گفتگوں کو میں اپنے گھر میں داخل ہونے کی

اجازت نہیں دے سکتی۔ اب لے دے کے ہمارے لیے بھی شادی بیاہ میں گانے بجانے کا دھندہ رہ گیا ہے۔ ہم اپنا خرچ کہاں سے پورا کریں۔ اب بیٹی کا سر عام دھندہ کر دانے سے تو میں رہی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ گھر آئی مایا کو کون ٹھکراتا ہے؟ عنایت بائی بھی قدرے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

نذیر موچی اُسے قائل کرتا رہا کہ وہ فی الحال کوئی بہانہ کر کے سرداروں کو ٹر خاویہ بیٹی کو بیمار بنا دے یا کچھ اور جو بھی ممکن ہے۔ اور نہیں تو زہراں بائی کی جگہ کسی کو بھیج دے اُسے تو اپنے حصے سے غرض تھی۔ غلط کاریوں کے لیے اُس نے دد لڑکیاں اپنے پاس رکھی ہی ہوتی تھیں وہ بھی اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مار لیتی تھیں۔ اُس نے ایسے کسی آپشن "عنایت بائی کے سامنے رکھے۔

عنایت بائی بھی بڑی گھاگ کجری تھی! —

گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اُس نے بھی —  
کیا مجال جو وہ ٹس سے مس بھی ہوتی ہو۔



شاید نذیر موچی حنیف خان کو پڑھا کر لایا تھا! —

حنیف خان نے اُس سے کہا تھا کہ جس طرح زہرہ بائی نے رات اُس کے ساتھ بسر کی تھی ایسی ہی ایک اور رات کا بندوبست کروا دے —

نذیر موچی کے لیے تو اس بات سے بے بائی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اندھے کو گویا دو آنکھیں مل گئی تھیں اس چکر میں اس نے دس ہزار فضل شاہ سے لینٹھ لیا تھا۔ دوسری طرف حنیف خان سے کہہ دیا تھا کہ وہ دس ہزار کا بندوبست کر لے! —

حنیف خان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا —

اس نے نذیر موچی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلے زہرہ بائی کے سامنے نوٹوں کی گڈی رکھ دی۔

"یہ کیا —؟"

زہرہ بائی نے نوٹوں کی مالیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ اس کے لیے بڑی خوشگوار حیرت تھی۔ جس کام کے لیے حنیف خان یہ نوٹ لایا تھا کوئی اور راتے نوٹ لاتا تو اُسے کم از کم ایک ہفتہ اپنے ساتھ رکھتا۔  
لیکن —

یہاں تو صرف ایک رات کی بات تھی۔

"میں نے سوچا تم اپنی مرضی سے کچھ خرید لو۔ جو میں لے جاؤں شاید تمہیں پسند آئے۔ حنیف خان نے کمال سادگی سے کہہ دیا۔

"ہائے۔ ایسی بھی کیا بات تھی" —

یہ کہتے ہوتے اُس نے نوٹوں کا بندل اٹھالیا اور ابھی آئی کہہ کر دوسرے کمرے میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

انگلا کوئی بھی قدم اُسے بہر حال اپنی ماں کی مرضی سے اٹھانا تھا! —

عنایت بائی ابھی نذیر موچی کے ساتھ بک بک بھک بھک سے فارغ ہی ہوتی تھی جب زہراں بائی نے اُسے دوسرے کمرے سے اشارہ کر کے بلایا۔

"اب کیا مصیبت آگئی ہے؟"

عنایت بائی نے کمرے میں گھستے ہی کہا۔

"مصیبت آتے بھارے دشمنوں پر — ادھر تو رحمت ہی رحمت ہے مولا کی —"

یہ کہتے ہوتے زہراں بائی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے نوٹوں کا بندل لہرایا۔

"کس پر پھیر دی چھری"

عنایت بائی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

"اے بی بی — مولا عباس کی قسم لے لو جو میں نے کچھ بھی کیا ہو — وہ تو پہلی

ملاقات ہی سے گھائل ہو گیا تھا۔ یہ لایا ہے ایک رات رہنے کے لیے —"

یہ کہتے ہوتے زہراں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

عنایت بائی نے اپنے ہاتھ میں نوٹوں کا بندل پکڑ کر اُسے تاش کے پتوں کی طرح



لہرایا اور اندازہ کر لیا کہ یہ دس ہزار ہیں۔

”کیا صرف ایک رات؟“

اُس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”اور کیا بی بی — کیا سمجھ رکھا ہے تو نے مجھے — میں بھی عنایت بائی لڑھیلے والی کی بیٹی ہوں۔ جس کے دل پر ایک مرتبہ ٹھہری چلا دوں۔ وہ ہاتھ پرگردن رکھ کر پیش کرنے نہ آتے تو پھر نہراں بائی نام نہیں میرا“

اُس نے اکرٹتے ہوتے کہا۔

عنایتی بائی کے شیطانی ذہن نے فوراً اسے دوسری راہ سمجھائی۔

اس بات کا تو اُسے علم تھا ہی کہ حنیف خان کتنا اہم آدمی ہے۔ اُس کے لیے تو فضل شاہ نے سارا کھڑا گچھیلایا تھا اگر وہ نہراں بائی کے ذریعے حنیف خاں کو قابو کرنا تو پھر پلوال کے سرداروں کے ہاں انھیں مجبور کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا — ضرور اس کی بیٹی یہ کارنامہ انجام دے سکتی تھی کیونکہ اس وقت حنیف خاں یکے ہوتے پھل کی طرح اُن کی ہوس کی ٹوکری میں اُن گرا تھا۔

”ہاتے بیٹی! اچھا تو نہیں لگتا روز — لیکن اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ تجھے میں نے بتایا تھا ناں کہ وہ جو ۲۰ ہزار مروج دین مٹوا تھا نیندار ایڈوائس دے گیا ہے وہ پلوال والے سرداروں کے ہاں مجبور کرنے کے ہیں اور یہ فضل شاہ مٹوا اُس کا مخالف ہے۔ کہیں ہمارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ ذرا بچا کر کے اُسے ہاتھ ڈال۔ یہ ننھے خاں کا بیٹا ہے۔ اگر تجھے اس کی ہمدردی اور مدد حاصل ہو گئی تو ہم پلوال سے ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ دو تین راتوں کا کمالاتیں گے — میری بات سمجھ میں آ رہا ہے ناں — ارے ایک تو اس کجخت نذیرے نے میرا داغ خراب کر دیا ہے۔ تو اسے کہہ نذیرے کو یہاں سے ہٹا دے اور آئندہ اکیلا آیا کرے۔ اس موذی کے ساتھ نہ آیا کرے۔ مجھے تو اس کی شکل سے نفرت ہونے لگی ہے۔“

اُس نے بڑی رازداری سے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔

تو بے فکر ہو جا بی بی — میں اُسے سنبھال لوں گی۔ اور ہاں وہ جو کنیٹی اس روز میں سنا دے کے ہاں پسند کر آتی تھی ناں — وہ آج منگوا لینا ان پسیوں میں سے“

اس نے اُٹھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

”اے میری بیٹی — تجھ سے کیا چھپا ہے — میرے اور تیرے کون سے دو ہیں — تو جانتی ہے کہ فریج کتنا بڑھ گیا ہے — اگلی مرتبہ پر رکھ لے۔ اگلی مرتبہ جو بھی آیا سب تیرا۔ جو جی چاہے بنا لے جو“

عنایت بائی نے باہر نکلتے ہوتے کہا۔

زہراں نے دل ہی دل میں اپنی ماں کو موٹی سی گالی دی اور حنیف خاں والے کمرے میں آ گئی۔ جو ہونٹوں کی طرح منہ اُٹھاتے اُن اشیائے خور و نوش کا جائزہ لے رہا تھا جن کا ڈھیر نوکر نے اس کے سامنے لگا دیا تھا۔

”کھاؤ ناں — کمال ہے ابھی تک تم نے کچھ لیا ہی نہیں — بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ کیا ہماری کوئی چیز پسند نہیں آتی“

زہراں بائی نے صوفے پر اس کے پہلو میں ڈھیر ہوتے ہوتے کہا۔

”نہیں نہیں — میں نے سوچا۔ تم آ جاؤ تو۔“

حنیف خاں کو اُس کی قربت کا احساس ہوتے ہی اپنی رگوں میں انکار سے دوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”یہ لیجئے ناں“

کہتے ہوتے زہراں بائی نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس طرح کے تین چار اور چاؤ چوچلے کرنے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ شکار اب مکمل جال میں پھنس چکا ہے تو کام کی بات کہہ دی۔

”تم اکیلے آ جا یا کر دو — تم کوئی بچے ہو جو اس موتے نذیرے کی اُننگی پکڑ کر آئی یا کر دو گے۔ تمہیں کیا یہاں کا راستہ نہیں آتا“

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں — دراصل اس نے ہی تم لوگوں سے پہلی مرتبہ

ملوایا تھا۔ یوں بھی اس کا ہتھارے ہاں آنا جانا کافی دیر سے لگا ہوا ہے اس لیے میں نے سوچا۔“

حنیف نے کچھ کہنا چاہا۔

”چھوڑو اُس کو۔ اُس کا آنا جانا ہو گا میری ماں کے پاس میں تو اُس کی شکر پر تھوکنہ پسند نہیں کرتی۔ پھر تم نے میرے پاس آنا ہے۔ اُس کے پاس تو جانا نہیں اب کہیں رات کو اُسے یہاں نہ بلا لینا۔“

زہرا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اس انداز سے اُس کے گال پر چٹکی لگی کہ بے ساختہ حنیف خان کے دانت نکل آئے۔

”تم کیوں ڈرتی ہو اُس سے اتنا۔“

اُس نے پہلی مرتبہ ہمت کر کے زہرا کی بائی کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ خدا جانے فضل شاہ کے کان بھر دے ہمارے خلاف اور ہم غریبوں کا کیا بڑھ کر داد دے۔ ہماری تو کوئی مدد بھی ڈر کے مارے نہیں کرے گا۔“

اُس نے موقع غنیمت دیکھ کر حنیف خاں کی غیرت کو لٹکا دیا۔

”ایسی تیسی فضل شاہ کی۔“

حنیف خاں کی مونچھیں تن گئیں۔

”ہاتے اُٹھ آہستہ بولو حنیف۔ کیسے موتے نذیرے کے کانوں میں آواز پڑ گئی تو زہرا بھی ماں کی طرح ماہر نفسیات تھی خصوصاً مرد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا تو اُسے نسل در نسل ایک فن کی صورت منتقل ہوا تھا۔“

”تو کیا۔ کیا ہو جائے گا۔ بغیر شاید میرے متعلق اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ ٹھیک ہے ان لوگوں کو سیاست آتی ہو گی لیکن گھونٹے کے سامنے ساری سیاست دھری گا دھری رہ جاتی ہے۔“

حنیف خاں بھی شیخی بگھارنے لگا تھا۔

اور —

یہی وہ چاہتی تھی —

”حنیف خان یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں آنے والا بزدل بھی کچھ دیر کے لیے

بہت بہادر بن جاتا ہے لیکن وقت آنے پر...“

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کون سا وقت آ گیا ہے۔ ہم کوئی شہری بابو نہیں ہیں۔ جو کہہ دیا وہ کر کے دکھا دوں گا۔ اسے مرد کی زبان سمجھو۔ مرد کی زبان۔“

اُس نے قدرے چڑ کر زہرا کی بائی کی بات کاٹ دی۔

”حنیف میں ہی پہلے عورت ہوں پھر کچھ اور۔ عورت اگر طوائف بن جلتے تو بھی

اپنے سینے سے دل نکال کر باہر نہیں پھینک سکتی۔ تمہارے ساتھ ایک رات گزارنے

کی مجھے کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس بات کو کبھی

فراوانش نہ کرنا کہ میری ماں ایک خاندانی طوائف ہے جس کو اپنی بیٹی کی جوانی صرف اس

لیے عزیز ہے کہ وہ اس کے ذریعے دولت کے انبار لگاتی ہے۔ حنیف ہم خاندانی کبخر

ہیں۔ ہمارے پاس سوائے ناچ گانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بس میں اپنے دل کے ہاتھوں

بجور ہو کر تمہارے ہر فیصلے کا احترام کر رہی ہوں۔ حنیف کہیں مجھے بیچ مجدھار میں

نہ چھوڑ دینا۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے حنیف کے بازو پر سارا وزن ڈال دیا۔

”زہرا بائی یہ مرد کا قول ہے۔ میرے جیسے جی کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے

نہیں دیکھ سکتا۔“

اُس نے جذباتی ہو کر زہرا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے عہد و پیمانہ باندھتے رہے جب دروازے

پر دستک ہوتی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”اسے بیٹی شام ڈھل رہی ہے۔ رات کا کوئی بندوبست کر لو۔“

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے عنایت بائی نے اُس کی طرف دیکھ کر

آنکھ دباتی۔

”بی بی میں آج کوٹھانیں سجاؤں گی“

زہراں باقی نے ماں کی آنکھ کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔

”اچھا۔ میں بیٹھ جاتی ہوں۔ بیٹی کسی کو تو بیٹھنا ہی ہوگا۔ تیرا باپ کوئی مرے

تو میرے نام نہیں لگا گیا تھا۔ اگر پانچ دس ہزار کی رات نہیں لگے گی تو کھائیں گے

کیا۔ گھاس بھی اب مفت نہیں ملتی“

عنایت باقی نے جو اب اداکاری کی

”بی بی۔ کہہ دیا ناں کہ میں آج کوٹھانیں سجاؤں گی۔ حنیفا اتنی دُور سے آیا

ہے۔ میں اس کے سامنے کسی غیر مرد کے لیے نہیں ناچ سکتی“

زہراں باقی نے ماں سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر اداکاری کی۔

”ہاں ہاں۔ عنایت باقی یہ آج مجھ نہیں کرے گی“

حنیف خان کی غیرت بھی بیدار ہونے لگی۔

”اے بیٹا۔ وہ تو پچی ہے تو عقل مند لگتا ہے۔ بھلا ہم غریبوں کا اد کیا ذلیف

آمن ہے۔ یہی پانچ چار ہزار آئیں گے تو وال روٹی چلے گی“

عنایت باقی نے ملتتی لہجے میں کہا۔

”یہ لو پکڑو پانچ ہزار اور جاؤ یہاں سے۔ اور ہاں جب میں آیا کروں تو یہ

ناچنے گانے والی باتیں نہ کیا کرو۔ میری بات کی سمجھ آگئی ناں۔“

یہ کہتے ہوئے حنیف خان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے

پانچ نوٹ گن کر اُس کی طرف بڑھا دیتے۔

”ہاں ہاں۔ لو پکڑو۔ تمہارا نقصان نہ ہو جاتے کہیں۔“

زہراں باقی نے فوراً اُس کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر اپنی ماں کو تھا دیتے۔

”اچھا بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔ مجھ بڑھیا کی بات اب کوئی نہ مانے تو میں کیا

کروں“

عنایت باقی نے یہ کہتے ہوئے نوٹ اکٹھے کر کے اپنے گریبان میں اُدس لیے

اور جس طرح اندر آتی تھی اس طرح باہر نکل گئی۔

”حنیف خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ لیکن یہاں کا دستور ہی ایسا ہے

کہ یہاں قدم قدم پر نوٹوں سے ہی دوسرے کا منہ بند کرنا پڑتا ہے۔“

اُس نے ماں کے جاتے ہی حنیف سے چپٹے ہوتے کہا۔

”زہراں باقی تم نوٹوں کی پرواہ نہ کرنا۔ بس خوش رہا کرو۔ میری بات

سمجھ گئی ناں۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے گرجوشتی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

”ہاتے اٹھ میں نے ابھی کھانے کا بند و بست کرنا ہے اور اس موتے نذیرے

کو تو دفع کر لو۔“

رات تمہارے پاس ہی ہوں بھاگی تو نہیں جا رہی“

اُس نے آہستگی سے حنیف خان کی گرفت اپنے بدن سے ہٹا دی اور اُسے

ابھی آئی، کہہ کر باہر نکل آئی۔

زہراں باقی کے باہر جاتے ہی نذیر موچی اندر آ گیا۔

”واہ بھتی واہ۔ دو گھنٹے سے اکیلے موج میلہ کر رہے ہو اور اپنے یار کو بھول

ہی گئے۔“

اُس نے حنیف کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یار میں نے کہا تو بھی تو کسی کام میں مصروف ہوگا۔ تجھے بھی کون سا میں یاد

رہ گیا تھا۔ پھر اس چڑیا کو بھی تو قابو کرنا تھا۔“

حنیف خان نے تماش بینوں کے سے لہجے میں کہا۔

”کر لی قابو۔“

نذیر موچی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”اور کیا نہیں۔ ارے ہم بھی تمہارے شاگرد ہیں سالی بیچ کر کہاں جاسکتی تھی۔“

حنیف خاں نے شیخی گنجانا شروع کی۔  
”کتنے پیسے دیتے ہیں“

نذیر نے بے چینی سے اگلا سوال داغا وہ جانتا تھا حنیف کن ہواؤں میں  
رہا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔

”کچھ بھی نہیں۔ صرف پانچ ہزار روپے سے کام بن گیا ہے۔ وہ تو پانچ ہزار بھی  
نہیں لے رہی تھی“

اُس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

نذیر موجی جانتا تھا کہ یہ گدھا جھوٹ بھول رہا ہے لیکن یہاں جس طرح کی فضا  
چلی تھی اور جس طرح اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ماں بیٹی نے اُسے اُتو بنا کر  
حنیف خاں کو قابو کر لیا تھا اُس کے بعد نذیر سے کے لیے سواتے اس کی ہاں میں ہاں  
ملانے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا!

”بھئی واہ۔ کمال کر دیا تم نے تو۔“

اُس نے حنیف خاں کو اس کا نام پر شاباش دینے کے انداز میں کہا۔

”میں رات نہیں گزاروں گا۔“

حنیف خاں نے فوراً ہی کہہ دیا۔

”اچھا جی۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ٹھیک ہے صبح تازہ دم ہو کر چلے

چلیں گے“

نذیر موجی نے پیش بندی کی۔

”یاد تم تو یہاں پُرانے آنے جانے والے ہو۔ تمہیں کون سی رکاوٹ ہے“

بھی کرو موج میلہ۔“

حنیف خاں نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

”یہ تو پھر ہے“

نذیر موجی نے مصنوعی تمغہ بلند کیا۔

اس کے ساتھ ہی زہراں باقی اندر آگئی۔

”اچھا یاد میں ذرا بی بی کے پاس بیٹھتا ہوں تم لوگ کرو باتیں“

اُس نے زہراں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور باہر آگیا۔

”اسے زیادہ منہ نہ لگایا کرو۔ بڑا گھٹیا انسان ہے۔ اس سے کبھی خیر کی توقع

نہ رکھنا۔ ریاست شاہ کے لیے بھی یہ کبھی نہ کبھی آستین کا سانپ ثابت ہوگا میری بات

پتے سے باندھ لینا۔“

زہراں باقی نے اُس کے باہر نکلتے ہی دروازے کی گنڈی نکاتے ہوئے کہا۔

”اپنا کیا بگاڑ لے گا۔ ہم سے کیا لے جاتے گا“

حنیف خاں نے گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

مقوڑی دیر بعد نوکرات کا کھانا لے آیا۔

کھانے سے پہلے زہراں نے اپنی روایت کے مطابق اُسے شراب بھی پلا دی تھی

اب حنیف خاں اس کی کمر گرفت میں تھا۔

رات گئے تک اُس نے حنیف خاں کو ہوس کا جھولا جھلایا اور اُس پر مدہوشی

سی طاری کر دی۔

یہی مناسب وقت تھا اپنی بات کہہ دینے کا جس کی ہدایت اُسے اپنی ”بی بی“

کی طرف سے ملی تھی۔

”میں اگلے ہفتے تمہارے علاقے میں مجرہ کرنے آرہی ہوں۔ تم ضرور آنا۔“

اُس نے حنیف خاں کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

حنیف خاں پر شہاب اور شراب کا اکٹھا نشہ طاری تھا۔

”پلوال میں۔ بھئی اس علاقے کا کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں جو تمہاری زہراں باقی

کا مجرہ کر دانا اپنی عزت نہ سمجھتا ہو“

اُس نے بظاہر بڑی سادگی لیکن دراصل بڑی چالاک سے اپنی بات کہہ دی۔

لیکن — وہ تو....

”کیا وہ تو — تم نے ضرور آنا ہے حنیف خان۔ اگر تم نہ آتے تو میں بھی وہاں نہیں ناچوں گی۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔ بس مجھے کچھ نہیں پتا نہ مجھے کچھ اٹنی سیدھی بات بتانا۔ اپنی دوستی دشمنی اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اپنی زہراں کے لیے ضرور وہاں آنا ہے۔ ضرور آنا ہے۔“

ہوشیار طوائف زادی نے بڑی چالاکی سے حنیف خان کی بات کاٹ کر اُسے ٹھنڈے میں مبتلا کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ حنیف کے حواس پر چھا گئی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ سوچ بھی سکے۔ بڑی ہوشیاری سے اُس نے حنیف خان کی کمزور رگوں کو ایک ایک کر کے دبایا۔ اُس کی مردانگی کو چیلنج کیا اور اُسے گناہ اور لذت کی اُس اندھی نگری میں لے گئی جہاں حنیف خان کو سادلن کا اندھے کی طرح ہر طرف ہراہی ہرا دکھاتی دے رہا تھا۔

صبح تک حنیف خان اُس کا بندہ بے دام بن چکا تھا۔

نہتو خان بدعاش بستہ الفت کا بیٹا حنیف خان جس نے اپنی آنکھ گولیوں کی فائزگاہ میں کھولی جس کے لیے مینے میں دو تین مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرحد عبور کرنا اور گولیوں کی بارش میں سرحد پار سے مال ڈنگر کھول کر لانا اُس کا شہدادت پالیس اور ریجنرز نے اُس کے جسم کی ایک ایک پٹری پر طبع آزمائی کر کے اُس کی مردانگی کو ٹسٹ کر لیا تھا۔

لیکن —

یہاں ایک گھٹیا درجے کی جسم فروش طوائف نے اُس کی مردانگی کو ایک ہی دن میں ڈھیر کر دیا تھا۔

اُس پر حسیبت کا وہ فسوں پھونکا تھا کہ حنیف خان اس کا بندہ بے دام بن رہ گیا تھا۔

اُس نے زہراں بائی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور پلوال میں اس کا مجرہ دیکھنے آئے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

”دیکھنا کہیں یہاں سے جا کر بزدل نہ ہو جانا۔ حنیف خان تم میری زندگی میں پہلے مرد آتے ہو۔ میں اسے ایک بہادر مرد کی زبان سمجھوں گی — اور ہاں جب تک تم نہیں آؤ گے میں گانا شروع نہیں کروں گی۔ اگر تم نہ آتے تو خواہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں میں نہ ناچوں گی نہ گاؤں گی۔“

طوائف نے اُسے مزید پکا کر دیا۔

”زہراں! یہ مرد کا قول ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔“

حنیف خان نے اُسے کہا۔

صبح ناشتہ کرنے کے بعد دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ روانگی سے پہلے عنایت بی بی نے حنیف خان کی بلاتیں ضرورت سے زیادہ ہی لے لی تھیں اور اس کا اچھا خاصا دماغ خراب کر دیا تھا۔



”سردار صاحب — سمجھو کام بن گیا۔“

عالم داد نے جو اس وقت سردار رشید کی حویلی میں اُس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا فون سننے کے بعد کہا۔

یہ فون اسے ایس آئی موج دین کا تھا۔

موج دین اس کے ساتھ ہی پولیس میں سپاہی بھرتی ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مدد سے خوب منہ کالا کیا تھا اور لاکھوں کی حرام کاری کی تھی۔ عالم داد جس چکر میں پولیس کی نوکری سے جان چھڑا آیا تھا اُس میں موج دین برابر کا حصہ دار تھا لیکن اُس نے موج دین کو محفوظ رکھ لیا تھا۔ دونوں کا کاروبار شہر میں مشہور تھا جس کا عظیم موج دین کے منکے کو نہیں تھا۔

اُس نے موج دین کے ذریعے جو حُسن اتفاق سے اس بازار کے پولیس سٹیشن

میں اے ایس آئی تھا، عنایت بی بی کو اپروچ کیا تھا۔

دونوں شیطان ذہن کے مالک اور شیطانیت میں ایک دوسرے سے دو ہاتھ بڑھ کر تھے۔ اُس نے موج دین کو ساری کہانی سنا کر سردار رشید کی مستقبل میں اہمیت کا احساس دلانے کے بعد اُس کی مدد سے ہی سارا منصوبہ بنایا تھا۔

موج دین نے اب فون کر کے اُسے بتا دیا تھا کہ اُن کا کام ہو گیا ہے۔ !  
”عالم داد — ہاتھ پکا ڈالنا“ —

سردار رشید کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

”سردار رشید صاحب۔ میرا آپ کا آٹھ سال کا یارا نہ ہے۔ آج تک عالم داد نے کون سا ہاتھ کچا ڈالا ہے۔ ماضی میں کبھی میری دجہ سے آپ کو زک نہیں اٹھانی پڑی نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ہوگا —

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ایم پی اے بنا کر چھوڑوں گا — ان شاہزوں کی بدعاشی اب اس علاقے میں نہیں چلے گی — اور میں بہر صورت اپنا وعدہ پورا کروں گا —

عالم داد نے بڑی مٹکاری سے جواب دیا۔

”عالم داد — ہم بھی یاروں کے یار ہیں — کبھی بھینس اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور خدا رسول کو حاضر ناظر جان کر کے کہہ رہا ہوں کہ اگر میں ایم پی اے بن گیا تو دنیا کی کوئی طاقت تجھیں یونین کونسل کا چیرمین بننے سے نہیں روک سکتی —“

سردار رشید نے بھی گردن مچلاتی۔

”سردار صاحب ہم نے بھی کسی مرد سے یارا نہ کیا ہے — اگر فائدے ہی لینے ہوتے تو اللہ کے فضل سے کس بات کی کمی ہے —“

عالم داد نے دبی دبی زبان سے کہا۔

اُس نے سردار رشید کو بتایا تھا کہ کس طرح زہراں بائی کے ناچ گانے کا بندوبست کیا ہے اور اس کے گانے پر حنیف خان ضرور یہاں آتے گا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

سردار رشید نے اپنے مشیر خاص سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”چھوٹے سردار صاحب کو منگنی کی دعوت دینے کے لیے ننھو خان کے ہاں بھیج دیجئے۔ اس بات کا خاص خیال رہے کہ حنیف خان کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔“  
عالم داد نے مفصوبے کا اگلا حصہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن —“

”لیکن دیکھ کر چھوڑ دیتے — سردار صاحب! سیاست میں اگر، مگر، لیکن وغیرہ چلتے رہتے ہیں۔ آپ کو سیاست کا کھیل اس کے مردوجہ اصولوں کے ساتھ کھیلنا ہو گا۔ میرا یقین ہے کہ زہراں بائی نے مستقبل کی پیش بندی کے لیے اور ریاست شاہ کے غضب سے بچنے کے لیے حنیف خان کا سہارا ضرور لیا ہوگا — جب آپ کی طنز سے باقاعدہ دعوت چلی گئی تو باپ بیٹے میں اس مسئلے پر ٹھن جاتے گی۔“

سردار صاحب کجبری کا عشق بڑا جان لیوا ہوتا ہے اور حنیف خان اس پر عاشق ہو چکا ہے۔ ننھو خان کو اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے — ایک مرتبہ اگر وہ آپ کے ہاں کسی تقریب میں آ گیا تو ریاست شاہ آدھی جنگ ہار جائے گا بظاہر اُس کو یہی سمجھانا ہے کہ وہ منگنی کی تقریب میں آیا ہے۔ اس سے سیاست یا ووٹوں کا تعلق نہیں۔ بلکہ ہم کیا اُس کا بیٹا ہی اُسے سمجھائے گا۔“

عالم داد نے اپنی بات مکمل کر کے قہقہہ لگایا اور داد طلب نظروں سے سردار رشید کی طرف دیکھا۔

”ویل ڈن — عالم داد ویل ڈن —“

سردار رشید کے متہ سے بے ساختہ نکلا۔

اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سردار مرید کو وہیں بلا کر سارا منصوبہ سمجھا دیا تھا۔ عالم داد نے انھیں اس بات کی بطور خاص یقین کی تھی کہ سیاست میں کسی بات کا غصہ نہیں کیا جاتا۔ سرداری آن بان کو قائم رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایم پی اے

کی سیٹ حاصل کی جاتے جس کے لیے ہمیں نختوخان اور ریاست شاہ کے درمیان بدگمانی پیدا کرنی ہے۔

”کوئی بات نہیں چاچا — سرداری تو کہیں بھاگی نہیں جا رہی لیکن ایم پی اے کی گدی اگر ہاتھ سے نکل گئی تو پھر جانے کتنا انتظار کرنا پڑے —“

سردار مرید نے ہنستے ہنستے کہا اور تینوں تہقہ لگا کر ہنس دیئے۔

اگلے روز سردار مرید عالم داد اور علاقے کے تین چار اور محرزین کو ساتھ لے کر اپنی پجیر میں نختوخان کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

## عقیدت کے شکار

سردار مرید کی علاقے کے تین چار محرزین کے ساتھ آمد نختوخان کے لیے اس لیے اچھے کی بات تھی کہ سرداروں کو یہ علم ہو چکا تھا کہ نختوخان نے فضل شاہ سے ہاتھ ملالیا ہے اور اگلے انتخابات میں وہ ضرور ریاست شاہ کی حمایت کرے گا۔ اس کے دوست اور دشمن دونوں اُس کی اس عادت سے بھی آگاہ تھے کہ نختوخان زبان کا مرد ہے اُس نے جو کہہ دیا وہی کر کے دکھائے گا۔ اور ایک مرتبہ زبان دینے کے بعد اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ وہ اپنی زبان سے پھر جائے۔

لیکن —

اس بات کا حق تو ہر وقت دوسری پارٹی کے پاس موجود تھا کہ وہ اس سے رابطہ کر کے اُس کے خیالات بدلنے کی کوشش کرے۔ اور یوں بھی اپنی روایات کے مطابق وہ گھر آتے دشمن کو بھی واپس نہیں لوٹا سکتا تھا۔ یہ تو اس کے دشمن بھی نہیں تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سرداروں کا بھی اس علاقے کے بہت سے محرزین کی طرح وہی دھندہ تھا جس سے نختوخان بندھا تھا۔

لیکن —

ایسا آج تک نہیں ہوا تھا کہ اُن کے مفادات آپس میں ٹکرائے ہوں یا کبھی انھوں نے نختوخان کے لیے کوئی مسائل پیدا کیے ہوں۔ وہ اپنے علاقے میں کام کرتے تھے اور نختوخان اپنے علاقے میں۔ دونوں کے درمیان ایک خاموش اور شریفانہ معاہدہ موجود تھا کہ وہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اپنے ڈیرے پر نھتو خان اور حنیف خان دونوں نے مہانوں کا استقبال کیا۔ ایک دوپہرے کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد گفتگو کا آغاز عالم دادا سے ہی کیا کیونکہ وہی ایک ایسا ماسٹر مائنڈ ان لوگوں میں موجود تھا جس نے سارا منصوبہ بنایا تھا۔

”نھتو خان اس علاقے کے سارے مکین آپس میں بھاتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہم کوئی سیاسی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ میرے خیال سے ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ انتخابات میں وہ کسی کی حمایت کرے یا مخالفت۔ بھتیجی علم ہوگا کہ سردار رشید کے بڑے بیٹے کی منگنی ہو رہی ہے کیونکہ سردار صاحب کا یہ پہلا خوشی کا موقع ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس خوشی میں برادری اور اردگرد کے سارے دیہاتوں کے لوگ بھی شرکت کریں۔ ہم سردار صاحب کی طرف سے ان کے بیٹے کی منگنی پر شرکت کی دعوت لے کر آتے ہیں کیونکہ اپنی برادری کے تم ہی سردار ہو اس لیے سردار صاحب کی بھی اور ہماری بھی خواہش ہوگی کہ تم اپنی برادری کے ساتھ اس موقع پر ضرور شرکت کرو۔“

عالم دادا نے اپنی بات مکمل کر کے دادا طلب نظروں سے سردار مرید کی طرف دیکھا جس کی گھٹی مونچھوں کے نیچے چھپے ہونٹوں پر مسکراہٹ سانپ کی طرح رنگ رہی تھی۔

”ہاں بھتیجی نھتو خان یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں ہم سب شریک ہوں سردار صاحب کے گھر پہلی بڑی خوشی ہے اور ہماری سب کی بھی خواہش ہوگی کہ اس شرکت کریں!“

چوہدری غلام نبی نے جو اس کے ساتھ والے گاؤں کا نمبر دار تھا عالم دادا ہاں میں ہاں ملاتی۔

”عالم دادا بھاتی مجھے آنے میں کیا اعتراض ہوتا۔ ہماری کوئی سردار صاحب سے دشمنی تو نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے اگلے الیکشن میں ریاست

کی مدد کی ہامی بھری ہے اور سردار رشید اس کے خلاف الیکشن لڑ رہا ہے۔ اس طرح خواغزاہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کیونکہ ہم زبان کے بندے ہیں اور آج تک ہم نے اس علاقے میں صرف عزت ہی کمائی ہے۔“

”دیکھو نھتو خان ہم بھی برادری والے لوگ ہیں۔ سردار مرید اپنے ساتھ ہم لوگوں کو اس لیے لایا ہے کہ تم کم از کم ہماری ہی شرم رکھ لو۔ سیاست گئی بھاڑ میں۔ ہمارے علاقے میں کون سی ایسی شادی ہوتی ہے جس میں نزدیک کے دیہاتوں کے لوگ شریک نہ ہوتے ہوں۔ نھتو خان بھتیجی کم از کم ہمارے یہاں آنے کی لاج ہی رکھنی چاہیے اگر سردار مرید نے کہہ ہی دیا ہے تو تم ہاں کر دو۔ کیوں بسٹیا حنیف خاں۔“

اس مرتبہ نشانہ تاک کر نمبر دار رنگ علی نے تیر چلایا اور عین نشانے پر لگا۔ ”ہاں آتا۔ میرے خیال سے اس میں کوئی اعتراض والی بات تو ہے نہیں۔“ حنیف خان کے تودل و دماغ پر زہراں بائی سوار تھی اُس کے لیے تو جیسے اندھے کو اچانک دونوں آنکھیں مل گئی تھیں۔

اگر ان لوگوں کی طرف سے دعوت نہ ملتی تو بخانے اُسے پلوال جانے کے لیے لیا گیا سوانگ بھڑنا پڑتا۔

وہ کوئی ایسا عام سا دیہاتی بھی نہیں تھا جسے کوئی یہاں پہچان نہ سکتا۔ نزدیک دُور کے درجنوں دیہاتوں میں تو ان باپ بیٹے کو بچہ بچہ پہچانتا تھا۔

نھتو خان کو اُس کی بات نے ہلا کر رکھ دیا۔ نمبر دار رنگ علی نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور عالم دادا کی گھٹی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ چھپاتے نہیں چھپتی تھی۔ اس نے تو اپنے ہتھانیدار دوست کی مدد سے اندھیرے میں ہی تیر چلایا تھا۔

لیکن

یہ تیرتیر نشانے پر لگا تھا۔

”حنیف خاں ابھی بچہ ہے رنگ علی۔ تم نہیں سمجھتے۔ اب حالات پہلے والے



نہیں رہے۔ میں ریاست شاہ کو زبان دے چکا ہوں۔ اگر الیکشن کے بعد یہ تقریر ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔  
نھو خان نے قدرے تلخی سے کہا۔

”نھو خان تم نزدیک دور کے دیہاتوں میں اپنا نام مقام رکھتے ہو۔ بڑی بڑی پنجائتوں میں بھٹیں بلایا جاتا ہے۔ سردار صاحب بھی اس علاقے کے عزت دار آدمی ہیں۔ اُن کے بیٹے کی منگنی کی تقریب میں تمھارا موجود نہ ہونا بڑی عجیب سی بات ہوگی۔ پلوال کی بڑی بڑی پنجائتوں میں بھٹیں بلایا جاتا ہے پھر اس خوشی کے موقع پر تمھاری غیر موجودگی کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ دیکھو نھو خان ہمارے آنے کی شرم رکھو۔ ہم چار بندے آہی گئے ہیں تو ہمیں اب ذیل نہ کرو۔“  
عالم داد نے پھر وار کیا۔

”ہاں آبا۔ چا چا ٹھیک کہتا ہے۔ بھٹیں آخر اس میں کیا بُرائی نظر آتی ہے؟  
اس مرتبہ پھر حنیف خان نے مداخلت کی۔

”چپ کر جاوئے۔ زبان بند کر اپنی۔ تو کہاں سے اتنا سیانا ہو گیا کہ بڑے بھلے کی تمیز کر سکے۔ تو کیا مجھ سے زیادہ عقل مند ہے؟“  
نھو خان نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔

یہی عالم داد چاہتا تھا۔

”نھو خان۔ بس کر جا بھائی۔ ہم چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی بے عزتی کو براہ ہے لیکن خدا نہ کرے ہماری وجہ سے باپ بیٹے کے درمیان کوئی تلخی ہو۔“  
علم داد نے بڑی مکاری سے اگلا حلقہ کیا۔

”نھو خان تجھ سے یہ امید نہیں تھی کم از کم تیس سال کی یاری کی شرم ہی رکھ لیتا۔ تیرے بڑے بھلے وقت میں کام آتے ہیں۔ کبھی تجھ سے منہ نہیں موڑا۔ آج تو ہمارے کہنے پر پلوال نہیں جا رہا۔ اچھا بھئی تیری مرضی۔ لیکن یاد رکھنا تجھے بھی کل کلاں اپنے بیٹے کو بیاہنا ہے اور تیری برادری کے سارے بڑے

پلوال جا رہے ہیں۔ انھوں نے سردار صاحب کی دعوت میں جانے کی ہامی بھری ہے۔ نھو خان اتنی ضد اچھی بات نہیں ہے۔“

اُس نے عالم داد کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔  
عالم داد اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”جلو بھائیو۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا ہمیں۔“  
اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا نھو خان جیسے تیری مرضی بھئی۔ ہم تو چاہتے تھے کہ بھائی چارے کی فضا بنی رہے اور ہم ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شرکت کرتے رہیں۔ اب اگر ریاست شاہ نے تجھے اتنا بڑا سیاستدان بنا دیا ہے کہ تو اپنی برادری کی بات ہی نہیں مان رہا تو تیری مرضی میاں۔“

سردار مرید نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”چاچا۔ میں سمجھا لوں گا آبا کو۔ تم لوگ مطمئن ہو کر جاؤ۔ ہم ضرور آئیں گے۔ بھاڑ میں جاتے ایسی سیاست اور الیکشن۔ دیکھا جلتے گا جب وہ وقت آتے گا۔ ہم آئیں گے ضرور۔“

حنیف خان نے اچانک ہی کہا اور نھو خان بھونچکا رہ گیا۔

اُس کے پاس اب ہاں یا ناں کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ حنیف خان نے اُسے عجیب ٹھنڈے میں پھنسا دیا تھا۔

”جیتا رہ بیٹا۔ اللہ تجھے لمبی عمر دے۔ ہمارے یار نے تو یاری کی شرم نہ رکھی۔ تو نے ہماری لاج رکھ لی۔“

نمبر دار رنگ علی نے اس کی کمر ٹھونکتے ہوئے کہا۔

سب لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ نھو خان کی مزید کوئی بات نہ لے بغیر اس سے اس طرح مصافحہ کر رہے تھے جیسے یہ بات اُس کے بیٹے کے بجائے نھو خان کے منہ سے نکلی ہو اور نھو خان

ہونفوں کی طرح کبھی اُن کا اور کبھی اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگا جو باری باری اُن سب سے نبل گیر ہو کر انھیں رخصت کر رہا تھا۔

ریاست شاہ کے اعصاب پر یہ خیرم کے دھا کے کی طرح بھیٹی تھی۔

”اُس دوشکے کی کجگری کی یہ ہمت کہ ہمارے دشمنوں کے ڈیرے پر جا کر ناچ گانا کرے۔ میں دیکھوں گا یہ کیسے ہوتا ہے۔“  
اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

فضل شاہ اور نذیر موچی اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے اور نذیر موچی نے اُن دونوں کے سامنے شہر کے سارے واقعات بیان کر دیئے تھے۔

”اوتے تو اُسے لے کر کیوں گیا تھا اُس کے ڈیرے پر۔ کتے کے پتے بہت عقل مند بنتا ہے تو۔“

اس مرتبہ ریاست شاہ نذیر موچی پر برس پڑا تھا۔ جس کے لیے یہ کوئی انہونی صورت حال نہیں تھی۔ وہ اپنی چرب زبانی سے ایسے متعدد مواقع پر شاہ صاحبان کو غیظ دے چکا تھا۔

”شاہ جی۔ میری عرض تو سن لیں میرے بادشاہ۔ اگر غلام کا قصور نکلے تو اس پر دہی ڈال کر کتے چھڑوا دینا۔ میرے بادشاہ! اگر میں اُس کی نگرانی نہ کرتا تو اس بات کا علم میری سرکار کو کس طرح ہوتا۔ میں تو آپ کے دسترخوان کا کتا ہوں میرے شاہ جی۔ مجھے آپ کے مفادات کی ہر دقت نگر رہتی ہے میرے بادشاہ۔ اب ہم کوئی آپا (علاج) کر سکتے ہیں۔ ابھی دقت ہے۔ اگر وقت کے بعد علم ہوتا تو پھر ہم کیا کر لیتے۔ میرے بادشاہ سمجھ گئے آپ۔“

نذیر موچی نے اپنی زبان چلائی۔

”ہاں بیٹائی صاحب۔ نذیر کا کیا قصور۔ اس کی وجہ سے تو ہمیں بات کا علم ہوا۔ میں نے خود ہی تو اسے چپکایا ہوا ہے حنیف خان کے ساتھ آپ کے حکم پر۔“

فضل شاہ نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہوں ںں۔ کہتا تو سالا ٹھیک ہی ہے۔ پر یہ ہوا کیسے اوتے۔“

ریاست شاہ نے بیوقوفوں کی طرح اس کی بات پر صا د کیا۔

”شاہ جی ہونا کیا تھا۔ ہمیں کیا علم تھا کہ ننھو خان کا ڈکیت بیٹا عاشق مزاج

بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے عورتیں آنی جانی چیز ہیں۔ لیکن خدا جلنے اُس زہرہ بانی نے ایک ہی رات میں اُس پر کیا جادو چھوہک دیا جو یہ اُس کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے۔“

”کچھ بھی ہر فضل شاہ۔ اول تو اُن کا ناچ گانا ہی پلوال میں نہ ہونے دینا۔

اگر ایسا ہوا بھی تو ننھو خان وہاں نہ جانے پاتے۔ تم نہیں جانتے اس سردار کے بچے کو۔

اُس کے بزرگ ضرور سمجھ رہے ہوں گے لیکن وہ بیٹے سے زیادہ مگتا رہے۔ اُس نے

بہت سوچ سمجھ کر یہ چال چلی ہے۔ اور ہاں تمہارے اندر بھی کوئی آستین کا سانپ

موجود ہے۔ ضرور اُس نے کسی سے بھید لیا ہے کہ تم نے زہرہ بانی کے ذریعے

حنیف خان کو قابو کر رکھا ہے۔ میری بات سمجھ کر نہیں۔“

ریاست شاہ نے کہا۔

”یہ بات تو دل کو لگتی ہے شاہ جی۔ واقعی سوچنے کی بات ہے آخر سرداروں

کو کس نے زہرہ بانی تک پہنچایا ہے۔ اس بازار میں اس سے بہتر درجنوں طوائفیں موجود

ہیں۔ آخر انھوں نے اُس کا انتخاب کیوں کیا۔“

نذیر موچی نے ریاست شاہ کے حدشات کی تصدیق کی۔

”دیکھ لیں گے بھائی جان۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ اُن کا مقابلہ بھی ریاست شاہ

اور فضل شاہ سے ہے۔ دیکھوں گائیں کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے۔“

فضل شاہ نے اپنی مونچھوں پر اٹاٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”فضل شاہ یہ سردار رشید کا پہلا حملہ ہے۔ اگر اُس کا دارکاری پڑا تو ہمیں

گرا جائے گا۔ پہلے حملہ ہی کا منہ توڑ جواب ملنا چاہیے۔“

ریاست شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی۔ آپ مطمئن ہو جائیں جب تک آپ کا یہ غلام موجود ہے۔ کوئی جبار آپ کے خلاف کامیاب نہیں ہونے دے گا۔“

نذیر موچی نے چچہ گیری کا مظاہرہ کیا۔

”زیادہ ٹرٹرنہ کیا کرادئے۔ دو کوڑی کا کام نہیں کرتا۔ اگر تو اس قابل ہوتا

تو یہ نوبت ہی کیوں آنے دیتا۔“

ریاست شاہ نے مکرے سے نکلنے ہوتے اُسے لتاڑا۔

اب وہاں فضل شاہ اور نذیر موچی رہ گئے تھے۔

”نذیرے ایک بات یاد رکھنا جس روز سردار رشید الیکشن جیت گیا۔ لگے دن

وہ ساری فائین کھل جائیں گی جو ہم نے پولیس کو کہہ کر دیا رکھی ہیں۔ اور تو جانتا ہے

کہ لڑکی کے اخوا کا کیس کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ تو نے پولیس کے دو جوتے نہیں کھانے اور

یہ بھی بک دے گا کہ تو نے اُسے کہاں لے جا کر فروخت کیا تھا۔ میری بات سمجھ

گیا ہے ناں۔ تیری بقا بھی ریاست شاہ کی کامیابی میں ہے اور میری بھی۔

میں بھی تب ہی یونین کونسل کا چیئرمین بن سکوں گا۔ نذیرے ایک مرتبہ اگر میں

یونین کونسل کا چیئرمین بن گیا ناں۔ تو یاد رکھنا کہ ارد گرد کے پچاس دیہات پھر

ہمارے ہو گئے۔ اور تیرے لیے تو وہاں بہت مال موجود ہوگا۔ ہے ناں۔“

فضل شاہ نے سگریٹ کا کش رکا کر دھواں اُس کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی آپ مائی باپ ہیں۔ ہم کسی کمینوں کی عزت آپ ہی کے دم قدم سے

ہی تو ہے اور پھر آپ کی خدمت میں ہی تو۔۔۔“

”ہماری بات چھوڑ دے۔ سمجھا کہ نہیں۔ ہم تو اپنا آپ بچالیں گے کسی نہ کسی

طرح۔ نذیرے ہاتھی مُردہ بھی ہو تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ گزشتہ تیس سینتیس سال

اگر اس گاؤں میں پولیس داخل نہیں ہوتی تو آئندہ بھی ایسا نہیں ہوگا۔ تو بس اپنی

فکر کر۔ اور ایسے حالات نہ پیدا ہونے دینا کہ بڑے شاہ صاحب الیکشن ہار جائیں۔

نذیرے اس الیکشن میں دونوں طرف سے اگر کوئی پارٹی نمایاں کردار ادا کرے گی تو

وہ نتھو خان ہے۔ جس طرف وہ جھبک گیا وہی پلٹا بھاری پڑے گا اور وہ جھکے گا

ہماری طرف۔۔۔۔۔“

فضل شاہ نے اُس کی بات کاٹ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔

”شاہ جی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔“

نذیر موچی کے ذہن میں اچانک ہی ایک کونڈا سا لپکا تھا۔

”کیا۔؟“

فضل شاہ نے بیقراری سے پوچھا۔

”اگر آپ، اس مجرے سے ایک روز پہلے ہی نتھو خان کو یہاں لے آئیں کسی۔ بھی

بہانے سے اور الیکشن مہم میں مصروفیت کے بہانے ایک دو دن ہیں اُلجھائے رکھیں تو

وہ پلوال نہیں جاتے گا۔“

نذیر موچی نے تجویز پیش کی۔

”بات تو تیری ٹھیک ہے نذیرے۔“

فضل شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اُس کا بیٹا۔ کہیں وہ۔۔۔۔۔“

فضل شاہ ابھی تک مشکوک تھا۔

”شاہ جی۔ پہلے ایک کام تو ہونے دیں۔ اُسے بھی دیکھ لیں گے۔ میں کوشش

کروں گا یہ مجرہ ہی نہ ہونے پاتے۔ زہرہ بائی وہاں جا ہی نہ سکے۔“

نذیر موچی نے چڑتے ہوئے کہا۔

”تم کوشش نہیں کرو گے۔ ایسا ہونا چاہیے۔ اور ہاں تم کل ہی نتھو خان کو

شاہ صاحب کی طرف سے پیغام پہنچا دو کہ لگے روز ہم الیکشن سے متعلق خصوصی میٹنگ

کر رہے ہیں جس میں باپ بیٹے کی موجودگی ضروری ہے۔“

فضل شاہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے مائی باپ۔“

اگلے روز وہ ریاست شاہ کا پیغام لے کر جب نھو خان کے ڈیرے پر پہنچا تو جوہیا میں نھو خان موجود نہیں تھا۔ اُس کے بیٹے حنیف خان نے نذیرے کا استقبال کیا۔

”یار ایک آدھ ملاقات آج کل میں اور نہیں ہو سکتی“ —

حنیف خان نے اس کا حال احوال دریافت کرنے کے فوراً ہی بعد اپنی فرمائش ڈال دی۔ نذیر مویجی تملاکر رہ گیا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ اس مجبوں پر ہوس کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار ہو گیا ہے اور یہ تمام مصلحتیں ایک طرف رکھ کر ضرور پلوال پہنچے گا خواہ اس کو اپنے باپ ہی سے کیوں نہ ٹکرانا پڑے —

نذیرے کی جان بڑے عذاب میں پھینس گئی تھی —

فضل شاہ نے اُس کے کندھے پر جو بوجھ لا دیا تھا اس نے نذیر مویجی کی کمر ڈھری کر دی تھی۔ اُس نے کچی گولیاں مٹیں کھیلی تھیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فضل شاہ ایک طرح — اُس کے ہر جرم میں برابر کا شریک تھا کیونکہ اس نے اور گروہ دیہاتوں سے جتنی لڑکیوں کو اغوا کر کے بازارِ حُسن تک پہنچایا تھا۔ اُن میں سے کوئی ایسی نہیں تھی جسے سب سے پہلے اس نے فضل شاہ کے بستر کی زینت نہ بنایا ہو۔ گو کہ اُس نے یہ ساری حرام کاریاں حفظِ ماتقدم کے طور پر کی تھیں اور فضل شاہ کی ہوس کی آگ گزشتہ دس سال سے مسلسل بجھاتا آرہا تھا۔

لیکن —

اُس کی جان بچانے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔

عین ممکن تھا کہ اگر ریاست شاہ ایکشن ہار جاتا اور پولیس دبے ہوتے کیس دوبارہ کھول دیتی تو فضل شاہ اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔

کم از کم نور پور گاؤں سے اُس نے حال ہی میں جس لڑکی کو ورغلا کر اغوا کیا اور پھر اُسے عنایت بائی کے ذریعے ملک کے ایک بڑے شہر کے بازارِ حُسن تک پہنچا دیا تھا کہ مین اس کی ضرورت نکال بوٹی کر ڈالتے —

اس نے یہاں بسنے والی ایک غریب قوم کی بیٹی کے ساتھ ظلم کیا تھا اور یہ

فضل شاہ ہی تھا جس نے نور پور کے ان غریبوں کو مقامی چوہدریوں کی مدد سے دبا رکھا تھا ورنہ وہ تو شہر میں جلوس لے کر جا رہے تھے کہ مقامی تھانے دار ملزم کو گرفتار نہیں کر رہا جبکہ انھوں نے اپنی لڑکی کے اغوا کا پرچہ درج کر داتے ہوئے اُس میں نذیر مویجی کو ملزم نامزد کیا تھا۔

آج کل تو یوں بھی ملک میں سپیڈی کلاس ”چل رہی تھیں اور ایسے کیس عموماً خصوصی عدالتوں ہی میں جاتے تھے۔

نھو خان کے گاؤں کی طرف آتے ہوتے وہ چشمِ نقور میں جب خود کو ٹھکلی سے بندھے دیکھتا اور سوچتا کہ کس طرح کوڑے اس کی کمر پر برس رہے ہیں تو اس پر اس تصور ہی سے لرزہ طاری ہونے لگتا —

اُس کی بقا واقعی ریاست شاہ کی کامیابی میں تھی اور اگر حنیف خان سردار رشید کے قابو آجاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے جیتنے سے نہیں روک سکتی تھی کیونکہ نھو خان کی سب سے بڑی کمزوری اس کا اکلوتا بیٹا ہی تھا جس کے لیے وہ اپنے ہر اصول کو قربان کر سکتا تھا۔

”یار ذرا صبر سے کام لے۔ اس طرح معاملہ ایک مرتبہ بگڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ طوائف کی یاری بڑی سوچ سمجھ سے نبھائی جاتی ہے۔ اُس نے یہاں آنا تو ہے۔ وہاں سے اُسے اپنے گاؤں میں ایک رات کے لیے لے آنا —

نذیرے نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

”لیکن اس کی ماں مان جائے گی“ —

حنیف خان کی رال ٹپک رہی تھی۔

”ماننے کی کیوں نہیں — پانچ دس ہزار دے کر اُس کا منہ بند کر دیں گے۔

حنیف خان وہ طوائف زادی ہے۔ اس شہر کی مشہور طوائف کی بیٹی۔ دولت کمانا ان لوگوں کی زندگی کا سب سے پہلا اور آخری مشن ہے اور عنایت بائی کے لیے ہاتھ آئی مایا چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے ہاتھوں خود تو گولی مار لے — میری

بات سمجھ گئے ناں — ذرا صبر اور حوصلے سے کام لو اور ہاں چا چا کدھر ہے —  
 اُس نے جل بھن کر لیکن بظاہر بڑے نارمل لہجے میں کہا —  
 ”ٹھیک ہے یار تیرے ہوتے ہوتے مجھے فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بڑا  
 ہوں ابا کو — خیریت تو ہے ناں —“

حنیف خان نے سر راہے چلتے چلتے پوچھ لیا۔

”کل ریاست شاہ بڑی اہم میٹنگ کر رہا ہے۔ اس میں تم لوگوں کو بلایا ہے۔  
 بھئی اب تمہاری مرضی کے بغیر وہ کوئی میٹنگ تو نہیں کر سکتا ناں — اب تو تم سرداروں  
 کے مقابلے میں اس کے سب سے بڑے حلیف بن چکے ہو —“

نزیر موچی نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن اتنی جلدی کیا ہے — ابھی تو ایکشن ہونے میں پورا ایک مہینہ پڑا ہے —  
 حنیف خان نے ذرا تنگی سے لہجے میں کہا۔

”ارے یار میرے تو سیاست کی ہیرا پھیریاں نہیں سمجھ سکتا — تو سیدھا سیدھا  
 مرد ہے۔ دلیر آدمی ہے۔ سامنے سے حملہ کرنے والا۔ تجھے ابھی ان باتوں کی سمجھ نہیں  
 آتے گی پھر تجھے اس سے کیا لینا دینا۔ ایک مہینہ رہ گیا ہے یا ایک سال — جانو  
 چاچے کو بلا لا —“

نزیر موچی گھبرا گیا تھا۔

”سلام علیکم — سنا بھتی نزیرے کیا حال ہے —“

اچانک ہی سامنے والے دروازے سے نتھو خاں اندر آ گیا تھا۔  
 نزیر موچی کی جان میں جان آگئی۔ اُسے تو اب یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہ  
 شاید حنیف خان اپنے باپ تک شاہ صاحب کا پیغام ہی نہ پہنچے دے۔

”ٹھیک ہوں چاچا — شاہ صاحب نے بطورِ خاص تمہارے پاس بھیجا تھا۔  
 سلام کہا ہے —“

اُس نے اپنی آمد کا مقصد نتھو خاں کو سمجھا دیا۔

اور —  
 نتھو خاں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اُس کا ذہن بعینہ وہی بات سوچ رہا تھا جو فضل شاہ  
 اور ریاست شاہ ہی نے سوچی تھی۔

نتھو خاں بڑا با اصول آدمی تھا۔ اُس نے اس علاقے میں تیس سال بدعاشی کی  
 تھی لیکن اپنے اصولوں کے ساتھ۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کو زبان دے کر  
 مگر گیا ہو۔ وہ مر تو سکتا تھا لیکن اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا تھا اور اب حالات اچانک  
 اس طرح پلٹا کھائے تھے کہ اُسے اپنی ساری عمر کی ریاضت خاک میں ملتی دکھائی دے  
 رہی تھی —

نتھو خاں کو اصل صورت حال کا تو علم نہیں تھا کہ اُس کا صاحبزادہ ہی طوائف کو  
 دل دے بیٹھا ہے۔ اُسے تو صرف یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر حنیف خان اس کی  
 مرضی کے برعکس پلوال چلا گیا تو اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

ریاست شاہ اچھا تھا یا بُرا۔ اس سے اُسے بھت نہیں تھی۔ اُن لوگوں نے اُسے  
 زبردستی اپنے ساتھ نہیں ملایا تھا۔ اُسے دوستی کی باقاعدہ قیمت ادا کی تھی۔ علاقے کے  
 تھاندارے اس کی عزت کرواتی تھی۔ اور اُس کی اگلی زندگی کو تحفظ دیا تھا۔

نتھو خاں اب سرحد پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

وہ اکلوتے بیٹے کا باپ تھا اور اُس کی خواہش اب صرف یہی تھی کہ جتنی جلدی  
 ممکن ہو اپنی بہن کی بیٹی کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ اُس کا خاندان بڑا مختصر تھا۔ ایک  
 بہن تھی جو جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

لیکن —

کیا مجال جو اس نے کبھی نتھو خاں کی غیرت پر آئینج آنے دی ہو۔ قرآن شریف  
 پڑھی ہوتی تھی۔ بچوں کو قرآن پڑھا پڑھا کر اپنی بیٹی جوان کر لی۔ وہ بھی نتھو خاں  
 کے گاؤں ہی میں رہتی تھی اور اب شاید اس انتظار میں زندہ تھی کہ کب اپنی اکلوتی بیٹی  
 رضیہ کے ہاتھ پیسے کرے۔

فضل شاہ نے اس کی بات کاٹ کر اُسے ڈانٹ دیا۔

نذیر موچی کو زندگی میں آج شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی حیثیت تو وقتی استعمال کی کسی شے سے زیادہ کچھ بھی نہیں، فضل شاہ سے اُسے کم از کم یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح وقت آنے پر آنکھیں پھیرے گا اور اُس کے ساتھ یہ سلوک کرے گا۔

”ٹھیک بے شاہ جی۔ نوکر کیا اور خنجرہ کیسا؟“

نذیر موچی نے کہا۔

اُس نے دل ہی دل میں بڑا خطرناک منصوبہ بنا لیا تھا۔

اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ شاہ صاحبان وقت آنے پر اس کی قربانی دینے سے بھی ہرگز دریغ نہیں کریں گے۔

نذیر موچی کو سمجھ آگئی تھی کہ اُس کا بُرا وقت آنے والا ہے۔ اس علاقے میں اُس کے جرائم کے ایسے ایسے ثبوت موجود تھے کہ وہ اگلی ساری زندگی جیل کی سلاخوں سے باہر نہ آسکتا اور اس کی اس کمزوری پر فضل شاہ جب چاہتا آسانی سے بلیک میل کر سکتا تھا۔

”فضل شاہ۔ میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ غارتگری کروں لیکن پہلے تم نے کی ہے۔ میں تمہیں بتا دوں گا کہ جیونٹی وقت آنے پر ہاتھی پر بھاری پڑتی ہے۔ ٹوٹنے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے۔“

اس نے دل ہی دل میں کہا پھر فضل شاہ سے گویا ہوا۔

”شاہ جی میں ہزار تو اُسے ایڈوانس ملے ہیں۔ تیس چالیس ہزار سے بھی بڑھ کر سکوں گا اس کا۔ میرا وعدہ رہا کہ الیکشن کے اگلے ہی روز یہ ساری رقم مجھ کو آپ کو واپس کر دوں گا۔“

”نذیر سے۔ تو رہا موچی کا موچی۔ اُنوکے بیٹے ہارناں اگر عوام آج کے لگیں تو ہم نے کراچی سے۔ تو اُسے پچاس ہزار روپیہ دے آؤ۔“

نہتوخان نے بھی سمجھا تھا شاید عمر کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی ہے اور اب وہ باقی زندگی اطمینان سے گزار دے گا۔ اس کی زندگی کی اب بیٹی کی شادی کے علاوہ اگر کوئی خواہش تھی تو صرف یہ کہ اپنی بیوی اور بہن کے ساتھ حج کر آئے لیکن رضیہ کی شادی کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

نہتوخان نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ الیکشن کے خلتے پردہ اپنے بیٹی کی دھوم دھما سے شادی کروادے گا۔ اسی درمیان وہ ریاست شاہ کی مدد سے پولیس کے ریکارڈ سے اپنا اور اپنے بیٹے کا نام خارج کروانا چاہتا تھا تاکہ اس کی موت کے بعد بھی پولیس والے ماضی کی طرح غنڈہ ایکٹ کی آڑ میں اس کے بیٹے کو تنگ نہ کر سکیں۔

ریاست شاہ کی طرف سے یہ دعوت ملنے پر نہتوخان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس طرح کم از کم اُسے مصروفیت کا بہانہ مل جائے گا اور اس کا بھرم رہ جلتے گا۔

”ٹھیک ہے نذیر سے تو روٹی پانی کھاپی۔ میں انشاء اللہ کل صبح ہی حلیف خانہ کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔“

اُس نے نذیر موچی سے کہا۔

نذیر موچی نے تب یہی سوچا تھا کہ شاید بلا ٹل گئی ہے اور اب اُس کی جان بچا جائے گی۔ اپنی دانست میں بھی اس طرح کہ وہ خوش و خرم فضل شاہ کو یہ خوشخبری سنانے پہنچا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم ہر ممکن کوشش کرو کہ عنایت باقی اپنی بیٹی کو پلوال لے کر جائے۔ اُسے جتنی رقم بھی دینی پڑے فی الحال دے کر روک لو۔ اس کے پھر اُس سے نمٹتے رہیں گے۔“

فضل شاہ نے اگلا حکم سُنا دیا۔

”لیکن شاہ جی۔ جب نہتوخان اور اس کا بیٹا یہاں آجائیں گے۔ پھر تو زیادہ بیک بیک نہ کیا کر اوتے۔ ریاست شاہ کا حکم ہے کہ عنایت اور اس کی بیٹی پلوال نہ جائیں تو وہ نہیں جاسکیں گی۔ سمجھا آگئی میری بات کا“

دقت کو ٹال دو۔ اس کا اگر کوئی باپ بھی تھا تو وہ بھی ہمیں خود رقم واپس لوٹا بلکہ  
گا۔ یہ ہمارا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو۔“  
فضل شاہ کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ گیا تھا۔

○

پچاس ہزار روپیہ فضل شاہ نے اپنے ہاتھ سے گن کر نذیر موچی کے حوالے کر  
دیا تھا۔

”آج ہی نکل جاؤ۔ دقت کم ہے۔ کل صبح تک ہمیں خوشخبری مل جانی  
چاہیے۔ یس رات کو مختارے ٹیلی فون کا انتظار کروں گا۔ اگر صبح تک بات نہ بنی تو پھر  
ہمیں کوئی سخت ایکشن لینا پڑے گا۔ تم ریاست شاہ کے غصے کو جانتے ہو۔ اور یہ بھی  
یاد رکھنا کہ سیاست میں کوئی کسی کا مافی باپ نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی عزت اور اسٹیبل  
کی سیٹ بچانے کے لیے اگر اپنے کسی ملازم کی قربانی بھی دینی پڑے تو ریاست شاہ  
اس سے دریغ نہیں کرے گا۔ میری بات تم سمجھ گئے ناں۔“

فضل شاہ نے گھلتا ہوا سیدھ اس کے کانوں میں اندھیلے ہوئے کہا۔  
”شاہ جی آج تک آپ کا یہ غلام کبھی ناکام واپس نہیں لوٹا۔ اب ایسا کیوں  
ہوگا۔ آپ مطمئن رہیں۔ شاہ جی۔ بالکل اطمینان رکھیں آپ کو رات فون پر ہی اطلاع  
مل جائے گی۔“

نذیر موچی نے مکاری سے دانت نکالے۔

”ٹھیک ہے اٹھ بیٹی۔“

فضل شاہ نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور نذیر موچی اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر  
اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر آ گیا۔

پچاس ہزار روپیہ اُس نے حسب معمول کینوس کے ایک معمولی سے پتیلے میں ڈال  
لیا تھا اور کسی کو احساس ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کے پاس اتنی رقم بھی ہو سکتی ہے۔  
اصولی طور پر تو اُسے یہاں سے نزدیکی بس سٹیڈ تک جانا تھا جہاں سے وہ اپنا

لے کر شہر تک جاتا۔

لیکن

نذیر موچی یہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا تھا اُس کے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ساری  
زندگی اُس نے عیش و عشرت کی نذر کر دی تھی۔ بیوی لڑا کر چار پانچ سال پہلے میکے  
چلی گئی تھی اور آج تک واپس نہیں آئی تھی۔ اُس نے پچھلے سال ہی بیوی کو طلاق  
دے دی تھی۔

نذیر موچی نے فضل شاہ کی معیت میں رہ کر اگر اور کچھ نہیں کیا تھا تو بڑے بڑے  
خواب ضرور سجا لیے تھے اس کی خواہش تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر دوسرے شہر میں جا بے  
اور باقی زندگی بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رتیبوں کی طرح گزار دے۔

اس مقصد کے لیے اُس نے شہر کے ایک بیک میں اکاؤنٹ کھولا تھا جس کا علم  
سوائے اس کے یا خدا کی ذات کے اور کسی کو نہیں تھا۔ نذیر موچی نے یہاں ڈیڑھ دو  
لاکھ روپے کی رقم جمع کر لی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر اس بڑے دقت کی تیاری کر رہا  
تھا۔ آج اسے اپنے فیصلے پر خود کو شاباش دینے کو دل چاہتا تھا۔

اپنے گھر سے جو دراصل میں فضل شاہ ہی کی حویلی کا ایک حصہ تھا اس نے اپنا  
بیگ لیا اور اسے پچڑوں سے بھر کر گاؤں سے باہر آ گیا۔ یہ بیگ اُس نے لٹھے گاؤں  
میں اپنے ایک دوست کے پاس رکھا اور اگلے گاؤں کا راستہ لیا۔

حمید اُسے گاؤں کے باہر حویلی پر ہی بل گیا۔

حمید مقامی سمگلر اور فضل شاہ کا ساتھی تھا۔

فضل شاہ نے اپنے اس نوعیت کے گھناؤنے کاموں میں نذیرے کو اپنا ہرا زبنا  
رکھا تھا۔ آج تک نذیرا ہی حمیدے کے پاس مال لایا اور لے جایا کرتا تھا۔ فضل شاہ اس  
کا ساتھی ضرور تھا۔

لیکن

اُس کی حیثیت ”سیدنگ پارٹنر“ کی سی تھی۔

اس کے تمام مفادات کی نگرانی نذیر موچی ہی کرتا تھا۔ فضل شاہ کا صرف اتنا کام تھا اپنا آدھا حصہ نذیر سے کے ذریعے وصول کر لیا کرے اور پولیس پکھری میں اس کی مدد کرے —

مقامی تھلے دار کو علم تھا کہ حمید افضل شاہ کا آدمی تھا اور انہیں باقاعدگی سے حصہ مل جایا کرتا تھا اس لیے انہوں نے کبھی حمید سے کوئی شک نہیں کیا تھا۔ فضل شاہ مال سرحد کے دوسری طرف پہنچانے کے لیے کسی نہ کسی پلٹ پر اپنا کوئی شکار تلاش کر رہا تھا۔ جن کو حصہ بخرہ دے کر وہ حمید سے کا مال پار پہنچا دیا کرتا تھا۔

ایسے تین چار اور گورکھ دھند سے بھی اُس نے اس علاقے میں پھیلا رکھے تھے نذیر ریاست شاہ سے پہلے بڑے شاہ صاحب کی بھی مکمل پشت پناہی حاصل رہی تھی۔

فضل شاہ کا خاص ہر کارہ ہونے کے سبب نذیر موچی اُس کے اور ان گورکھ دھند کے درمیان آدمی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ حمید سے کے لیے نذیر موچی کی حیثیت وہی تھی جو فضل شاہ کی ہو سکتی تھی کیونکہ فضل شاہ نے اس کا تعارف اس حیثیت سے کرا لیا تھا۔ لاکھوں روپے وہ حمید سے لے جاتا اور اُسے فضل شاہ سے لاکر دیا کرتا تھا۔

”آج بھی نذیر سے — خیر ہے کیا حال ہے تیرا“

حمید سے نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

”یار ایک ایرجنسی آگئی ہے۔ شاہ صاحب نے فوراً دو لاکھ روپے کا بندوبست کرنا

کے لیے کہا ہے۔ دراصل ایک سودا —“

لیکن ابھی تین روز پہلے ہی تو ایک لاکھ لے گیا تھا۔ میرے پاس اتنی زیادہ رقم دو

تین روز تک نہیں آسکتی — خیر ہے — شاہ صاحب کو کیا ضرورت آن پڑی —“

حمید سے نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

”حمید سے یار تجھے تو علم ہے بڑے شاہ صاحب الیکشن میں ہتھ لے رہے ہیں۔ دو

طرف پٹوال والے سردار اچانک مقابلے پر آگئے ہیں اور بالکل اچانک — پارٹی دو

منگڑی ہے۔ بس یاران بڑے لوگوں کے اپنے ہی دھندے ہوتے ہیں — ایک سرکار

چب آتی ہوتی ہے شاید کوئی سووے بازی ہو رہی ہوگی تو جانتا ہے شاہ صاحب پیسے کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کے لیے اپنی عزت اور اپنے بندے کی اہمیت دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔“

نذیر موچی نے متہید باندھی۔

”میں بھی سوچ رہا تھا کہ آج کل شاہ صاحب اتنا کیش منگواتے ہیں —“

حمید سے نے خود ہی بیوقوفوں کی طرح اپنے شک کا جواز بھی تلاش کر لیا۔

”ہاں یار — تو ذرا جلدی کر دے۔ مجھے بس فوراً ہی جانا ہے۔ ابھی شہر بھی

واپس جانا ہے۔ آج کل تو میرا ایک قدم گاڑوں میں اور دوسرا شہر میں ہوتا ہے۔“

نذیر موچی نے تیزی کا مظاہرہ کیا۔

”یار گھنٹہ دو گھنٹے دے دے۔ ابھی میرے پاس اتنا کیش نہیں ہے۔ غفورے کی

دوٹ اپنا آدمی بھیج کر منگوا لوں گا۔“

حمید سے نے کہا۔

”ابھی کتنا بندوبست کر سکتا ہے۔“

نذیر سے نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ایسی تو مشکل ایک لاکھ روپیہ ہوگا۔ وہ بھی انفاق سے کل ایک سو دو ہو گیا تھا

اور شہر والی پارٹی خود آکر مال لے گئی ہے۔“

حمید سے نے وضاحت کی —

”اچھا یار — تو مجھے فوراً ایک لاکھ دے اور جتنی جلدی ممکن ہو۔ باقی ایک لاکھ

لے کر فضل شاہ کی باہر والی جوہلی پر پہنچ جا — خیال رہے کہیں گھر نہ پہنچ جانا۔“

نذیر موچی نے کہا —

”یہ تیری بات ٹھیک ہے۔ اچھا ابھی لایا —“

حمید سے نے گدھوں کی طرح سر ہلایا اور اسے انتظار کرنے کا کہہ کر دوسرے کمرے

میں چلا گیا اس کی دایسی بشکل تین چار منٹ بعد ہی ہو گئی تھی —



”یہ لے یار تو سے ہزار روپیہ ہے۔ گن لے۔“

حمید نے ای۔ رومال میں پھٹے نوٹ، اس کی طرف بڑھتے۔

”یار گننے کا وقت کہاں ہے۔ تو جتنی جلدی ہو سکے باقی رقم لے کر آ جا۔“

یہ کہتے ہوتے نذیر موچی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کینوس کے پھیلے میں وہ نوٹ

پکڑے سمیت اُندیلے۔

”یہ دیکھ ایک اور پارٹی سے پچاس ہزار لے کر آیا ہوں۔ شام تک شاہ کا

کو تین لاکھ پورے کر کے دینے ہیں۔“

اُس نے حمید کے سامنے پھیلے کا مندر کرتے ہوتے کہا۔

حمید نے پھیلے میں موجود نوٹوں پر ایک پچھلتی نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر

دیا۔ اگر اس کے دل میں کہیں کوئی داہمہ بھی تھا تو وہ اب نکل چکا تھا۔

واقعی شاہ صاحب کو اچانک ضرورت آن پڑی تھی۔

”چلا جاتے گا یا کوئی راتقل والا ساتھ کر دوں۔“

”خدا کا نام لے یار۔ میرا اپنا طریقہ ہے کام کرنے کا۔ یہ گوئیوں بندوں

والے کام تھیں اور شاہ صاحب کو ہی زیب دیتے ہیں۔ میں تو سیدھا سادا بندہ

تُو بے فکرہ۔ یہاں کے تو اینٹ پتھر شاہ صاحب کے تابع دار ہیں۔ میری

کسی نے میلی آنکھ سے دیکھ کر مرنا ہے کیا؟

یہ کہتے ہوتے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا بھائی حمید اللہ بیلے۔ رقم ذرا جلدی پہنچا دینا۔“

اُس نے جلتے ہوتے کہا۔

یار تُو بے فکرہ۔ شاہ صاحب کا حکم پورا ہو گا۔“

حمید نے چا پوسی سے کہا۔

کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ چونکہ یہ خاصا مخفیہ معاملہ تھا اس لیے حمید آدم سادھے

بیٹھا رہا نہ ہی کسی نے اُس سے آمد کا مقصد دریافت کیا۔

اس حویلی پر فضل شاہ کے خاص نوکر ہی ہوا کرتے تھے اور انھیں علم تھا کہ یہاں

آنے والی کوئی بھی ہستی معمولی نہیں ہو سکتی۔ انھیں مہمان کی صرف خدمت کرنے

کا حکم تھا۔ اُس سے پوچھ گچھ کی اجازت نہیں تھی۔

حمید کے کورہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اُسے دیر ہو گئی۔ کہیں فضل شاہ غصے ہی نہ

ہو جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے قیامت آجاتی کیونکہ اُس کا اگر کوئی دھندہ چل

رہا تھا تو صرف فضل شاہ کی وجہ سے۔ یہ فضل شاہ ہی تھا جس نے حمید کے جیسے معمولی

سے چور کو علاقے کا بااثر سمگلر اور دردمرغ اراضی کا مالک بنا دیا تھا۔

فضل شاہ کی آمد دو گھنٹے بعد ہوئی۔ حمید کے کو دیکھ کر پہلے تو اُسے غصہ آ گیا پھر

حیرت ہوئی لی کہ یہ یہاں کیوں آ گیا۔

فضل شاہ کا اپنا طریق واردات تھا اور وہ عموماً پس پر دہ رہ کر کام کرنے کا

عادی تھا۔ اس کے تمام جرائم ہمیشہ ساتھی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ فضل شاہ

کسی کا اس طرح منہ اٹھا کر ڈیرے پر چلے آنا ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔

”تم یہاں۔۔۔ تمہیں کس نے کہا تھا آنے کے لیے۔“

فضل شاہ نے اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے کرخت لہجے میں

پوچھا۔

”شاہ جی۔ میری کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم کے بغیر اس گاؤں کی حدود میں بھی

قدم رکھوں۔ میں تو نذیر سے کے . . . .“

”کیا تمنا نذیر سے نے۔۔۔؟“

فضل شاہ کو اچانک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے فوراً ہی حمید کے بات کاٹ دی۔

”شاہ جی اُس نے کہا تھا ایک گھنٹے کے اندر بقایا رقم لے کر آپ کی خدمت میں

پہنچا جاؤں بڑی امیر خسی ہے۔ میں نے تو مال بھی سٹے داموں اٹھا دیا ہے۔“

قریباً دو گھنٹے بعد جب حمید رقم لے کر فضل شاہ کی باہر والی حویلی پر پہنچا تو فضل

حمیدے نے احتجاجی انداز میں کہا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو درست ہے۔ کوئی نشہ تو نہیں لگا تھا۔“

فضل شاہ کو واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

حمیدے نے جواب میں قسمیں کھانی اور کلہ شریف پڑھنا شروع کر دیا اور اُسے ساری واردات بتا دی۔

جوں جوں وہ اپنی بیٹیاں بنا رہا تھا۔ توں توں فضل شاہ کا پارہ چرٹھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تو رنم دے اور چلا جا اور آئندہ جب بھی وہ آتے بٹھا کر بٹے اطلاق کر دینا۔“

فضل شاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

اُسے فوراً سمجھ آگئی کہ نذیر موچی اُس کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔

لیکن —

”اُس کی یہ ہمت —“

فضل شاہ نے دانت پینتے ہوئے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی میں سمجھا نہیں کیا نذیرا۔“

”ہاں۔ اُس حرام زادے نے اپنی اذقات دکھائی ہے۔ حمیدے اپنے بندے

دوڑا دو۔ مجھے آج رات ہمک وہ زندہ یا مُردہ ہر حالت میں چلبیتے۔“

فضل شاہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میرے مولا — یہ کیا غضب ہو گیا۔ شاہ جی اُس کی موت ہی آتی ہوگی جو

نے اُسے گمراہ کیا۔ کہاں جاتے گا بیچ کر۔ میں اُس کے کئی ٹھکانے جانتا ہوں۔“

اُس نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

”حمیدے تم جاؤ اور کل رات جو مال پار جانا ہے وہ بھی روک لو۔“

وہ حرامی کیا کیا جکر چلا گیا ہے۔ اور ہاں اب میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔“

فضل شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

حمید چلا گیا۔

فضل شاہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ کچھ کر گزرے۔ نذیر موچی نے جس کینگی کا مظاہرہ

کیا تھا۔ اس کا تو فضل شاہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو نذیرے کو ایک بزدل اور

دلال قسم کا چمچو سمجھتا تھا۔ نذیر اتنی جرات کرے گا کہ شاہ صاحب کو ہی رگڑا دے

جاتے۔

یہ سوچ کر اُس کا دماغ خراب ہونے لگا تھا۔

شام تک حمیدے کی طرح دو اور بد معاش بھی اس طرح فضل شاہ کے ڈیرے

پر پہنچ چکے تھے۔ نذیر موچی جاتے ہوئے فضل شاہ کے ساتھ تین لاکھ روپے کا ہاتھ

کر گیا تھا۔

فضل شاہ کے لیے پیسوں سے زیادہ اہمیت اپنی ساکھ کی تھی۔ اگر اس کے

کئی کمین ہی اس طرح کی حرکتیں کرنے لگے تو اس کا کیا بنے گا۔ اس نے علاقے کے

چچے پیچے پر اپنے لوگوں کو بھیلایا دیا تھا۔

شام ڈھلنے تک نزدیک دُور کے دیہاتوں میں تقریباً پچاس گھڑ سوار نذیر موچی

کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

لیکن —

اب وہ اُن کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔



ریاست شاہ نے اس کی بات بڑے اطمینان سے سنی تھی —

”فضل شاہ تم نے دیکھ لیا انجام میری نصیحت پر عمل نہ کرنے کا — میں نے

تم سے کہا تھا فضل شاہ کہ ان کئی کمینوں کو زیادہ لفظ نہ دیا کرو — لیکن تم تو زنا کاری

کے چکر میں اندھے ہو رہے ہو۔ تمہیں تو عورت چاہیے — ارے کیا شرم میں سب

لوگ مر گئے ہیں۔ کبھی ہمارے متعلق بھی کوئی بات سنی ہے۔“

اُس نے فضل شاہ کو تنبیہ کی۔

”شاہ جی وہ تو شیک ہے لیکن اس بندے کو بچ کر جانا نہیں چاہیے۔“  
 فضل شاہ کا خون ابھی تک کھول رہا تھا۔

”نہیں بچے گا۔ کہاں جائے گا ہم سے بھاگ کر۔ اور ہاں تھو خان کی اطلاع  
 کیا ہے۔“

ریاست شاہ نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑا۔

”شاہ جی۔ وہ تو آجائے گا لیکن اس کا لڑکا۔ کچھ کرنا ہوگا۔“

فضل شاہ کو بھی اب تشویش ہونے لگی تھی۔

”فضل شاہ حنیف خان اگر ایک مرتبہ پلوان پہنچ گیا تو ہمارے قابو سے باہر ہو جائے

گا۔ تم سمجھتے ہو نا سردار کو۔ وہ بڑا کایاں بدعاش ہے۔ میں جانتا ہوں تھو خان بڑا

با اصول آدمی ہے لیکن اکلوتی ادلاو کے سامنے اس کے اصول کیسے برقرار رہیں گے۔

اگر ہم باپ بیٹے کو الگ الگ بھی کر دیں تب بھی کھائے کا سودا ہے۔ تب بھی سردار

ہی کامیاب رہے نا۔ فضل شاہ کچھ بھی ہو جائے۔ سرداروں کے ہاں زہرہ بائی

کا مجرہ نہیں ہونا چاہیے۔“

یہی ایک صورت ہے حنیف خان کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کی۔ تم ہر ممکن

کوشش کرو۔ ہر ممکن۔ میری بات سمجھ گئے نا۔“

ریاست شاہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں کہا۔

”شاہ جی۔ زہرہ بائی کا مجرہ نہیں ہوگا۔ میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔“

فضل شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”فضل شاہ خیال رکھنا تمہارے پاس صرف کل کا دن ہے۔ پرسوں اُسے وہاں

جانا ہے۔“

ریاست شاہ نے اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

”شاہ جی آپ مطمئن ہو جائیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ چاہے اس کی کچھ بھی قیمت ادا

کرنی پڑے۔“

فضل شاہ اب نذیر موچی کا غصہ بھی عنایت بائی پر اتارنے پر ٹل گیا تھا۔  
 ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ فی الوقت نذیر موچی کو بھول جانا۔ جگ ہنسائی

نے کراڈ اپنی۔ شریک کیا کہیں گے کہ ایک موچی ہمیں دغا دے گیا۔ ہمارے

تین لاکھ ٹھگ کر لے گیا۔ میں دیکھوں گا اُسے۔ کہاں جائے گا وہ۔ یوں بھی

فضل شاہ اس وقت ہمارے لیے الیکشن زیادہ اہم ہے۔ ٹھہرو۔ ایک بات

آئی ہے میرے ذہن میں۔“

اچانک ہی ریاست شاہ کے شیطانی دماغ نے اُسے راستہ دکھایا۔

”حکم شاہ جی۔“

فضل شاہ تودب ہو گیا۔

اور۔

جب ریاست شاہ نے فضل شاہ کو اس ترکیب سے آگاہ کیا جس پر وہ عمل کرنے

جا رہا تھا تو فضل شاہ عیش عیش کر اٹھا۔

اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ریاست شاہ کے شیطانی دماغ کے سامنے سردار نہیں

ٹھک سکے گا اور بالآخر اس کی فتح ہوگی۔

ریاست شاہ نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔

فضل شاہ اب اس ترکیب پر عمل کرنے جا رہا تھا۔



نورپور کے ماچھیوں کو جب فضل شاہ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بے چارے

ڈر گئے۔

”کوئی نیا عذاب نہ آگیا ہو۔“

ڈرتے ماشکی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”دیکھو تو کہیں۔ ہمیں مار تو نہیں ڈالے گا۔“

اُس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا۔

نبردِ احکامِ دین نے جو اس کاؤں کا سب سے بڑا زمیندار اور فضل شاہ کا بار بھی تھا اور جس نے آج تک دباؤ ڈال کر اپنی اپنی لڑکی کے اغوا کا مقدمہ درج کر داتے سے بھی روک رکھا تھا، نے ہی انہیں بلایا تھا کہ شاہ صاحب اُن سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی ڈالمانسکی اپنے ساتھیوں سمیت نبردِ احکامِ دین کی حویلی پہنچ چکا تھا جہاں فضل شاہ اُن کا منتظر تھا۔ اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب فضل شاہ نے سب سے باری باری کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور دُتے ماشکی کو گلے لگا لیا۔

دُتے غلطیاں انسانوں ہی سے ہوا کرتی ہیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ نذیراموچی اتنا گھٹیا اور ذلیل انسان ہو گا کہ ہمارے ہی عللے کی عزت کو نیام کرتا پھرے گا۔ یوں بھی پُرانا خدمت گار ہونے کے ناطے جب اس نے قرآن پر حلف دے کر بڑے شاہ صاحب کو بتایا کہ وہ بے گناہ ہے تو انہوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا اور اپنے نوکر کو پولیس سے بچاتے رکھا لیکن اب شاہ صاحب کو اس کی حباثت کا ایک اور ثبوت ملا ہے تو انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کی مدد کرو اور پتی کو برآمد کرواؤ۔ میں تمہارے ساتھ خود تھانے جاؤں گا اس کے خلاف ریپٹ درج کروانے اور پتی کی بازیابی میں بڑے شاہ صاحب اور میں ہر طرح تمہاری مدد کریں گے۔ ہماری طرف سے جو غلطی نادانوں میں ہو گئی ہے اس پر میں معذرت خواہ ہوں۔“

جیسے جیسے فضل شاہ کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ بے چارے دیہاتوں کے دل گھپلے پھلے جا رہے تھے۔

”شاہ جی خدا کے لیے ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ آپ سید بادشاہ ہیں۔ ہمارے سردار ہیں۔ ہم آپ کے پہلے بھی خدمت گزار تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمیں علم تھا کہ جب آپ کو حقیقت کا علم ہو گا تو آپ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے۔ شاہ جی نذیراموچی

بڑا حرامی آدمی ہے۔ اُس نے آپ کی پوزیشن بہت گندی کی ہوتی تھی۔ ہم تو خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ اُس نے نذیرے کی اہمیت آپ پر ظاہر کر دی۔“

دُتے نے جواب دیا۔  
”دُتے بھاتی تم جانتے ہو کہ شاہ صاحب کبھی چل کر کہیں نہیں گئے، لیکن تمہارے پاس آتے ہیں۔ اب ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ الیکشن میں ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں۔ تم اپنے دو تین بندے ساتھ لو۔ میں بھی تمہارے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔ شاہ صاحب بھی چلیں گے اور نذیرے کے خلاف ہم اغوا کا پرچہ درج کر دیتیں گے کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نوری کو اس نے اغوا کروایا تھا۔“

حکم دین نبردِ احکامِ دین نے بات بڑھائی۔  
تھوڑی دیر بعد ہی نوری پور کے گاؤں کا ایک دُفد تھانے میں فضل شاہ کے ساتھ موجود تھا۔ جسے فضل شاہ پہلے ہی تیار کر کے گیا تھا۔  
تھانیدار نے اُن کا استقبال ایسے کیا جیسے وہ خود مجرم اور آنے والے پولیس کے ملازم تھے۔!

اُس نے فضل شاہ کے حکم پر نذیراموچی کے خلاف اغوا کا پرچہ درج کیا حکم دین نبردِ احکامِ دین نے ماچھی اور اس کی برادری کے چار اور آدمیوں کی گواہی بھی ڈال دی۔  
لیکن —

یہ ساری کارروائی اس نے گورے کاغذ پر کی تھی۔  
بے چارے دیہاتیوں کو اس بات کا کیا علم تھا کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ اُن پر تو شاہ صاحب کی عقیدت کا نشہ سوار تھا اور یہ احساس کہ شاہ صاحب خود چل کر اُن کے گھر تک آتے ہیں ان کی انانیت کو ہوا کے گھوڑے پر اڑاتے چلا جا رہا تھا۔

”تم بے فکر ہو جاؤ دُتے۔ نوری ہماری بھی عزت ہے۔ ہم اُسے برآمد کر دیتیں

گے۔ میں دیکھتا ہوں کہ نذیر موی نے اُسے کہاں چھپا رکھا ہے۔ میں نے تقانیدار سے کہہ دیا ہے کہ فوراً اسے گرفتار کر کے اُس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ ڈالے اور اُس سے زوری کو برآمد کر داتے۔“

فضل شاہ نے دُتے اور اس کے ساتھیوں کو تھانے سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ان سب کو اپنی حویلی میں لے آیا تھا یہاں اُن کے لیے خصوصی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ فضل شاہ نے ان کی ساری برادری کے لیے پلاؤ اور تورے کی دیگیں پکوائی تھیں۔

اور —

بے چارے نامکیوں کے لیے یہ دعوت کسی بھی طرح ”دعوت شیراز سے کم نہیں تھی۔ اگر ان میں سے کسی کے دل میں شاہ صاحبان کے متعلق کچھ گلہ شکوہ بھی تھا تو پلاؤ زردے اور تورے میں بہہ گیا تھا۔

وہ سب ایک مرتبہ پھر شاہ صاحب کے تابعدار اور ان کے ایک اشارے پر جان بچھاؤ کرنے کا عزم لے کر واپس جا رہے تھے۔

○

مقامی ایس ایچ ادا اس وقت ریاست شاہ کے کمرے میں موجود تھا۔  
”حکم شاہ جی۔“

اُسے جیسے ہی ریاست شاہ کی طرف سے بلاوا آیا بھانگتا چلا آیا تھا۔

”کیا حال ہے چوہدری صاحب۔ کام دھندہ تو ٹھیک چل رہا ہے ناں۔“  
ریاست شاہ نے بے تکلفی سے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ جی آپ کے ہوتے ہوئے اس غلام کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھ

سکتا ہے کیا؟“

”کیا بنا متھارے اس ایس پی صاحب کا۔ بڑی بڑھکیں مارتا تھا۔ کہاں کہاں

وہ —

ریاست شاہ نے اپنی مونچھوں کو تازہ دے کر پوچھا۔  
”واہ شاہ جی واہ — مان گئے شاہ جی۔ آپ نے اُسے آنے والی جگہ بھیج دیا ہے۔ اب تین چار سال تو آرام سے گزریں گے۔ اس نے بھی مجھے عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔“

ایس ایچ ادا نے دانت نکالے۔

”چوہدری صاحب جو ہمارے بندے ہو جاتے ہیں اُن کی اور ہماری عزت دوستی دشمنی سنبھلی ہو جاتی ہے۔ اُس نے تمہیں لائن حاضر کیا تھا۔ ہم نے اُسے ضلع بدر کر دیا اور دیکھ لو تم اس تھانے میں چوہدری اہٹ کر رہے ہو۔“

ریاست شاہ نے تکبر سے گردن پھلاتی۔

”شاہ جی۔ نوکر ہیں آپ کے۔ میری توساٹ پشتیں آپ کا احسان نہیں اتار سکتیں۔“

ایس ایچ ادا واقعی اُن کا احسان نہیں اتار سکتا تھا۔

”ایک چھوٹا سا کام تم سے آن پڑا تھا۔“

ریاست شاہ نے اُس کے چہرے پر نظریں جمائیں جہاں شاہ صاحب کے لیے بے پناہ تابعداری کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”حکم شاہ جی حکم — نوکر کیا اور خزرہ کیا شاہ جی۔“

تھانیدار نے اب باقاعدہ ہاتھ باندھے لیے تھے۔

”وہ جس طوائف کا مجرہ ہم نے کر دیا تھا ناں۔“

”جی شاہ جی۔ جانتا ہوں میں اُسے۔ عنایت باقی کی بیٹی۔ میں بہت عرصہ رہا ہوں اُس تھانے میں۔ اُس نے کیا کوئی انکار کیا ہے آپ کی خدمت سے۔“

تھانیدار نے ریاست شاہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”چوہدری صاحب ہمارا اب ایسا گھٹیا شوق بھی نہیں ہے۔“

ریاست شاہ لفٹوں کی طرح ہنس دیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا حضور۔ آپ تو بادشاہ ہیں، مالک ہیں علاقے کے۔ آپ تو...“

”اُس نے کچھ نہیں کیا چوہدری۔ لیکن یہ جو پلوال والے سردار ہیں ناں۔ یہ اُسے ہمارے خلاف ہتھیار بنانا چاہتے ہیں۔ چوہدری اس عورت کو دورانوں کے لیے غائب کرنا ہے۔ الزام تمہارے پاس موجود ہے۔ نذیر موچی نے اُس کے ہاتھ بیچا تھا فوری کو۔ دونوں ماں بیٹی کو گرفتار کر کے لے آؤ۔ پچا پرچہ کرنا۔ دو دن ہم اُن کی ضمانت نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں رہمانڈ دلانا بھی میرا کام ہے۔ ان سے فوری کو برآمد کر دو ہر صورت۔ تاکہ اس کارنامے سے ہم اردگرد کے مزید دیہاتیوں کے دل جیت سکیں اور ننھو خان اور اُس کے بیٹے میں بھی ایک تاقم رہے۔“

ریاست شاہ نے اس کی بات کاٹ کر اُسے ساری رام کہانی سُنادی۔ اور یہ بھی سمجھایا کہ اگر زہرہ باقی کا مجرہ پلوال ہو گیا تو ننھو خان کا بیٹا اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کا مطلب سوائے شکست کے اور کچھ نہیں۔

”اور ہاں۔ اس واقعے میں دُور دُور تک ہمارا وجود دکھائی نہ دے کسی کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ اس کے پس پردہ کون کام کر رہا ہے۔ بس تم کو کہنا کہ نور پور والوں کے دباؤ پر تم نے نذیر موچی کو گرفتار کر کے تفتیش کی ہے۔ اور ہاں نذیر موچی کو بھی اشتہاری قرار دے دو۔ یہ کام بھی میں کروا دوں گا۔ اُس پر کم از کم تین ڈاکے ڈال دو۔ میں چاہتا ہوں اب وہ مفرد کی حیثیت سے ہی مارا جائے۔“

ریاست شاہ نے آخر میں کہا۔

”شاہ جی آپ کے تمام احکامات پر صرف بہ حرف عمل ہوگا۔ آپ نے چوہدری نطفات کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ ہم بھی اپنے محسنوں کے لیے جان دے دیا کرتے ہیں چوہدری صاحب۔ میں سارا کیس خود۔ کروں گا اور کسی کو کانوں کاٹنے

نہ ہوگی۔ شاہ جی ہم نے تو سیکرٹوں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بندے اٹھا کر انہیں پھیلوں کی خوراک بنا دیا۔“

اس بے چاری طوائف کی تو اذقات ہی کیا ہے۔“

ایس ایچ ادچوہدری نطفات نے گردن پھلاتی۔

”دیکھ لینا چوہدری۔ ذرا سنجن کے۔ اُس کے پیچھے سردار آئیں گے۔ بڑا پریشہ آئے گا۔ میں تو ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تم پر کوئی دباؤ نہ آئے۔ لیکن تم بھی بیرون کے پکتے رہنا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔“

ریاست شاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ دباتی۔

”بس شاہ جی آپ مطمئن ہو جائیں۔ اب میرا کام دیکھیں۔ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں شاہ جی آپ حکم دیں تو سرداروں کا ہی کوٹھپ

دوں۔“

ایس ایچ ادچوہدری نے مزید نمبر بنانے چاہے۔

”ابھی نہیں چوہدری۔ وقت آیا تو انہیں بھی دیکھ لیں گے۔“

ریاست شاہ نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

فضل شاہ کو اندر بلا کر اُس نے ننھاندار کے سامنے سارا منصوبہ اسے سمجھا دیا تھا اور فضل شاہ اپنے سوتیلے بھائی کے شیطانی دماغ کو دل ہی دل میں درجنوں مرتبہ داد دے چکا تھا۔

”یہ لو۔“

ریاست شاہ نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر چوہدری کی طرف بڑھائی۔

”شاہ جی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے مجھ پر پہلے ہی کیا کم احسانات

میں۔ شاہ جی یہ ظلم نہ کریں۔“

ننھاندار نے باقاعدہ ہاتھ باندھ دیئے۔

لیکن —

اُس کے بھند ہونے کے باوجود شاہ صاحب نے اُسے محبت سے ڈانڈے  
ہوتے نوٹوں کی گڈی پکڑا ہی دی جو چوہدری زلفات ایس ایچ اے نے بادل  
اپنی پتلون کی بڑی جیب میں ٹھونس لی —

## دو دو ہاتھ

عنایت بائی کے لیے زندگی میں اس سے بڑا بزنس نہ کبھی پہلے ہاتھ آیا تھا  
نہ ہی آئندہ ایسے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے تین چار روز پہلے  
ہی تیاری شروع کر دی تھی اور زہرہ بائی کا روزانہ بیوٹی پارلر کا صبح شام چکر لگ  
رہا تھا۔

زہرہ جانتی تھی کہ حنیف ایک مشہور سنگلر کا بیٹا ہی نہیں خود بھی اس میدان کا وہی  
بے اور اُس کے پاس دو پے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی جس کا ثبوت اس نے ماں  
بیٹی کو پہلی باقاعدہ ملاقات میں دے دیا تھا۔ زہرہ بائی بھی اس مجرے سے بہت اُمیدیں  
وابستہ کیے بیٹھی تھی۔

آج اُن کی تیاری کا آخری دن تھا کیونکہ اگلے روز شام کو انہیں پلوال سے  
سرداروں کی پجاردولینے کے لیے آ رہی تھی۔ عنایت بائی نے بڑا کڑوا گھونٹ بھرتے  
ہوتے آج مجرے کے لیے معمول کے مطابق بیٹھک نہیں سجاتی تھی۔ وہ اپنی بچی کو تھکانا  
نہیں چاہتی تھی حالانکہ مقامی عرس کی وجہ سے مضافاتی علاقوں سے ہزاروں دیہاتی شہر  
پر حملہ آور ہوتے تھے اور اُن کی مختلف ٹولیاں صبح شام بازاروں میں چکر لگاتی تھیں۔  
یہ سیزن کے دن تھے۔ آج کل تو اُن کے ہاں بھی رونقیں لگی تھیں جن کا دار و مدار  
ہی دوسرے قسم کے کاروبار پر تھا جو کم از کم خاندانی کنبڑوں کو زریعہ نہیں دیتا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے جب اچانک ہی عنایت بائی کے کونٹے  
پر قیامت آگئی — ! دھڑ دھڑ کرتے شاہ پور تھانے کے چار سپاہی میٹریاں چڑھ

کر ادھر آگئے ان کے نواقب میں مقامی تھانے کا ایس ایچ ادا درشاہ پور کا ایلنگا  
چوہدری نفاقت ادھر آ رہے تھے۔!

”سس سس سلام سرکار“

عنایت بائی کے تو انہیں دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

”نوری کہاں ہے؟“

چوہدری نفاقت نے اُس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہہ کہ کون سی نوری؟“

”اچھا سالی اب یہ بھی میں بتاؤں۔“

نفاقت چوہدری نے اُسے تین چار گالیاں دے کر پولیس کی مخصوص زبان

میں کہا۔

”دیکھو عنایتی۔ تیری خلاصی تب ہی ہوگی جب تو سچی بات کرے گی۔

معاملہ بہت ادھر تک چلا گیا ہے۔ اور ایس پی صاحب نے حکم دیا ہے کہ کل دن چڑھنے سے پہلے پہلے لڑکی کو اُن کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ میں چوہدری صاحب کے ساتھ صرف اس لیے آیا ہوں کہ اگر تو تعاون پر راضی ہے تو تیری خلاصی کروادوں۔“

مقامی ایس ایچ ادا نے کہا۔

”لیکن مائی باپ مجھے تو اس نام کی کسی لڑکی کا نہیں پتہ۔“

مولا سین کی تم مجھے کچھ نہیں پتہ۔“

عنایتی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ اُس کے اوصاف قدرے بحال ہونے لگتے

”خان صاحب یہ بڑی خزانٹ کجری نظر آتی ہے یوں نہیں کہے گی۔ شاہ

آپ نے اس کے ساتھ میرا تعاون نہیں کروایا۔ خیر میں خود کروا لوں گا۔ جب

وہ آئے گا ناں نذیرا موچی۔ اس کا دلال اس کے سامنے پھر دیکھنا کیسے طوطے

طرح میں ہیں کرے گی۔“

چوہدری نفاقت نے اپنے ساتھی سے کہا۔

عنایت بائی کو بھی سمجھ آگئی تھی کہ نذیرا موچی گرفتار ہوا ہے اور اس نے بیک

دیا ہے کہ نوری کو اُس نے عنایت بائی کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔

لیکن۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ نذیرا موچی گرفتار ہو گیا ہو؟

یہ بھی تو ممکن تھا کہ پولیس نے نذیرے کے ذریعے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا ہو یا

پھر نذیرا موچی اُس سے بدلہ لینے پر تیار کیا ہو۔ اُس نے بھی تو گزشتہ دنوں اُس

کی ضرورت سے زیادہ ہی بے عزتی کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنی

بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اُسے ایک آدھا مالی بھٹکا لگانا ہی مناسب سمجھا ہو۔

دگر نہ ریاست شاہ اور فضل شاہ کے ہوتے ہوتے کس کی مجال تھی کہ نذیرے موچی

پر ہاتھ ڈالتا۔؟

لیکن۔

کیا نذیرے نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بھی تو بے شمار راز عنایتی بائی کے

پاس محفوظ ہیں یہ کوئی پہلا سودا تو نہیں تھا جو اُس نے عنایت بائی سے کیا۔

وہ تو گزشتہ دس سال سے اُس کے ساتھ مل کر یہی کام کر رہا تھا۔

دونوں نے اب تک درجنوں بے گناہ بچیوں اور لڑکیوں کو ملک کے بڑے

بڑے شہروں کے بازارِ حُسن میں سچایا تھا۔

ٹھیک ہے۔ شاید اُس نے پولیس کو ”ٹپ“ دی ہو اور خود سائے نیل آیا

عین ممکن ہے جب دونوں کا آنا سامنا ہو تو نذیرا موچی کو اُس پر الزام لگانے

کی ہمت ہی نہ ہو۔

”مائی باپ آپ بیٹھے تو سہی۔ ادسے مشتاق جا افسروں کے لیے چلتے پانی

کا بندوبست کر۔“

اُس نے معمول کے مطابق اپنے نوکر سے کہا لیکن اس کی اس بات کا ردِ عمل



اتنا سخت تھا جس نے عنایت بائی کے ہاتھ پاؤں پھلادے۔

”تیرے چائے پانی کی ماں...“

چوہدری نطفان نے اُسے موٹی سی گالی دی۔ اتنی زور سے ڈانٹا کہ ساؤنڈا لکڑے میں مسہری کے نیچے دیکھی ہوئی زہرہ بائی کا دل دہل کر رہ گیا۔

”عنایت بائی شاید تو شریف آدمیوں والی زبان نہیں سمجھتی۔ تو ابھی چوہدری نطفان کو نہیں جانتی۔ یہ کسی کی پرداہ کرنے والا افسر نہیں ہے۔ اپنی ہڈی

پسلی بھی تڑلے گی اور اپنی لڑکی کو بھی تھانے کچھری میں ذلیل کر دے گی۔

جُبب چاہب لڑکی چوہدری صاحب کے حوالے کر دے۔ اگر معمول کی بات ہوتی تو میں چوہدری صاحب کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی معاملہ دیا دیتا۔ تو جانتی ہے ہم یاروں کے یار ہیں۔ پر سوں تیرے کوٹھے سے جو لڑکی جان بچا کر کھائی تو

ہم نے اُسے پکڑ کر دوبارہ تیرے پاس نہیں بھیجا؟ ہم احسان فراموش نہیں ہیں عنایت بائی۔ لیکن یہاں معاملہ لوکری کا آن پڑا ہے۔ ایسی پیڑھا ہوتی

آدمی ہے۔ اور تیرے اوپر بڑی مضبوط گواہی بھگتی ہے۔ پولیس کے پاس سارے ثبوت موجود ہیں تیرے اُس یار نے کیا نام ہے اُس کا نذیر موچی نے

پولیس کو ساری کہانی سنا دی ہے۔ وہ اتنا پُرانا بردہ فروش ہے اور پولیس کے درجوتے نہیں کھاسکا تیری تو کوئی ادقات ہی نہیں۔ چوہدری صاحب کو لڑا

غصہ نہ دلا۔“

مقامی ایس ایچ اوانے پھر عنایت بائی کو راہ راست پر لانا چاہا۔ عنایت بائی نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے پولیس کے دباؤ میں آکر نوری کو برآمد کر دیا تو یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا اور پولیس کے منہ ایسا ہونگے گا جس کی چاٹ اسے

بار بار اس کوٹھے پر لایا کرے گی۔ وہ پہلے ہی مقامی تھانے کو منتھلیاں دے دے کر تنگ آچکی تھی۔ آج پہلے

اُس نے یہ دھندہ رازداری سے چلایا تھا۔

پولیس کو صرف اس بات کا علم تھا کہ وہ گانا بجانے کا دھندہ کرتی ہے۔

بھی کبھی جب مال پانی سے ٹوٹ جاتے تو اپنے کوٹھے پر تماشا بینی بھی کروا دیتی ہے۔

اور —

یہ یہاں کا معمول تھا۔

جب سے مقامی بازار پر سختی شروع ہوئی تھی اور حکومت نے چمکے بزدربند

کر دیا تھا۔ تب سے آتے روز پولیس ان کے گھروں پر بھاپے مارتی رہتی تھی اور مقامی تھانے کے ذریعے فضا ایسی دہشت ناک بنا دی جاتی تھی کہ عام

آدمی تو شام کے بعد اس طرف پھٹکنے سے بھی ڈرتا تھا۔ جو کچھ لوگ آتے تھے وہ گانا سننے میں کم اور دوسرے کچھ میں زیادہ دلچسپی

لیا کرتے تھے جس کے بعد سے بڑی بڑی خانگی کچھریاں بھی اپنے ڈیرے کا فریج چلانے کے لیے چھوٹا موٹا دھندہ کرنے لگی تھیں۔

لیکن —

اگر پولیس کو اس بات کی بھٹک بھی لگ جاتی کہ عنایت بائی قبیلہ خانہ بھی چلاتی ہے اور اس کے پاس مختلف علاقوں سے اغوا ہو کر آنے والی بچیاں اور عورتیں

زورخت کی جاتی ہیں تو اُس کی جان عذاب میں آجاتی کیونکہ ایسی کسی خبر کی بھٹک بھی اگر کسی اخبار نویس کو ہو جاتے اور وہ اخبار میں یہ کچھ شائع کر دے تو پولیس

کے اعلیٰ افسران مزید کارروائی سے پہلے فوری طور پر مقامی انچارج اور اُس کے درجن ماتحتوں کا تبادلہ کر دیا کرتے تھے اور کم از کم اس نقصان کا متحمل کوئی تھانیدار

نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس تھانے کو سونے کی کان سمجھا جاتا تھا اور یہاں کی انچارجی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی تھانیدار کو کیا کیا پاڑے بیلنے پڑے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی

چھپی بات نہیں تھی۔ عنایت بائی نے ”دقتی سہولت“ کے لیے ساری زندگی کا عذاب گلے لگانے سے انکار کر دیا تھا اور فی الوقت ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”خان صاحب آپ سے زیادہ ہمیں کون جان سکتا ہے۔ ہم خاندانی راز ہیں۔ ہم تو کبھی ایسے گڈے اور گھٹا دے دھندے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

عنایت بائی نے بظاہر بڑی سکاری دکھائی۔  
”جاؤ پھر ایسی تیزی میں۔“

خان صاحب نے اُسے دو چار موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔  
”ٹھیک ہے چوہدری صاحب جیسے آپ کی مرضی۔“  
انہوں نے چوہدری نظافت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”کہاں ہے تیری وہ پھیک چھلو۔“

چوہدری نظافت نے پولیس والی زبان میں پوچھا۔

”خان صاحب یہ زیادتی ہے۔ ہم آپ کے تابع دار ہیں۔ ساری زندگی آپ کی خدمت کی ہے۔ اس کا یہ صلہ دیا آپ نے۔“

عنایت بائی نے چاہا کہ مقامی تھانیدار کو غیرت دلائے۔

لیکن —

جواب میں اس کو خان صاحب نے ایسی ایسی مغلفانے نوازا کہ الامان الخ

○

زہرہ بائی نے اپنے سر میں بے شمار نیپے پھنسا رکھی تھیں جن کی مدد سے اس کا بال گھنگھریا لے ہو رہے تھے۔ یہ بھی صبح کی تیار یوں کا ایک مرحلہ تھا۔ اُس وقت راکرے میں چار پائی پرٹانگٹیں پسارے بیٹی تھی اور ڈیرے کا ایک نوکر اس کے ہاتھ دبار ہا تھا جب اچانک یہ قیامت ٹوٹی —!

اُس سے پہلے ڈیرے کے نوکر کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”بی بی جی پولس۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تنگے پاؤں ہی باہر کود ڈرا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ سیرٹھیل

کے راستے فرار ہو جائے۔

لیکن —

سیرٹھیاں پھلانگتے حوالدار جنین دین نے اُس کو یوں ہاتھ ملبا کر کے گردن سے

دبچا جیسے بگلا پانینوں پر تیرتی کسی مچھلی کو اپنے پنجوں میں پھنساتا ہے —

زہرہ بائی کو اور تو کچھ نہ سوجھا وہ جھٹ سے اُسی مسہری کے نیچے دب گئی جس

پر تھوڑی دیر پہلے تک وہ مہارانی سندرا بن کر لیٹی اپنی خدمت کر رہی تھی —

چوہدری نظافت کے ساتھیوں نے مکان کے تین چار کمروں میں جھانک کر وہاں

سے ایک نوکر اور دو سہمی ہوتی لڑکیوں کو بھی برآمد کر لیا تھا۔

لیکن —

کسی کی نظر ابھی تک زہرہ بائی پر نہیں پڑی تھی۔

یوں بھی وہ یہاں سے کوئی ہیروئن برآمد کرنے نہیں آتے تھے کہ مکان کے کونوں

کھدوں کی تلاشی لیتے پھرتے۔

ممکن ہے وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل رہتی اور وہ یہی سمجھتے کہ زہرہ بائی کو ٹھے

پر موجود نہیں لیکن جب اُس کی ماں پر منغظات کی بارش ہوئی اور اس نے یہ بھی

محسوس کیا جیسے کسی تھانیدار نے عنایت بائی کی گدی میں ایک آدھ ہکا سا ہاتھ بھی جایا

ہے تو بے چاری سہم کر ہی باہر نکل آتی۔

اسے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں اس کی وجہ سے ہی اس کی ماں کی کھنچتی نہ آ

جائے۔ اس کے برعکس عنایت بائی کی یہ خواہش تھی کہ اگر وہ پولیس کی نظروں میں

نہیں آتی تو چھپی ہی رہے کیونکہ اس کے تھانے چلے جانے کی صورت میں واحد امید

ہی زہرہ بائی تھی جو بھاگ دوڑ کر کے اپنی ماں کی جان بچا لیتی۔

جب اُس نے کمرے سے سہمی ہوتی زہرہ بائی کو برآمد ہوتے دیکھا تو بچانے

کمروں اسے غصہ آ گیا۔ اس نے پولیس کی موجودگی ہی میں اپنی صاحبزادی کو گالیاں

بلنا شروع کر دیں کہ آخر وہ باہر کیوں آگئی ہے۔

زہرہ بن نظافت نے ساری کارروائی پکتے پیروں پر کی تھی —!!

اُس نے سب سے پہلے لڑکی کے اغوا کی ایف آئی آر درج کر کے نذیر موچی کی گرفتاری ڈالی تھی پھر یہ اندراج کیے تھے کہ نذیر موچی لڑکی برآمد کر دانے کے لیے ایف ندر میں عنایت بائی کے ڈیرے پر لایا ہوا تھا کہ راستے میں فرار ہو گیا۔ جس پر اس نے صورت حال سے بے خبر مجسٹریٹ صاحب سے عنایت بائی اور اس کی بیٹی کی باقاعدہ گرفتاری کا وارنٹ حاصل کیا تھا اور مقامی پولیس لائن سے دو لیڈی گائڈس بھی اپنے ساتھ لایا تھا جو نیچے ایک آرام دہ کار میں بیٹھیں چلوڑے کھا رہی تھیں۔ ماں بیٹی کو وہ لوگ خاصا ذلیل کرنے کے بعد نیچے لاتے تھے۔ دونوں کو لیڈی گائڈس کے ساتھ انھوں نے پھیلی سیٹ پر بٹھسا دیا اور خود چوہدری نظافت ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سارا بازار کھڑکیوں میں سمٹ آیا تھا۔!

لوگ حیران تھے کہ پولیس نے عنایت بائی پر کس طرح ہاتھ ڈال دیا جبکہ اپنی بے عزتی کے احساس سے عنایت بائی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ زمین نہیں بھٹتی تھی کہ وہ اُس میں سما جاتی۔

ایسی ذلالت کا تصور تو اُس نے بھلے دنوں میں نہیں کیا تھا اب تو بات ہی ادا تھی۔ اب تو اس کی بیٹی کا شمار خیر سے بازار کی چند گنی چنی طوائفوں میں ہوتا تھا۔

”چوہدری جی۔ ہمیں تو فارغ ہی کر دیں۔ ہم کہاں ان بخلوں کے ساتھ بٹھنا کر بیٹھی رہیں۔“

ایک نمک چڑھی لیڈی گائڈس نے جس کے سانولے رنگ پر پھسلتی سرخوں پر ساری پولیس لائن کے لائن حاضر جوان قربان ہو ہو جایا کرتے تھے چوہدری نظافت سے کہا۔

”میرا تو خیال تھا آپ ہمارے ساتھ ہی چلتیں۔ کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع دے دیا کریں ناں۔“

چوہدری نظافت نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

”ہاتے چوہدری جی۔ قسم سے ضرور جاتی لیکن مجھے آج بہت ضروری کام کرنے ہیں۔“

سانولی سی لیڈی گائڈس نے جس کے ناک کی نتھتی بھی اس کے سانسوں کا صرح پھانکے گی تھی چوہدری نظافت کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی اداکاری کی۔

ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی۔ نوکر کیا اور خنجرہ کیا لیکن اپنا وعدہ ضرور یاد رکھنا۔ شاہ پور کی دعوت نہیں بھلائی۔“

چوہدری نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اُن کے تقاب میں آنے والی پولیس جیب بھی رُک گئی تھی۔

ایس ایچ او چوہدری نظافت نے باہر نکل کر دونوں لیڈی گائڈسوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو بڑے نوٹ نکالے اور ایک ایک کر کے ان کی طرف بڑھا دیتے۔

”ہاتے چوہدری صاحب بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔“

نمک چڑھی نے پیشہ ورانہ نگہ کی طرح نوٹ پر چھپتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں میری جان کبھی شاہ پور آؤ پھر تمھاری ٹھیک ٹھاک خدمت کریں گے۔“

چوہدری نظافت نے اُن کی طرف دیکھ کر بے شرمی سے آنکھ دبائی۔

اُس کے سپاہیوں نے ایک ٹیکسی روک کر دونوں کو اُس میں سوار کر دیا تھا اور اب کار میں دونوں ماں بیٹی کے ساتھ صرف چوہدری نظافت ہی رہ گیا تھا۔!

عنایت بائی اس حادثے سے قدرے سنبھل چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس صورت حال سے اسے چوہدری نظافت ہی نکال سکتا ہے اور یہاں کوئی دھمکی وغیرہ کارگر نہیں ہو گا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ لوگ انھیں اپنے ساتھ ہی کیوں لاتے۔

”چوہدری صاحب ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ آپ کوئی حکم کریں اگر پورا نہ ہو تو آپ کا غصہ بجا ہے۔ کم از کم یہ تو بتا دیں کہ ہم جا کہاں رہے ہیں۔“

عنایت بائی نے اپنے حلق میں تھوک نکلنے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

”چُپ چاپ بیٹھی رہ — تجھے نہیں علم ہم شاہ پور جا رہے ہیں —“  
چوہدری نظافت نے اپنے لیے کی سختی برقرار رکھی۔

”شاہ پور —“

عنایت بائی بڑبڑاتی۔

”ہاں شاہ پور — کیا صدمے سے بہری ہو گئی ہو۔ یا ابھی تک تمہارا فتور نہیں  
ایس ایچ اد نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی عنایت بائی کو اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن دکھائی دی تھی۔  
”فضل شاہ“ — یہی تھا وہ نام جو اُسے کچھ اُمید دلا سکتا تھا۔ جس سے اُسے کب

کی توقع ہو سکتی تھی۔

لیکن —

اُس نے پلوال کے سرداروں کی دعوت قبول کر کے اپنے پاؤں پر خود ہی توکڑا  
چلائی تھی۔ اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ نذیر موچی نے اپنے مالکوں کو اعتماد میں لیے لیز  
حرّت کی ہو؟ اُسے اچانک خیال آیا اور وہ قدرے مایوس ہو گئی۔ پھر بھی اُس  
سوچا۔ آخر تو نوکر نوکر ہی ہوتا ہے ممکن ہے وہ فضل شاہ کی ناراضی دور کرے۔  
آخر یہ زہرہ بائی کس مرض کا دوا ہے —

ایک مرتبہ منت سماجت کر لینے میں کیا ہرج ہے —

”چوہدری صاحب ہم فضل شاہ صاحب کے پرانے خدمت گار ہیں۔ آپ ان  
نو جاننے ہوں گے“

عنایت بائی نے کہا۔

”خبردار جو شاہ صاحب کا نام بھی لیا تو — تم انہیں کیسے جانتی ہو —“  
چوہدری نظافت نے ڈرامہ شروع کیا۔

”جناب آپ ہمارا پیغام تو وہاں تک پہنچادیں“

اس مرتبہ زہرہ بائی نے بہت مت کر کے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — وہاں جا کر دیکھ لیں گے“ —  
چوہدری بھی پوری پوری اداکاری کر رہا تھا۔

○

عنایت بائی یہی سمجھی تھی کہ تھا نیدار شاہ صاحب کا نام سُن کر چالو ہو گیا ہے اور  
اب اُس کا کام بن جائے گا۔

لیکن —

کیا فضل شاہ اُسے اپنے سیاسی دشمنوں کے ہاں رنگ رلیاں منانے کے لیے  
آزاد کردائے گا؟ اُس کے دماغ میں سوال پیدا ہوا اور عنایت بائی گھبرا گئی۔ ذاتی  
اُس نے اس بکجنت چھوٹے تھا نیدار کی بات مان کر اپنے تابوت میں آخری کیل گاڑا  
ہے —

اب اُسے خود پر غصہ آنے لگا تھا —

تھانے میں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر اس نے فضل شاہ اور ریاست کے نام کی دُہائی  
دے دی تھی۔

”دیکھو بائی — تم نے اُن لوگوں کا نام لے دیا ہے جن کے سامنے ہم دم مارنے  
کی مجال نہیں رکھتے — لیکن اس وقت رات کے اس پہر میں کسی کو حویلی پر بھیجنے  
کی گستاخی نہیں کر سکتا — میں سید بادشاہوں کے صدمے تم پر اتنی مہربانی ضرور کر دوں گا  
کہ تمہیں آج رات حالات کے بجائے اپنے کمرے میں رکھتا ہوں — صبح شاہ صاحب  
کو تمہارا پیغام پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد اُن کی مرضی — لیکن یہ بات یں تمہیں بتا  
دوں کہ تم پر بڑا خطرہ ناک کیس بن گیا ہے۔ جس سے تمہاری جان شاہ صاحب بھی بڑا  
زرد لگا رہی چھڑا سکتے ہیں اور تو کوئی مانی کا لال تمہیں رہا نہیں کروا سکتا — تم  
یہاں سے سیدھی جیل جاؤ گی جہاں سے پھر پانچ چار سال تک تمہارے باہر آنے کا  
کوئی امکان نہیں —“

ایس ایچ اد نے اُن پر یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کا بھجہ شاہ صاحب کے نام کی وجہ

سے قدرے شرفیاء نہ ہوا ہے —

”لیکن چوہدری صاحب — ہم بھی عزت دار لوگ ہیں اگر رات ...“  
 ”تمہاری عزت داری تو اب تمہیں نکل جاتی — یہ ہٹے کٹے جوان دیکھو  
 ہونا — انہوں نے شاید کئی سال سے تمہاری بیٹی جیسی عورت نہیں دیکھی —  
 یہ سب مل کر تمہاری عزت کا وہ تیا پانچہ کرتے کہ تم مرتے دم تک یاد رکھتیں —  
 تو تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم نے شاہ صاحب کا نام لے دیا ہے جس کی وجہ سے  
 تمہارا احترام کر رہا ہوں — اب ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالنا — جو میں نے کہ  
 دیا وہی ہوگا — زیادہ ٹرٹری کی تو حالات میں باقی ملزموں کے ساتھ ہی ساری راز  
 کے لیے بند کر دوں گا“ —

چوہدری نظافت نے اس کی بات کاٹتے ہوتے اُسے ڈانٹ پلائی —

وہ بڑی کامیابی سے ریاست شاہ کے سیٹج کردہ ڈرلے کو نبھارہا تھا۔ فضل شاہ  
 نے اُسے بتایا تھا کہ جب عنایت بائی اُن کا نام لے گی تو اُسے کیا کرنا ہے؟ —  
 اُس نے اپنے ایک جوان کو دونوں کو ایک کمرے میں بند کرنے کا حکم دیا اور  
 رپورٹ دینے شاہ صاحب کی حویلی کی طرف چل دیا۔

سپاہی محمد دین جس کی رال شہر سے یہاں تک مسلسل ٹھیکتی آتی تھی دونوں کو  
 ہوا اُس خاص کمرے تک لے آیا جو تھا نیدار چوہدری نظافت نے اس طرح کے  
 کے لیے رکھا ہوا تھا۔

اس کمرے میں ایک مسہری، دو گرگیاں اور چھوٹی سی بیڑ موجود تھی۔ عموماً  
 ملزموں کی نگرانی کی خصوصی خدمات سپاہی موج دین ہی انجام دیا کرتا تھا جو تھا  
 کا خاص چچہ تھا۔ اُسے امید تھی کہ چوہدری صاحب کم از کم عنایت بائی کو ہی اُن  
 لیے چھوڑ دین تو یہی بہت بڑا انعام تھا۔

عنایت بائی اور اُس کی بیٹی کی برہمن کوشش یہی تھی کہ وہ رات یہاں

اور جس طرح بھی ممکن ہے اُن کا کوئی شناسا انہیں راتوں رات یہاں سے لے جائے۔  
 اگر وہ رات تھانے میں رہ گئے تو ساری زندگی کے لیے بازار میں ناک کٹ جائے  
 گی اور اُن کی بنی بنائی عزت اور رعب داب سب خاک میں مل جائے گا کیونکہ  
 بازار والے آج تک اُن سے صرف اس لیے ڈرتے تھے کہ عنایت بائی کے تعلقات  
 بڑے بڑے لوگوں سے ہیں اور پولیس والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے —

وہ لوگ تو ان کا جینا ددبھر کر دیں گے —

”کیا نام ہے تمہارا“ —

کمرے میں پہنچ کر عنایت بائی نے مسکراتے ہوتے سپاہی سے پوچھا۔

”جی۔ محمد دین“

محمد دین نے ہوسناک نظروں سے اُس کے جسمانی اُبھاروں کا جائزہ لیتے

ہوتے کہا۔

عنایت بائی اس کے لیے کم از کم اس حالت میں بھی اپنی بیوی سے کئی گنا زیادہ  
 خوبصورت تھی —

”محمد دین ہم ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھلا پائیں گے — تمہاری مہربانی  
 اگر ہمارا ایک کام کر دو“ —

عنایت بائی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ریشہ خلی اُن کا پیغام شاہ صاحب تک  
 پہنچا دے گا۔

”ہم تمہاری خدمت بھی کریں گے — تمہیں انعام بھی ملے گا“ —

زہرہ بائی نے اپنی ماں کی مدد کے لیے آگے بڑھتے ہوتے کہا۔

”آپ حکم کریں میں حاضر ہوں — انعام کی کیا بات ہے جی“ —

محمد دین بھی ضرورت سے زیادہ تابعداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”برلو — یہ انگوٹھی رکھ لو۔ سونے کی ہے اور فضل شاہ صاحب کو ہمارا

پیغام پہنچا دو“ —

نزدوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جس نے معمولی سے کام کے لیے اتنا زیادہ فریج کر دیا تھا۔

لیکن —  
آج اس کی بیٹی کو اپنی ماں کی نظروں کی بالکل پرداہ نہیں تھی —  
”میں ابھی نکل جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں“ —  
محمدین نے انہیں مطمئن کیا۔

”مولا تمہارا بھلا کرے۔ ہم تمہیں کبھی نہیں بھلا تیں گے۔ وہاں شہر میں  
ہمنا تمہیں اچھی طرح موج میلہ بھی کروادوں گی“ —  
عنایت بائی نے بادل سخاوتہ کہا۔

سپاہی محمدین نے ساری زندگی حرام کمایا اور کھایا تھا لیکن اس طرح اس پر  
کبھی ہن نہیں برسا تھا۔ اُس کے تو خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں بھیل گئے۔  
اُس گرگ جہاندیدہ نے اندازہ کر لیا کہ ضرور اس طوائف زادی کا حنیف خان  
سے کوئی ناجائز تعلق ہے۔ وہ خود نتھو خان کا ہمسایہ اور اس کے ساتھ والے گاؤں  
کارہنے والا تھا اُسے علم تھا کہ نتھو خان کتنا بڑا اسمگلر ہے اور اُس کا بیٹا تو باپ  
سے بھی دو ہاتھ آگے تھا —

آج تک ان لوگوں نے دولت کے بل بوتے پر ہی تو خود کو پولیس سے بچاتے  
رکھا تھا۔ محمدین کو اُمید تھی کہ جب وہ حنیف خاں تک اُس کی محبوبہ کا پیغام پہنچاتے  
گا تو حنیف خاں بھی خوش ہو کر اُسے ضرور کسی بڑے انعام سے نوازے گا۔

اور —

یہ کوئی ایسی معمولی ”ڈیل“ نہیں تھی جو وہ محض چوہدری نظامت کے خوف یا  
جنرہ تابعداری کے سخت چھوڑ دیتا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے  
میں پہنچتے ہی شدید پیٹ درد کا سوانگ رچایا تھا۔  
ایسا درد اُسے کبھی کبھی اٹھا کرتا تھا۔

عنایت بائی نے اپنی پھینکلی انگلی سے ایک ہلکا سا سونے کا رنگ اتار کر  
اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہ نہ ناں جی — خدا کے لیے کوئی اور کام بتائیں میری جان بھی حام  
ہے لیکن اس وقت شاہ صاحب کی جوہلی کی طرف جانے کی ہمت نہیں کر سکتا  
آپ کا پیغام تو شاید وہاں پہنچے نہ پہنچے اُن کے خوشخوار کتے میری تیکا بوٹی کر ڈال  
گے۔ کوئی اور خدمت بتائیں میری جان بھی حاضر ہے“ —  
محمدین نے سہم کر کہا۔

”اچھا تم نے حنیف خان کا نام سنا ہے نا —  
اچانک ہی زہرہ بائی کو نیا خیال سوجھا تھا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ صبح تک  
اُن کا پیغام یہاں سے کوئی بھی شاہ صاحبان تک پہنچانے کی جرات نہیں کرے گا  
”وہ نتھو خان کا لڑکا —“  
محمدین نے سوا المیہ انداز سے پوچھا۔  
”ہاں ہاں وہی — وہی — اسے تم میرا پیغام دو کہ ہم یہاں تھانے میں  
بند ہیں“ —

زہرہ بائی نے بیقراری سے کہا۔  
”لیکن اس کا تو گاؤں یہاں سے چار پانچ میل دور ہے اس وقت گھوڑی  
لے جانا پڑے گی“ —

محمدین اس ہم کے لیے تیار تھا۔  
”گھر آئیں — جتنا فریج آئے گا اُس سے دس گنا زیادہ تمہیں ملے گا۔  
لو یہ بھی رکھ لو۔ اور تمہیں حنیف خان سے بھی انعام دلاؤں گی“ —  
اُس نے بھی اپنا سونے کا رنگ اتار کر محمدین کی طرف بڑھایا۔  
محمدین نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا رنگ بھی قابو کر لیا تو عنایت بائی کو یوں  
جیسے کسی نے اُس کے دل پر زور سے گھونسا مار دیا ہو — اُس نے کھا جانے

انگلے ہی لمحے وہ قتلے کی سرکاری کھڑکی پر ڈاڑھی سے دنا اپنے سے پہاڑ  
حنیف خان کے کماڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ تھانیدار چوہدری نفاذت کا چہیتا ہوا  
کے سبب، اُسے چھٹی لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

○

ریاست شاہ نے اپنے جہانی فضل شاہ کے ساتھ خود آگے بڑھ کر اُس  
استقبالیہ کیا تھا! —

”شاہ جی میں تو سمجھتا تھا کہ بڑی ٹیڑھی عورت ہوگی لیکن وہ تو سالی بھال  
طرح بیٹھ گئی“ —

ایس ایچ ادنیٰ اپنی گردن پھلکا کر نمبر بنانے شروع کیے۔

”چوہدری صاحب اصل امتحان تمھاری ہماری دستی کا اب شروع ہوگا۔  
بڑے حساب سے سارے معاملات، نمٹانے ہیں۔ میری بات سمجھ گئے ناں —  
ہاں علی الصباح ہی اُن دونوں کو ڈیوٹی مجسٹریٹ کی کوٹھی پر لے جانا — میں  
فی الوقت تین دن لے رہا ہوں۔ باندہ دست کر لیا ہے۔ اسی طرح تم پر کتنا ہی دباؤ  
آئے تم تین دن تک تو انھیں اپنے قبضے میں رکھ ہی سکتے ہو — میری بات  
گئے ناں — اور ہاں میں بھی کل اس وقت فضل شاہ کو تھانے میں بھیجوں گا جو  
تم ان کا ریماڈ حاصل کر چکے ہو گے۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے؟ اس کا فیصلہ  
آنے والے حالات کو دیکھ کر کریں گے۔ عین ممکن ہے کوئی نئی چال چلنی پڑے۔  
ابھی تو بہت کچھ ہونا ہے۔ کہیں بھی اپنے منصوبے میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔  
بنیادی بات، یہ ہے کہ تین دن تک دونوں کو رہا نہیں کرنا جس کے لیے قانون  
تمہیں ہم فراہم کر دیں گے اور جب رہا کرنا ہے تو ہماری سفارش سے اور کسی  
نہیں۔ نہ ہی انھیں کسی اور کی سفارش حاصل کرنے کی کوشش کرنے دینا۔  
بات سمجھ گئے ناں“ —

ریاست شاہ نے اسے تفصیل سے اپنے اگلے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے

”شاہ جی تو کہیں آپ کے جیسا آپ چاہیں گے دیا ہوگا۔ یہ تو آپ خواہ مخواہ  
کا تکلف کر رہے ہیں — ریماڈ نہ بھی حاصل کریں تو کوئی مائی کالا انھیں تین روز  
بہنیں لے جاسکتا — میرا نام بھی چوہدری نفاذت ہے۔ چوہدری نفاذت“ —  
ایس ایچ ادنیٰ کی گردن کچھ زیادہ ہی پھولنے لگی تھی۔ وہ نمبر بنانے کے چکر میں کچھ  
زیادہ ہی وفاداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”چوہدری تم جانتے ہو ہم کبھی خواہ مخواہ کا تکلف نہیں کیا کرتے۔ میرا اصول  
ہے چوہدری یا تو میں دشمن کے منہ کے سامنے مکا لہرایا کرتا ہوں یا پھر اسے اتنی  
کاری ضرب لگاتا ہوں کہ وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکے۔ تم پلو ال  
کے سرداروں کو نہیں جانتے۔ انھوں نے گزشتہ تین سال میں بڑا ”ہوم ورک“  
کیا ہے۔ اپنی شہزادی کو کھٹی انھوں نے صرف دی آئی پی کے لیے مخصوص کر  
رکھی ہے۔ انھوں نے تین سال تک انھیں بالاکو اپنا کانا کیا ہے جس کے  
بعد یہ لوگ میدان میں اترے ہیں۔ یہ ساری دودھ صرف تھوڑا خان اور اس کے  
بیٹے کو ٹھکرا دینے کے لیے لگائی جا رہی ہے۔ میری طرف سے عام حالات  
میں دونوں جہنم میں جا تیں۔ عین ممکن ہے کہ الیکشن جیتنے کے بعد ہم ہی دونوں کا  
کٹنا صاف کر دیں لیکن ابھی نہیں۔ فی الوقت باپ بیٹا ایک طوائف کے چکر میں  
آپس میں ٹکرائے تو سرداروں کی فتح ہو جائے گی جو ہماری سیاسی موت ہوگی

چوہدری ہم گزشتہ پچاس سال سے اس علاقے پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ہماری  
بڑیاں یہاں بہت گہری میں کوئی عام قسم کا بدعاش یا شریف زادہ ہم سے  
ٹکرانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ سردار رشید نے بڑی لمبی پلاننگ کر کے  
میدان میں قدم رکھا ہے۔ میں اُسے کبھی ”ایڈوائسڈ“ کرنے کی غلطی نہیں  
کر سکتا۔ تم سمجھ گئے ناں میری بات“ —

ریاست شاہ نے اپنی آنکھیں دُور خلاؤں میں جا رکھی تھیں۔

شاید وہ چشمِ تصور سے آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے شاہ جی — ایک عرض کرنا تھی اگر...“

اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاید کہنے کا حوصلہ نہیں پارہا تھا۔

”ہاں ہاں کہو کیا بات ہے — کچھ پیسوں وغیرہ کی...“

”نہیں پیر بادشاہ — نہیں نہیں — بخدا یہ بات نہیں میں دراصل...“

اس مرتبہ تھانیدار نے تڑپ کر اُس کی بات کا ٹٹی تھی اور ریاست شاہ

گھاگ نظروں نے اس کے اندر کی ہوسناکی کو دیکھ لیا تھا۔

”اوہ یہ بات ہے —“

ریاست شاہ نے قہقہہ بلند کیا تو ایس ایچ او چوہدری نطافت کے

ہوتے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑے شاہ صاحب

کے دل کی بات سمجھ گئے ہیں۔

”چوہدری ہم اپنی برسوں کی دوستی کو دوڑے کی طوائف پر قربان نہیں کیا کرتے

ہم نے تمہاری محنت کا معاوضہ دے دیا ہے۔ اُن سے خود وصول کر لینا۔“

کی رات بچھیں ہماری طرف سے مکمل اجازت ہے۔“

ریاست شاہ نے کہا اور چوہدری نطافت بے قابو اس کے گھٹے چھین

آگے بڑھ گیا۔

”آپ کے بچے جیتیں شاہ جی — بڑے طویل عرصے کے بعد ایسا ہیرا

لگا ہے۔“

اُس نے بے شرموں کی طرح قریباً ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

”اب تم جاؤ۔“

ریاست شاہ نے اُٹھتے ہوئے کہا اور فضل شاہ کو اشارہ کر دیا جس نے

کی ایک اور گڈی زبردستی ایس ایچ او چوہدری نطافت کی جیب میں ٹھونس

○

ا تھا نے پہنچ کر چوہدری نے سب سے پہلے سہا ہی محمد دین کو اپنے

طلب کیا تھا۔

”سرجی وہ ڈاکٹر کی طرف گیا ہے“

منشی محرز نے ایڑیاں بجاتے ہوتے کہا۔

”کیا ہوا؟ کیا دورہ پڑ گیا تھا اُسے؟“

چوہدری کو خوا مخواہ ہی غصہ آ گیا۔

”جناب والا! دہی پُرانا پیٹ درد — آپ حکم کریں سرکار خادم حاضر ہے۔“

جو خدمت بھی ہو۔“

منشی کو اگر اپنے نمبر بنانے کا موقع ملا تھا تو وہ کیوں ضائع کرتا۔ وہ تو پہلے ہی

محمد دین سے بہت غار رکھتا تھا۔

چوہدری نے ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی اور اندازہ لگا لیا کہ بندہ اپنے کام

کا ہے۔

”اوتے کیا بنا ہے اُن عورتوں کا — انہیں کھانا دیا ہے یا نہیں۔“

اُس نے اگلا سوال داغا۔

”جناب والا! کھانا انہوں نے نہیں کھایا۔ کچھ پھل فردٹ کھایا ہے“

منشی نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میں کروانا ہوں انہیں ڈرنے منشی لڑکی کو میرے کوارٹر میں پہنچا دو۔“

اور اُس کی ماں کو اپنی حفاظت میں رکھنا — خبردار تمہارے علاوہ کوئی بھی اُس

کے نزدیک پھٹکا — محمد دین کو بھی گشت ڈیٹن پر بھیج دینا — سمجھ گئے ناں۔“

چوہدری نطافت نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتی۔

منشی کے لیے تو بتی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

”حکم کی تعمیل ہوگی جناب۔“

اس نے ایڑیاں — بجائیں۔

”کوئی گر بڑ نہیں ہونی چاہیے۔ درنہ سالو — سب کی ایسی کچھائی کروں گا کہ



چھڑ کر بیٹھ گئی۔

اچانک ہی اُسے اپنے کمرے کے باہر لگاتار لکھنے کی آواز سنائی دی۔

”یا مولا خیر۔“

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیکن —

اس کی خواہش کے برعکس وہاں ”شراب موجود تھا۔ شراب کے نشے میں ڈھت منشی اندر داخل ہوا۔ اس نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے اور دیسی شراب کے بھیسو کے اُس کے منہ سے اُٹھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟“

اُس نے معمولی سی مزاحمت کی پھر ہتھیار ڈال دینے کیونکہ بصورت دیگر منشی کی طرف سے اُسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھی اور تعاون کی صورت میں اگلے روز رہائی کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔

ساری رات منشی محرز اس کی بوٹیاں نوچتا رہا۔

ایسی صورت حال کا سامنا اس نے اُن کے ایک اور کونے والے کمرے میں اُس کی صاحبزادی کو بھی تھا۔ جس کے مزاحمت کرنے پر چوہدری نے سارے تھانے کو وہاں بلا لینے کی دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ فضل شاہ کی سفارش اسی صورت میں قبول کرے گا اگر زہرہ باقی اس کے ساتھ تعاون کرے۔

زہرہ باقی کے لیے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ کوئی باکرہ نہیں تھی نہ ہی اُس کے لیے یہ کوئی نئی صورتحال تھی۔ اس طرح کی جسمانی رشوت اپنی ماں کے حکم پر وہ درجنوں مرتبہ پہلے بھی اس قماش کے پولیس افسروں کو پیش کر چکی تھی۔ اُن کے پاس اُس سے زیادہ کارگر ہتھیار اور کون سا ہو سکتا تھا؟

اپنی ماں کے برعکس اُس نے چوہدری نفاذت سے اس کی توقعات سے بڑھ کر تعاون کیا اور جلد ہی اُسے چاروں شانے چت کر دیا۔

ساری زندگی پھر لاتن ہی میں گزرے گی“

ایس ایچ اے نے دبی دبی ڈانٹ پلا دی۔

”جناب آپ کو شکایت کا موقعہ ہی نہیں ملے گا۔“

منشی نے غلاموں کی طرح گردن جھکائی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ضروری اندراج کے بہانے زہرہ باقی کو اس کی ماں اور اُنکے باہر لے آیا۔ عنایت باقی نے جب سے اُن کے سامنے فضل شاہ کا نام لیا تھا اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ لوگ بہت ڈر گئے ہیں۔ بے چارے نے قانون کے ہاتھوں مجبور تھے ورنہ انہیں بڑی عزت سے گھر پہنچا کر آئے۔ انہوں نے ماں بیٹی کو اتنا ہی احترام دیا تھا جتنا وہ اپنے گھر آنے والے گاہکوں کو دیا کرتی تھیں۔

جب منشی زہرہ باقی کو لے جانے لگا تو اُس نے یہی سوچا تھا کہ معمول کی طرح پڑھت ہوگی۔ یوں بھی اس کی بیٹی کوئی ایسی چوچی نہیں تھی کہ مشرف بیچوں کی طرح اُن کے قابو آجاتی۔ اس نے تو بڑی ہوشیار ہی سے حنیف خان کو بھی پناہ بھیج دیا تھا۔

لیکن —

اس کے اندازوں کے برعکس جب پانچ کے بجائے پندرہ بیس منٹ گئے تو اسے دھڑکا سا لگ گیا۔ پھر آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن زہرہ باقی نہ آئی اور تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کے خدشات بجا ہیں۔ اُس نے شروع ہی سے تنہا نینداری آنکھوں میں ہوسنا کیاں تیرتے دیکھ لی تھیں وہ بچانے کب سے اُن کی بیٹی پر نظریں جماتے بیٹھا تھا۔

”کہیں بچی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔“ یہ لوگ تو بڑے وحشی اور درندہ ہوتے ہیں“

اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور سہم کر خود کو حالات کے دھارے

محمد دین بھی بید تھا کہ وہ صرف حنیف خان سے ہی بات کرے گا۔  
بالآخر انھیں محمد دین کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور انھوں نے  
حنیف خان کو نیند سے بیدار کر کے یہ پیغام پہنچایا۔ پہلے تو حنیف خان نے نیند  
سے اٹھانے والے کو بے شمار مغلظات سے نواز دیا کہ ایسی کیا قیامت آگئی تھی  
انہوں نے اُسے جگانا ہی مناسب سمجھا پھر بڑے غصے میں حویلی کے اس حصے  
میں آیا تھا کہ محمد دین کا استقبال دو چار ہتھیروں سے کرے۔

لیکن

مبادا وہ کوئی بہت امیر جنسی کی خبر نہ لایا ہو۔ یہی سوچ کر اُس نے باقی  
نوکروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور اُس سے پیغام وصول کر لیا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

حنیف خان نے جب محمد دین کے مُنہ سے غنایت باقی اور زہرہ باقی کا نام  
سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اُس نے لگے روز کے لیے بڑے بڑے پروگرام بنائے تھے جن میں ایک  
رات کے لیے زہرہ باقی کا مجرہ اپنے گاؤں میں کروانا بھی شامل تھا۔

لیکن

یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے شکر یہ تم جاؤ۔ اگر رات رہنا ہے تو یہیں قیام کرو۔ میں  
بندوبست کروا دیتا ہوں۔“

اُس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ محمد دین کی خدمت کر دے۔ جس  
نے محمد دین کی حیب گرم کر دی۔ حنیف خان کے اشارے پر اسے ضرورت سے  
زیادہ ہی خوش کر دیا گیا تھا۔ محمد دین نے اب یہاں مزید ایک پل رُکنا بھی  
گوارا نہیں کیا تھا اور گھڑی کو بھگانا ہوا تھا نہ تک لے آیا تھا۔

رات کا باقی پہر کروٹوں کی نذر ہو گیا۔

صبح تک دونوں ماں بیٹی پھر اکٹھے بند تھے۔ !  
انہوں نے نٹھانیدار کے ذاتی ہاتھ روم میں غسل کیا اور پُر تکلف ناشتہ کیا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد میں اس ایجنے اچھو پوری نظافت انہیں رہائی دلانے کیلئے  
معمولی سی قانونی کارروائی کے بہانے ڈیوٹی میجر ٹریٹ کے گھر کی طرف لے جا رہا تھا۔  
آج چھٹی کی وجہ سے میجر ٹریٹ صاحب گھر پر موجود تھے۔ سید ریاست شاہ کا  
خاص سرکاری دیکل پہلے ہی سے اُن کی خدمت میں موجود تھا۔ عورتوں کو یہاں لانا  
تو محض تکلف ہی تھا۔

اُن لوگوں نے ریمانڈ کے کاغذات اُن کی آمد سے پہلے ہی مکمل کر لیے تھے۔

○

رات ایک پہر ڈھل گئی تھی جب انعام کے لالچ میں سپاہی محمد دین نے  
حنیف خان کو گہری نیند سے بیدار کیا۔

اتنی رات گئے حنیف خان تک پہنچنے کے لیے کئی انکوائریوں سے گزرنا پڑا۔  
اُس کے ڈیرے پر موجود لوگ شاید اُس کی ہڈی پسلی ہی توڑ دیتے وہ نراس کی  
خوش قسمتی تھی کہ وہاں موجود ایک بد معاش نے اُس کی شناخت کر لی کہ یہ ساتھ  
والے گاؤں کا رہنے والا سپاہی محمد دین ہے۔

اُن لوگوں نے تو اُسے کافی دیر تک اس سلسلے میں بٹھاتے رکھا کہ وہ آخر  
حنیف خان کے لیے کیا پیغام لایا ہے کیونکہ اتنی رات گئے اُسے بیدار کرنا بھی وہ  
مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بات کا اندازہ تو انہیں تھا کہ محمد دین کم از کم اُس  
گرفتار کرنے نہیں آیا نہ ہی کسی غلط ارادے سے آیا ہے ورنہ وہ سامنے کی بائی  
میں اکیلا ہاتھ نہ دیتا اپنے ساتھ مکمل گارڈ لے کر آتا۔ بس اُن کی یہ خواہش تھی کہ  
اپنے مالک کو نیند سے بیدار کر کے تنگ نہ کریں۔ اگر کوئی معمولی بات ہے تو  
یہیں نہ لائیں۔

لیکن

حنیف خان کو ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ اُسے رہ رہ کر خیال آ رہا ہے کہ زہرہ بائی اُس کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اس نے آخر حنیف خان کو پیغام بھیجا ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ان حالات میں سب سے زیادہ اعتماد اس پر کرتی ہے۔ حالانکہ تنخواہ خان نے اُسے اپنے ساتھ شاہ پور جانے کے لیے کہا تھا کیونکہ شاہ بہر کا پیغام آیا تھا۔

لیکن —

حنیف خان نے محض زہرہ بائی کے مجرے کے لیے اس پیغام کی پروا نہیں کی تھی اور اپنے باپ سے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ جھوٹ بول دیا تھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اب اُسے واقعی اپنے باپ کے پیچھے جانا تھا۔ اس وقت وہ شدت سے نذیرے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اگر نذیرا مل جاتے تو سارا مسئلہ منٹوں میں حل ہو جاتے گا۔

لیکن —

نذیرا ہی کیوں؟

اُس نے سوچا۔ آخر وہ کیوں نہ فضل شاہ سے براہ راست بات کرے۔ زہرہ بائی کو رہا ہونا چاہیے تھا اُس نے زہرہ بائی اور اُس کی ماں کے سامنے اپنی نمود و نمائش کا بڑا زبردست بندوبست کر رکھا تھا۔ چار راتوں کا سفر اور جیب تیار رکھی تھی کہ خوب بن سوار کر اور ٹھٹھا باٹھ سے وہاں جلتے گا۔

ان حالات میں اگر کوئی اُس کے کام آسکتا تھا تو وہ ریاست شاہ اور فضل شاہ نے حنیف خان کو سیدوں کی طاقت کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا اُن کا حکم پہنچنے پر تھکانے دار خود دونوں ماں بیٹی کے ساتھ معافی مانگنے چلا آئے گا۔ اس طرح اسے زہرہ بائی اور اس کی ماں کے سامنے شیخی بگھارنے کا بھی موقع مل سکتا ہے۔

علی الصبح وہ اکیلا ہی شاہ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ریاست شاہ کے نوکروں نے اُسے اُس کا استقبال خاص ہمان کی طرح کیا تھا اور

ایک خاص آدمی فضل شاہ کو حنیف خان کی آمد کی اطلاع دینے چلا گیا تھا جو ابھی اسی ناشتہ کر کے فارغ ہوا تھا۔

ایک پراسرار سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھلتی چلی گئی اور وہ بھاگا بھاگا ریاست شاہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

”تو تیرا نشانے پر خود بخود ہی جا لگا۔ میں تو منصوبہ بنا رہا تھا کہ کس طرح زہرہ بائی کی طرف سے حنیف خان کو پیغام بھیجا جائے اور وہ ہمیں زہرہ بائی کی سفارش کے لیے درخواست کرے۔ اس کے بعد ہی ہم اُسے قابو کر سکیں گے۔ چلو اچھا ہوا یہ مسئلہ تو حل ہوا فی الحال تو آدھا گھنٹہ اُسے انتظار کروا دیا تاکہ چوہدری ضابطے کی کارروائی مکمل کر لے۔ اس کے بعد مجھ سے ملاقات میں مزید آدھا گھنٹہ لگا دو۔ اُس کی آتش شوق کو بھڑکاتے جاؤ فضل شاہ۔ لیکن خیال رکھنا ایک نذیرے مچھی نے اتنا نقصان کر دیا ہے کہ اب ہم کسی اور نذیرے کے متعلق نہیں ہو سکتے۔“

ریاست شاہ نے حقے کا کیش لگاتے ہوئے دُھواں فضا میں بکھیرا۔

”ٹھیک ہے شاہ جی — ایسے ہی ہو گا“

یہ کہہ کر فضل شاہ باہر آ گیا۔

اُس نے اپنے خاص آدمی کو جو یہ پیغام لایا تھا مزید ہدایات کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ جس نے باہر جاتے ہی حنیف خان کو خبر دے دی۔

”میں نے جویلی میں پیغام بھیج دیا ہے تھوڑی دیر میں شاہ صاحب اُٹھ جائیں گے اُن کا حکم ہے کہ اگر اُن کے سوتے میں بھی آپ آئیں تو انہیں اُٹھا دیا جائے دراصل رات شاہ جی بہت دیر تک میٹنگیں کرتے رہے ہیں ناں۔ بہر حال آپ ناشتہ کیجئے۔“

اُس نے حنیف خان کا جواب سننے بغیر اپنے ایک ساتھی کو آنکھ مارتے ہوئے حنیف خان کے لیے ناشتہ لانے کا حکم دیا تھا

تھوڑی دیر بعد حنیف خاں کے سامنے دودھ، دہی، انڈے مکھن اور پراٹھے موجود تھے اور دو ملازم ہمدرد اُس کی خدمت پر مامور ہو گئے۔

لیکن —

اُسے ان سب چیزوں کی ضرورت کہاں تھی؟ پھر بھی اس نے اپنی مردانگی برقرار رکھنے کے لیے کچھ زہر مار کر لیا۔ جس کے بعد نوکر برتن اُٹھا کر لے گئے اور اسے دھو کر جگ اُس کے سامنے آگیا تھا۔

انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اُلٹے سیدھے کاموں میں آدھا گھنٹہ ضائع کر دیا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد فضل شاہ اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

”اوہ میرا بھائی آیا — میرا دیر آیا۔ میرا حنیف خان آیا“ اُس نے حنیف خان کی شکل پر نظر پڑتے ہی مٹکاری سے باہنیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

بیٹھک میں موجود باقی لوگ فضل شاہ کے احترام میں خاموش ہو گئے تھے جو حنیف خان نے مسلسل اُس کی ادھر گھبراہ کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔

”چاچا تو شاید فور پور کی طرف گیا ہے۔ وہاں آج بڑے شاہ صاحب کا جلسہ ہے نا۔“

اُس نے حنیف خان سے کہا۔

”شاہ جی ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔“

حنیف خان نے فوراً ہی کہہ دیا۔

”ادہ بیس صدتے جاؤں۔ تمہارا کام ہمارا کام ہے حنیف خان۔ حکم کرو سائیں کم کرو۔“

فضل شاہ نے پھر ادنیٰ آواز میں جوش و خروش کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

”شاہ جی پرا تویٹ بات ہے“

حنیف خان نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ادے تم لوگ جاؤ ادے۔“

فضل شاہ نے اپنے خاص آدمی کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

”شاہ جی — آج صاحب کا دورہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد انہوں نے آنا ہے۔ بات سے منشی آیا بیٹھا ہے اُسے حکم دیں تو واپس جائے۔ وہاں سب لوگ بہت پریشان ہیں“

اُس کے خاص آدمی نے کہا۔

”اونے بلا دیا اُسے بھی اس وقت آنا تھا۔ میرا بھائی آیا ہوا ہے اور تم لوگوں کو اپنے کاموں کی پڑی ہے۔ ایک منٹ یا حنیف خان۔ ادھر اسے سی نے آنا ہے۔ اگر اجازت دو تو منشی کو فارغ کر دوں۔“

اُس نے حنیف خان کی طرف مسکراتے ہوئے اجازت لی۔

”ادہ شاعہ جی کوئی بات نہیں۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔“

حنیف خان نے بادل نحواستہ اجازت دے دی۔

اور —

شاہ صاحب کے منشی نے ادھر ادھر کی باتوں میں مزید آدھا گھنٹہ ضائع کر دیا۔ اس درمیان حنیف خان بیٹھاری سے پہلو بدلتا رہا۔ فضل شاہ کی زمانہ شناس آنکھیں اُس کے ایک ایک پل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”اب دفع ہو جاؤ اور کسی کو اندر نہ آنے دینا۔“

اُس نے اپنے منشی سے بالآخر کہا اور سب لوگ باہر چلے گئے۔ فضل شاہ نے انراہہ کر لیا تھا کہ اب تک چوہدری نظامت دونوں کا ریمانڈ لے کر واپس آچکا ہوگا۔

”کیا کہہ رہے ہو یار۔ تمہیں کس نے اطلاع دی۔“

فضل شاہ نے حنیف خان کی بات پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی بالکل صحیح ہے۔ تمہانے کے ایک سپاہی نے مجھے پیغام پہنچایا ہے۔“

حنیف نے کہا۔

حنیف خاں یار اللہ خیر کرے نذیرا بھی کل سے غائب ہے۔ اب تم نے یہ خبر سنا

دی — کہیں کوئی بڑا افسر تو نہیں پڑ گیا اور پر سے — اس تھا نیدار کی کیا مجال ہے کہ ہمارے علم میں لاتے بغیر ہمارے کسی آدمی کو گرفتار کر لے — اگر ایسا ہوا بھی ہے تو عنایت بانی کو ہماری طرف پیغام بھیجنا چاہیے تھا۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔“  
یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے منشی کو آواز دی جو دوسرے ہی لمحے اس کے سامنے موجود تھا —

” فوراً تھانے جاؤ اور ابھی چھوٹے تھانیدار امیر علی کو بلا لاؤ۔ پہلے دیکھیں تو کسی معاملہ کیا ہے۔ کمال ہے ہمارے علاقے میں اتنا اہم واقعہ ہوا اور ہمیں خبر نہ ملے۔ اور اُدھر تدریس کو بھی دیکھتے جانا — وہ بھی کل سے نہیں آیا —“

اس نے منشی کی طرف دیکھ کر آسمکھ دیا۔

منشی اس کا اشارہ سمجھ کر سر ہلاتا چلا گیا۔

اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹہ بعد ہوئی تھی —

” اتنی دیر تک کہاں مر گئے تھے۔“

فضل شاہ نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس پر چڑھائی کر دی۔

” شاہ جی میری عرض سن لیں بادشاہ ہو — تھانے میں کوئی افسر نہیں تھا چھوٹا تھا نیدار

نور پور گیا ہوا ہے۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا — اب وہ آیا ہے تو آپ کا حکم پہنچا آیا

ہوں۔ وہ بے چارہ میرے ساتھ ہی آ رہا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کا فون آ گیا۔ مجھے

تو کوئی گڑ بڑ نظر آتی ہے۔ سن ہے شہر سے دو عورتوں کو گرفتار کر کے لاتے ہیں۔“

منشی نے ہر شکاری سے بات بڑھائی۔

” کہیں نور پور دالا کیس تو نہیں کھل گیا — مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ سردار کوئی

بد معاشی مزدور کریں گے۔ انھوں نے ہی شاید — خیر کچھ بھی ہوا امیر علی کہاں ہے؟“

فضل شاہ نے بات بدل کر پوچھا۔

” آ رہا ہے سرکار۔ چند منٹ میں پہنچ جاتے گا۔“

منشی نے کہا —

چند منٹ کے بجائے قریباً ایک گھنٹے بعد امیر علی آیا تھا۔ جس نے آتے ہی میری کی معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔

” سید بادشاہ ہم پر تو عذاب نازل ہو چکا ہے۔ ایس پی نے کل سارا دن

تھانے میں گزارا اور اپنے سامنے بٹھا کر کارروائی مکمل کی ہے۔ وہ نور پور سے

جوڑ لکی اغوا ہوئی تھی ناں — وہی ماچھن — اُس کے لواحقین نے بڑا طوفان

اٹھایا۔ خدا جانے یہ لوگ شہر میں کس طرح پہنچ گئے اور انھوں نے گورنر صاحب کے

سامنے مظاہرہ کیا — جنھوں نے ایس پی صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی اور حکم دیا

کہ خود سارے آپریشن کی نگرانی کریں — ایس پی نے اپنی خصوصی گاڑی بھیج کر نڈیر پور

کو گرفتار کیا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ خدا جانتے اُسے کہاں لے گئے

ہیں۔ جس کے بعد چوہدری صاحب کو حکم ملا کہ شہر سے عنایت بانی کو گرفتار کر لاتے

جس پر لڑکی فروخت کرنے کا شک کیا جا رہا ہے — مائی باپ ہم تو بہت شرمندہ

ہیں۔ چوہدری صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کو خود اطلاع پہنچاؤں لیکن ایس پی

تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اب وہ گیا ہے تو میں آیا ہوں۔“

منشی نے امیر علی کو پڑھا دیا تھا کہ اُس نے کیا کہانی سنانی ہے۔

” ہوں — تو یہ بات ہے۔ اب میں سمجھا۔ میں بھی حیران تھا کہ کیا بلا آں

پڑی ہے۔ خیر — دیکھ لوں گا ایس پی کو بھی۔ بڑا ایماندار بنتا ہے سالہ — تم

پر تباہ کر وہ دونوں عورتیں کہاں ہیں۔“

فضل شاہ نے پوچھا۔

” سرکار — اُن کا تو تین دن کا ریمانڈ ہو گیا۔ اُن کے ڈیرے سے دو اغوا شدہ

لڑکیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ایس پی صاحب تو کم از کم دس دن کے ریمانڈ کا کہہ رہے

تھے لیکن انھوں نے رات آپ کا نام لے دیا — ہم نے آپ کو جگانا مناسب نہیں

سمجھا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں مائی باپ — مجھ پر بڑے چوہدری صاحب کے

ملنے والے ہیں۔ انھوں نے کارروائی ڈالنے کے لیے تین دن کا ریمانڈ ہی لیا

ہے۔ ایس پی نے بے چارے ایس ایچ اوصاحب کو بہت ذلیل کیا لیکن کیا کر  
جناب عورتیں آپ کا حوالہ دے رہی تھیں جس کے بعد اُن پر ہاتھ اٹھانا ہمارے  
تو حرام ہو گیا ناں ماتی باپ —  
امیر علی نے چالپوسی سے کہا۔

”امیر علی اُن عورتوں کو کسی کو انگلی نہ لگانے دینا اور جیسے ہی ایس ایچ ادا  
اُسے میری طرف بھیجو — میری بات سمجھ گئے ناں —“  
اُس نے امیر علی کی طرف منہ کر کے آنکھ دیا۔

”جو حکم ماتی باپ - جیسے ہی چوہدری صاحب آتے ہیں - میں آپ کی خدمت  
میں انہیں روانہ کرتا ہوں —“  
اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔

دوپہر کے بعد پھر ایس ایچ اوصاحب کی باری آئی جو قریباً بھاگتے ہوئے  
شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ بے چارے کا تیز تیز چلنے سے  
سانس پھول رہا تھا۔ اُس نے قریباً فرشی انداز سے فضل شاہ کو سلام کہا تھا۔  
”واہ چوہدری صاحب کمال کے آدمی ہیں آپ بھی — ہمارے بندے کا  
گرفتار کر لے —“  
فضل شاہ نے مٹھتے ہی کہا۔

”سید بادشاہ مجھ گئے کی یہ مجال کہاں - آپ کو کیا بتائیں عالی جاہ کہ ہمارا کیا  
حشر ہو رہا ہے۔ اُن فورپور کے باجیوں نے تو ہمیں ناکوں چنے چبا دیئے ہیں۔ حضور  
ہمیں توکل سے ایس پی صاحب نے سانس نہیں لینے دیا۔ ساری رات تو وہ قلعہ  
میں رہے۔ سارا آپریشن انہوں نے اپنی نگرانی میں کر دیا — ہم تو مفت میں لے  
گئے شاہ جی - جیسے ہی مجھے علم ہوا کہ وہ عورتیں آپ کا نام لے رہی ہیں میری  
سرکار جان ہی نکل گئی۔ ماتی باپ اپنی جان پر کھیل کر تین دن کا ریمانڈ کر دیا۔

اور ایس پی کو یہ کہہ کر تسلی دی ہے کہ میں خود ان کی تفتیش کر رہا ہوں — مجھے تو یہ  
بھی علم نہیں کہ نذیرا کہاں ہے؟ خدا جانے کہیں اُسے سٹاٹ والوں کے حوالے  
کر دیا ہو — یہ ایس پی بڑا خزانٹ ہے مالکو! کیا مجال جو وہ فون کے سامنے  
سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹتا ہو — سارا تھانہ اس نے کل سے ”سٹیٹڈ“ کر  
رکھا تھا۔ مجھے تو بازارِ حُسن روانہ کر دیا۔ کچھ گارڈ میرے ساتھ کر دی۔ باقی گارڈ کو  
امیر علی کے ساتھ تھانے میں ہمہ وقت موجود رہنے کا حکم دے دیا — سرکار ان سے  
تویوں لگتا ہے کسی نے بڑی اچھی طرح پڑھا کر بھیجا تھا — کیا مجال جو اس نے آپ  
سے رابطہ کرنے کی مہلت بھی دی ہو — اب بھی بار بار فون کر کے کیس کی پراگریس  
دریافت کر رہا ہے — اصل میں معاملہ زیادہ خراب اس لیے ہوا ہے کہ اُن کے  
ڈیرے سے دواغشاہدہ لڑکیاں برآمد ہوتی ہیں۔“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ایس ایچ ادا چوہدری نظامت نے داد طلب نظروں  
سے فضل شاہ کی طرف دیکھا۔ جس نے گردن کے ہلکے سے اشارے سے اُسے شاباش  
دی —

”بڑا خطرناک آدمی ہے۔ ضمانت کی ذرا گنجائش نہیں چھوڑی —“

فضل شاہ نے نشتر تیناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ سے بہتر کون جانتا ہے ماتی باپ —“

چوہدری نے انکساری سے کہا۔

”دیکھو چوہدری کچھ بھی ہو — اب دونوں عورتیں ایک پل کے لیے تھانے میں  
نہیں رہیں گی۔ اُن کی گنتی دہیں ڈالے رکھو — انہیں ہمارے پاس رہنے دو — اگر  
ایس پی اچانک ریڈ کرے تو عورتوں کو یہاں سے لے جا کر پیش کر دینا — اور  
ہاں جو لڑکیاں برآمد ہوتی ہیں اُن کی طرف سے بیان لکھ لو کہ انہیں کسی نے اغوا  
نہیں کیا اور وہ اپنی مرضی سے عنایت باقی کے پاس رہ رہی تھیں — تاکہ میں تین  
روز بعد باقی کو ورٹ سے اُن کی ضمانت کر داسکوں — عورتوں کو جیل میں جانا چاہیے

کسی بھی قیمت پر—خواہ تمھاری نوکری ہی کیوں نہ داد پر لگ جائے۔  
 نہیں ایسی کئی نوکریاں دلا دیں گے۔“  
 فضل شاہ نے بظاہر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
 ”جو حکم شاہ جی—آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ میں خود انھیں لے کر حاضر ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے تو معاف کر دینا سید بادشاہ—فدا حکمت سے کام لے پڑے گا۔ مجھے اپنی نوکری کی نہیں سرکار آپ کی عزت کی زیادہ فکر ہے۔“  
 چوہدری نے ڈرامے کا کلائمکس کرتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اپنا انعام لے جانا۔“  
 فضل شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

”آپ کا دیا ہی کھاتے ہیں مائی باپ۔ آپ کے نوکر ہیں مائی باپ۔“  
 اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر فضل شاہ اور حنیف خان کو سلام کیا جسے اب سمجھ آ رہی تھی کہ جتنا خطرناک یہ معاملہ تھا۔ سرداروں کا تو باپ بھی انھیں رہا نہیں کر داسکتا تھا۔ یہ تو فضل شاہ ہی تھا جس نے انھیں تھانے سے باہر نکلوا لیا تھا۔ اُسے امید ہو چکی تھی کہ جس طرح فضل شاہ کا رعب داب تھانیداروں پر ہے وہ اس کے حکم پر کھٹ پتلیوں کی طرح عمل کرتے ہیں اُس کے بعد سے تو دونوں کی دال میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

فضل شاہ تو اس کی توقع سے بڑھ کر اتر در سوخ کا مالک نکلا تھا۔ یہ واقعی اس کام تھا کہ وہ حنیف خاں کی خواہش پوری کر رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید حنیف خاں ساری زندگی زہرہ بانی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔



تھانے پہنچ کر اس نے دونوں ماں بیٹی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ جنھوں نے حالات کے آگے مکمل ہتھیار ڈال کر خود کو تقدیر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا تھا۔

میں نے تمھارا بیٹا شاہ صاحب تک بیچا دیا ہے۔ جن کے حکم پر تمھیں ان کی حویلی لے جا رہا ہوں۔ تمھارے متعلق بڑے سخت احکامات ہیں۔ فی الحال تمھارا تین دن کا تفتیشی ریمانڈ ہے۔ شاہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ میں تمھاری گنتی تھانے میں ڈالوں لیکن تم ان کی حویلی میں رہو۔ کیونکہ فوراً تمھاری ضمانت نہیں ہو سکتی۔ تین روز بعد ہی کچھ کریں گے تمھارے لیے۔ ایک بات کا خیال رکھنا اگر رات والے واقعات کا اشارہ بھی کبھی ذکر کیا تو ساری زندگی کے لیے جیل میں سڑتی رہو گی۔ خبردار۔ انھیں یہ بھی بتانا کہ ان کا نام لینے کے بعد ہم نے تمھیں کچھ نہیں کہا۔ میری بات سمجھ گئی۔“  
 ناں۔

اس نے ماں بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”مولا تمھیں خوش رکھے چوہدری صاحب۔ آپ نے کیا کیا ہے۔ یہ تو ہمارا فرض تھا۔ کبھی ڈیرے پر آئیں تو آپ کی جی بھر کر خدمت کریں گے۔ میں تو آپ کا منہ موٹوں سے بھر دوں گی چوہدری صاحب۔ بس خدا کے لیے کسی طرح ہماری جان اس کیس سے چھڑا دیں۔“

”اُس موٹے نذیرے پر ہی سارا ختاب ڈال دیں۔“  
 غمایت بانی نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

واقعی اُسے رات کے سلوک پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ پولیس سے وہ ایک طاقت ہونے کے ناطے اس سے زیادہ اچھے سلوک کی توقع بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ تو چوہدری صاحب کی مہربانی تھی کہ انھوں نے خود ہی موج مبلہ کیا۔ اگر کوئی اور تھانہ ہوتا تو شاید وہ صبح ہونے تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ رہ جاتیں! اور اب فضل شاہ اُن کی مدد کو آ گیا تھا۔

اور اس نے کیا کیا تھا۔

اُس کے لیے تو یہی بہت کچھ تھا۔ جان بچی سولا کھوں پاتے۔

مغز زری دیر بعد تھانیدار اُن دونوں کو فضل شاہ کی گاڑی میں بٹھا کر اُن کے ساتھ

ہی فضل شاہ کی گاڑوں سے باہر والی حویلی پر آ گیا تھا۔ جہاں حنیف خان نے ان کا استقبال کیا۔ اب زہرہ بائی کو سمجھ آگئی کہ دراصل حنیف خان کی سفارش سے انہیں رہائی نصیب ہوتی ہے۔

”کیا حال ہے عنایت بائی — سنا ہے آج کل بڑی دعوتیں آرہی ہیں تمہیں۔“  
بھتی ہم نے تو اپنے یار کا حکم پورا کیا ہے۔“

فضل شاہ کے تین فکروں نے عنایت بائی کو ساری کہانی سمجھا دی تھی۔ اسے کچھ آگئی تھی کہ دراصل اُسے پلوال کے مجرے کی ”ساتی“ پکڑنے کی سزا ملی ہے۔  
”دشاہ جی ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ نوکر ہیں آپ کے شاہ جی۔“  
یہ کہتے ہوتے عنایتی نے آگے بڑھ کر فضل شاہ کے گھٹنے پکڑ لیے۔

”خیر ہے — خیر ہے — کچھ نہیں ہوتا۔ حنیف خان ہمارا یار ہے۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں تھانے میں نہیں رہنا چاہیے سو ہم نے یہ کر دیا۔ تین دن تم ہماری ہمان رہو گی یہاں — مجبوری ہے۔ قانون کا معاملہ ہے۔ ادرا ایس پی یا تھ دھو کر تیکے پڑا ہے — کسی وقت بھی تھانے پر ریڈ کر سکتا ہے۔ میں ذرا کام سے جاتا ہوں تھانے کو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔“

اُس نے حنیف خان کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا تی۔

حنیف خان بے شرموں کی طرح دانت نکالنے لگا۔

اُسے سمجھ آگئی تھی کہ فضل شاہ نے اُسے اکیلا کیوں چھوڑا ہے — تھانیدار

اُس کے ساتھ واپس لوٹ گیا تھا۔

”پرچہ کچا کاٹا ہے ناں —“

فضل شاہ نے جاتے جاتے کہا۔

”سرکار کے حکم کی تعمیل کی ہے“

چوہدری نے دانت نکالے۔

”ویل ڈن چوہدری — اب پتہ لگے گا سردار رشید کو کہ ہم اُس سے ہلے

ڈرانے باز ہیں آیا تھا ہمیں بے وقوف بنانے — سکھوں کی اولاد — بھلا کبھی سکھوں کو بھی عقل آتی ہے —“

فضل شاہ نے کہا اور دوسری طرف گھوم گیا۔

حویلی میں ایک علیحدہ بلاک اُن کے لیے مختص کر دیا گیا تھا جہاں تمام جدید بہتیس موجود تھیں۔

عنایت بائی تو آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی — اُس نے جان بوجھ کر بیٹی کو حنیف خان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ وہ حنیف خان کا شکریہ ادا کر سکے جس نے اس نازک موقع پر اُن کی جان بچائی تھی۔

اور —

زہرہ بائی نے اپنی ماں کے دہاں سے جلتے ہی حنیف خان کا اچھی طرح شکریہ ادا کر دیا۔

حنیف خان خود کو شہزادہ گلگام سمجھنے لگا تھا جس نے بے چاری خوبصورت شہزادی کو خطرناک جہات کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔

○

اسے ایس آئی محمد دین نے جب چوہدری نظامت کو تھانے میں آتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا کہ عین ممکن ہے وہ کسی ذاتی کام سے آیا ہو۔

لیکن —

ذاتی کام سے آنے کے لیے اُسے اپنے ساتھ اپنے تھانے کی گارڈ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر اُسے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جب انچارج خان صاحب نے اُس سے کہا کہ دو تین جوان تیار کر دے بازار میں چھاپہ مارنا ہے — محمد دین تو یہ اطلاع ملنے پر کہ وہ لوگ عنایت بائی کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں پڑا پڑا اور وہاں سے بہانہ کر کے کھسک گیا تھا۔ وہ اپنے بزنس پارٹنرز کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں بڑی محنت سے سارا منصوبہ بنایا



چھوڑ دیا۔ یہ ہر بات تقدیر کے کھاتے میں نہ ڈال دیا کرو۔ گاڑی نکالو اور شہر چلو۔ ہمیں فوراً آصف سے ملنا ہے۔“

سردار رشید نے کہا۔  
تھوڑی دیر بعد وہ تینوں اپنے دو باڈی گاڑوں کے ساتھ شہر کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں سردار رشید کا ایک بھانجا حال ہی میں اے ایس پی بن کر آیا تھا۔  
”بیٹا معاملہ عرت کا بن گیا ہے۔ دونوں عورتوں کو رہا ہونا چاہیے اور تمہارے بھائی کی منگنی میں اُن کا بجز یہ ضرور ہونا چاہیے۔“

سادہ بات اپنے اے ایس پی بھانجے کو سمجھانے کے بعد اُس نے کہا۔  
”دیکھتا ہوں انکل“  
بھانجے نے بددلی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مقامی تھانے میں رابطہ قائم کر چکا تھا۔ جہاں سے اُسے اطلاع ملی کہ دونوں عورتیں رہا ہو گئی ہیں۔

”وہ تو رہا ہو گئی ہیں انکل۔ اُن کی ضمانت ہو گئی۔“  
اُس نے کاغذ پر کچھ نوٹ کرنے کے بعد اپنے ماموں سے کہا۔  
”کس نے کروائی ضمانت؟“

اِس مرتبہ عالم داد نے بے چینی سے دریافت کیا تھا۔  
”کسی فضل شاہ نے کروائی ہے۔“

اے ایس پی نے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔  
”فضل شاہ ہم سے بڑا ڈرامے باز نکلا سردار صاحب۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ دیکھ لوں گا اے۔ کبھی دادے کی کبھی بابے کی۔ ایک مرتبہ میری داڑھ تلے آ گیا تو پیس کر نہ رکھ دیا تو عالم داد نہ کہنا مجھے۔“  
عالم داد نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے۔ ایسا منکار آدمی۔ خود ہی گرفتار کر دیا اور خود ہی رہا بھی کر دیا۔“

تھا اور جیسے عالم داد نے کہا تھا ویسے ہی کیا۔  
لیکن

اس کی بد قسمتی کہ مقابلہ بھی زرد والوں سے تھا۔

چوہدری نظافت اپنے ہسکاروں میں اپنے اکھڑپن کی دُجر سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کسی کو اس کے منہ لگنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔  
محمد دین سے اور تو کچھ تر بن سکا۔ اُس نے فوراً ہی عالم داد کو فون کر کے اِس حادثے کی خبر کر دی تھی۔

عالم داد نے اِس کا فون سردار رشید اور سردار مرید کی موجودگی میں سنا تھا۔  
”کیا بات ہے۔ تمہارا منہ کیوں لٹک گیا۔“

سردار رشید نے اس سے پوچھا۔

”سردار صاحب دشمن ہم سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ ریاست شاہ نے عنایت پائی اور اس کی بیٹی کو کسی عورت کے اغوا کے الزام میں گرفتار کر دیا ہے اور یہ بات تو میں بھی سمجھ سکتا ہوں کہ اس نے کم از کم تین دن کے لیے اُسے پولیس حراست میں رکھے گا مکمل بندوبست کر رکھا ہوگا۔“

عالم داد نے سردار رشید سے آنکھیں ملاتے بغیر بات کی۔

”اوہ میرے خدایا۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ ہمارا تو سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔“

سردار مرید نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا عالم داد کہ ہاتھ پکڑا ڈالنا۔ لیکن تم نے۔“  
سردار رشید دانت پسینے لگا۔

”بھائی جان عالم داد نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ تو بس تقدیر نے ہے۔“

ہمیں ہار دے دی۔“

سردار مرید نے عالم داد کی وکالت کی۔

”خیر۔ کب تک رکھے گا اکٹھ باپ بیٹے کو۔ ایک منضو بہ ہے میرے ذہن میں۔  
اس نے سردار رشید کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اگلی بات کہہ دی۔  
”فی الوقت تو اُس نے ہمیں نیچا دکھایا ہے عالم داد۔ بعد کی دیکھتے رہو۔  
خیر! اب ہمت ہارنے والی بھی کوئی بات نہیں۔ ابھی تو کھیل کا آغاز ہوا ہے۔  
تینوں اٹھ کر گاؤں کی طرف واپس لوٹ آتے۔“

## گھاؤ

تین دن اور راتیں حنیف خاں اُن کے ساتھ رہا۔  
فضل شاہ نے اگلے ہی روز نھتو خاں کو گاؤں واپس بھیج دیا تھا تاکہ وہاں جلسے و جلوس  
کا بندوبست کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اپنے بیٹے کے کروت کا علم ہو۔  
تین دن اور راتیں حنیف خاں نے خوب گلچہرے اڑاتے تھے۔ اس درمیان عنایت بائی  
کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ نذیرا وہاں نہیں آیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں مر گیا تھا۔ آخر  
تیسرے روز اس نے فضل شاہ سے پوچھ ہی لیا۔  
”پھوٹی ذات کا تھا۔ کینہ نکلا۔ خیر بیچ کر کہاں جاتے گا۔“  
فضل شاہ نے مختصر سی بات کر دی۔

عنایت بائی نے مزید کچھ پوچھنا مناسب ہی نہ سمجھا۔ اس کے لیے یہ اطلاع کافی تھی  
کہ نذیرے موچی کے سر سے فضل شاہ کا دست شفقت اٹھ گیا ہے۔ اب اس کے  
پاس نذیرے کو اپنے گھر سے دھکے دے کر نکالنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔

تیسرے دن اُن کی نام ہنا دشمنانت بھی ہو گئی اور دونوں ماں بیٹی رہا ہو کر گھر آ  
گئیں۔ فضل شاہ نے اپنی کاٹری اور ڈرائیور انہیں چھوڑنے کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔  
اس نے دم زحمت عنایت بائی کو اُنک سے لے جا کر سمجھا دیا تھا کہ ان کی مرضی کے  
بغیر یا ان کے دشمن کی باتوں میں آکر اگر اس نے آئندہ کوئی غلط حرکت کی تو وہ ماں بیٹی کو  
قتل کے الزام میں گرفتار کر دے گا اور کوئی اُن کی سفارش کرنے والا نہیں ہوگا۔  
”بس تمہیں دھندہ کرنے سے نہیں روکتا عنایت بائی۔ لیکن تم نہیں جانتی کہ تمہیں

ایک خطرناک کام کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بظاہر تم بھی سمجھ رہے تھے کہ تم پلوال میں مجرہ کرنے جا رہے ہو لیکن دراصل تمہیں ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا اور ایسا کم از کم فضل شاہ کی زندگی میں نہیں ہو سکتا۔

عنایت بائی نے نذیر موچی کی غیر موجودگی میں سارا بوجھ اس کے سر پر پھینکے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”شاہ جی مولاتھیں سلامت رکھے۔ اس میں ہمارا کیا قصور۔ میں نے تو خاص طور پر نذیر سے غرقی پڑنے سے پوچھا تھا کہ ہم پلوال چلے جائیں کہیں آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔ اس خانہ خراب نے مجھے گمراہ کیا اور کہا کہ اس پر بھلا آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ درنہ میری کیا مجال تھی شاہ جی کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکوں۔ کچھ تو سوچے یا پھر مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہیں۔ خدا نہ کرے شاہ جی بھی ایسا دن آئے کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی کروں۔ اس سے پہلے مجھے موت نہ آجاتے۔“

عنایت بائی نے ٹسوے ہاتھ ہوتے اپنی صفائی پیش کی۔

”ہوں۔ تو اس کا مطلب ہے یہ سارا کیا دھرا اس آستین کے سانپ کا ہے۔“

فضل شاہ نے دانت پیستے ہوتے کہا۔

”اور کیا شاہ جی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ تو اندر خانے آپ کے دشمنوں کا ہوا تھا اور اس نے جان بوجھ کر یہ کام کر دیا تھا۔“

عنایت بائی نے مزید تیل جلتی پر پھینکا۔

اس کی نوشہ دید خواہش تھی کہ فضل شاہ نذیر سے کو مروا ہی دے۔ اس طرح کم از کم نذیر سے کی موت کے ساتھ اس کے بہت سے جرائم کا گواہ تو ختم ہو جاتا۔ نذیر ہی تو آئے روز اُسے احساس دلاتا رہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے جرم میں برابر کی حصہ دار ہے۔

”تم اس کو مقبول جاؤ عنایت بائی۔ وہ ہم سے بچ کر کہاں جائے گا۔ اب حلیف خاں کو سنبھالے رکھنا۔ حلیف خاں کو ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے جب تک کہ تم“

چاہیں۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرنا۔ بیسیوں کی کوئی فکر نہ کیا کرو۔ ہمیں دولت سے بہت محبت ہے لیکن ہم نے اُسے اپنی عزت پر کبھی ترجیح نہیں دی۔“

فضل شاہ نے کہا۔

”شاہ جی آپ نے باندی پر بہت احسان کیے ہیں۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی۔ میں اُسے باندھ کر رکھوں گی۔ بچ کر نہیں جاسکے گا۔ ہم سے بچ کر جاتے گا بھی کہاں۔“

اُس نے بڑے یقین سے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ یہ رقم رکھ لو میں تمہارا نقصان نہیں چاہتا۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑے ٹوٹوں کی تین چار گڈیاں اس کی طرف بڑھادیں۔

”شکریہ شاہ جی۔ مولانا آپ کو آباد رکھے۔“

عنایت بائی نے نذیر سے بچوں کی طرح ٹوٹوں پر جھپٹتے ہوتے کہا۔

”فضل شاہ کا ڈرا تیرا نہیں گھر کے باہر اتار رہا تھا۔ جب اے آئی محمد دین کو یہ اطلاع وہاں ڈیوٹی پر موجود اس کے ایک خاص سپاہی نے پہنچائی۔“

”چوہدری صاحب آگئی ہیں واپس۔ اور وہ بھی ساتھ ہی مبارک ننگا سا۔“

گھنی ٹوٹیوں والا نوجوان جس کے متعلق آپ نے بتایا تھا۔

”ٹھیک ہے شاباش۔ تم جاؤ اور اس کے گھر کے سامنے ہی ٹہلتے رہنا۔ سمجھ گئے ناں۔ اور ہاں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔“

اُس نے سپاہی کو واپس بھیج دیا۔

محمد دین کو اس اطلاع کا انتظار تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ تھانے سے باہر تھا جہاں سے ایک پنی سی ادھر اس نے عالم داد کا نمبر پلایا اور اسے اپنے تازہ کارنامے کی خبر دی۔

ہوں لں۔ تو یہ بات ہے۔ شاباش محمد دین۔ شکریہ یار۔ تو نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔“

اُس نے فون بند کر دیا اور اب وہ سیدھا سردار رشید کی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔

نھوڑی دیر بعد وہ سردار رشید کے ساتھ اگلے پلان پر بات چیت کر رہا تھا۔  
 "عالم داد — یار اب مجھ میں مزید ذلالت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔  
 سنبھل کر قدم اٹھانا۔ میرا مطلب ہے سوچ سمجھ کر — کہیں پھر یا زنی الٹی نہ پڑ جائے۔"  
 سردار رشید نے عندیہ ظاہر کیا۔

"سردار صاحب — یہ تریپ چال ہے۔ آخری چال۔ جو کہ الٹی نہیں پڑتی۔ پر  
 نام بھی حوالدار عالم داد ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ بارڈر پر تیلی پھینکنے جا رہا ہوں — اہ  
 میں دیکھیوں گا کہ ریاست شاہ کون سا پتہ پھینکتا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا  
 ہے — پولیس کی دھونس سے ہر کام نہیں چلا کرتا سردار صاحب —"

عالم داد نے بڑے یقین سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گو آھیڈ —"

سردار رشید نے سگنل دے دیا۔

نھوڑی دیر بعد ہی سردار مرید اور عالم داد جیپ پر نھوڑوں کے گاؤں کی طرف ہا  
 رہے تھے۔ انھوں نے جانے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ نھوڑوں گھر ہی پر  
 موجود ہے — وہ آج صبح ہی شاہ پور سے واپس لوٹا تھا۔

ایک مرتبہ پھر سردار مرید اور عالم داد کی آمد کی خبر نے نھوڑوں کو پریشان کر دیا  
 وہ گھر آئے مہمان کو دھکے دے کر نکالنے سے تو رہا۔

لیکن —

ان لوگوں کی آمد بھی اس کے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔

خدا جانے اس مرتبہ وہ لوگ کیا کھیل کھیلنے آتے تھے۔ پہلی مرتبہ تو وہ باپ اور  
 میں اختلافات کے بیچ بکر واپس لوٹے تھے۔

بادل نحواستہ نھوڑوں نے اُن کو خوش آمدید کہا تھا۔

"نھوڑوں میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا کہ سیاست اپنی جگہ اور ہمارے  
 اپنی جگہ۔ تم ہمیں دوٹ نہ دو — تمہاری برادری ہمیں دوٹ نہ دے۔ سردار صاحب

ایشن ہا جائیں۔ ہمارے بیٹے یہ صدقات تو قابل قبول ہیں لیکن تمہاری واحد اولاد  
 زینہ کو محض اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے ریاست شاہ اور فضل شاہ جو گھناؤنا کھیل  
 تمہارے ساتھ کھیل رہے ہیں وہ تمہاری واحد اولاد تمہارے بیٹے اور ہمارے علاقے کے  
 سُرے حقیقت خاں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔"

"عالم داد — ہوش کے ناخن لو — کیا ادھی حرکتوں پر اُتر آتے ہو۔"

نھوڑوں نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اپنے بیٹے کی تباہی کے ذکر پر اُسے لگا جیسے کسی نے اُس کے کلیجے پر ہاتھ ڈال لیا ہو۔  
 "میں قول کا مرد ہوں نھوڑوں — اگر اپنی بات سچی ثابت نہ کر دوں تو ساری برادری

کے سامنے میری مونچھیں کٹوا دینا —"

عالم داد نے اُسے مزید پیش دلایا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو عالم داد بھائی —"

اس مرتبہ نھوڑوں کا سالانہ اُس سے مخاطب ہوا تھا۔

"نذر محمد — نھوڑوں ہے سیدھا سادا بندہ۔ اُس نے بد معاشی کی ہے مردوں کی

طرح۔ لیکن اس کا واسطہ بڑے مکار لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ جنھوں نے حنیف خاں کو

نشے اور عورت کی چاٹ لگا دی ہے تاکہ ساری زندگی کے لیے وہ انہی کا محتاج ہو کر

رہ جائے۔ وہ طوائف جس نے ہمارے ہاں مجرہ کرنا تھا۔ فضل شاہ نے اُسے مٹھی میں لے

کر حنیف خاں سے چپکا دیا ہے جو آہستہ آہستہ ہمارے علاقے کے اس شیر جوان کا بدن

کھوکھلا کر رہی ہے۔ ابھی وہ شراب کے نشے پر لگا ہے جس کے بعد یہ لوگ اُسے ہیر و تن

کا نشہ لگا دیں گے اور پھر ساری زندگی کے لیے وہ فضل شاہ کی چوکھٹ سے لگا رہے گا۔"

عالم داد کی بات سن کر نھوڑوں کا چہرہ شدت غضب سے سُرخ ہونے لگا اُس کا

جی چاہتا تھا کہ عالم داد کی زبان کاٹ دے۔

لیکن —

اُس کے سامنے نذر محمد نے بڑی دنیا دیکھی تھی۔ وہ ریاست شاہ کے باپ دادا

کو جانتا تھا اُن سے کچھ بعید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ عالم داد سچ کہا ہو۔ نذر محمد جانتا تھا کہ نھو خاں سیدھا سا وادید معاش ہے اور اس کے سر میں دماغ نام کی کوئی شے موجود نہیں۔ اس سے پہلے کہ نھو خاں طبیش میں آکر صورتحال بگاڑتا نذر محمد نے صورت حال کو سنبھال لیا۔

”عالم داد بھائی ہم تیرے شکر گزار ہوں گے اگر تو ہمیں اس کا ثبوت دے دے۔ دوسری صورت میں ہم یہی سمجھیں گے کہ تم لوگ نھو خاں کے ساتھ کوئی خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔“

اُس نے کہا۔

”نذر محمد یہی بہترین موقع ہے۔ اس سے پہلے کہ ثبوت میرے ہاتھ سے نکل جائے نھو خاں اور دو تین معززین کے ساتھ تم میرے ساتھ فوراً چلو۔ عین ممکن ہے کہ اگر فضل شاہ کو خبر لگ گئی تو وہ کھیل کا پانسہ ہی نہ پلٹ دے۔“

عالم داد نے کہا۔

”عالم داد ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے ہمیں دھوکہ دیا تو ہماری برادری کا پتہ کٹ جائے گا لیکن ہم تمہاری نسل کو ختم کر ڈالیں گے۔“

نھو خاں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

”نھو خاں ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں بطور ضمانت جا رہا ہوں۔ اگر

عالم داد نے غلط بات کی ہو تو جو سزا تم مقرر کرو ہمیں قبول ہوگی۔“

اس مرتبہ سردار مرید نے کہا تھا۔

”چلو چلتے ہیں۔“

نھو خاں نے کہا۔

نھو خاں دیر بعد نھو خاں، نذر محمد اپنی برادری کے تین اور معززین کے ساتھ سردار مرید کی جیب میں شہر کی طرف جا رہا تھا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ لوگ شہر کے بازار حسن میں پہنچ گئے تھے جہاں

اے ایس آتی محمد دین بے چینی سے اُن کا منتظر تھا۔

عنایت بائی نے کوٹھے کے نزدیک داغ ایک ہوٹل کے کیمین میں اُس نے سب کو بٹھا لیا۔ اس سے پہلے جب تک اُس نے کوٹھے پر حنیف خاں کی موجودگی کی تصدیق نہیں کر دی۔ عالم داد کی جان میں جان نہیں آتی تھی۔

”نھو خاں یہ اس علاقے کے تھانیدار صاحب ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ تم نذر محمد کے ساتھ بے فکر ہو کر جاؤ۔ محمد دین تمہاری حفاظت کے لیے ساتھ جائے گا۔“

تم جانتے ہو کہ حنیف خاں جوان آدمی ہے۔ اُس کا خون گرم ہے۔ کہیں ہماری شکل دیکھ کر اُسے یہ شک نہ ہو جائے کہ تمہیں ہم یہاں لاتے ہیں اور وہ ہماری جان کا دشمن بن جائے۔ ہماری ایک اور درخواست یہی ہے کہ یہاں سے واپسی کا سفر تم اپنے بیٹے کے ساتھ علیحدہ کرنا۔ ہمارا ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ میرا مطلب ہے میں کر دہ آدمی ہوں سامنے نہیں آنا چاہتا۔“

عالم داد نے رازداری سے کہا۔

”چلو جی چوہدری جی۔“

نھو خاں نے عالم داد کی بات سنی اُن سنی کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا غصہ دیدنی

حنیف خان کو اس کے باپ نے سوائے سرحد پار چوری اور سنگٹنگ کے اور کچھ نہ سکھایا تھا اور نہ ہی چاہا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کوئی گندا کام کرے۔ اُسے شراب کے ذکر سے گھن آتی تھی۔

اُس نے اپنے بیٹے کو ساری زندگی ایک ہی سبق پڑھایا تھا کہ اگر اس نے اپنی مردانگی قائم رکھنی ہے تو اُسے شراب اور عورت سے بچ کر رہنا ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے سے کہا کرتا تھا کہ مرد کے تنادر وجود کو یہ دونوں چیزیں گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔

اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے پیشورد بدمعاشوں کے کئی واقعات سُنا کر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جن بدمعاش سے انگریز کی پولیس بھی تفتیش میں کچھ نہیں آگوا سکتی تھی۔ اس کو کسی طرح شراب یا عودت نے بزدل بنا کر اپنی ہی نظروں میں گرگا دیا تھا۔

لیکن —

آج اس کی واحد اُمید۔

اس کا شیر جوان بیٹا۔

اس کے خاندان کی آبرو حنیف خان ایک زبڈی کے پہلو میں بیٹھا گھٹیا قسم کی

شراب سے دل بہلا رہا تھا۔

محمد دین کو پہلی مرتبہ اپنے جرم کی دنیا کے دیرینہ ساتھی حوالدار کے سامنے ہزیت

اُٹھانی پڑی تھی۔ وہ تو جانے کب کا طیش کھاتے بیٹھا تھا۔ عنایت بائی کے ایک

پُرانے ملازم کو اپنی مٹھی میں لے کر اُس نے اس گھر کے سارے راز اکٹھے کر لیے تھے

وہ جانتا تھا کہ زہرہ بائی اس وقت حنیف خان کو کس کمرے میں لیے بیٹھی تھی۔

عنایت بائی اُن دو دیہاتیوں کو تو نہ پہچان سکی جو محمد دین کے ساتھ دھڑ دھڑ کرنا

اس کے کونٹے پر چڑھ آتے تھے۔

لیکن —

اے ایس آئی محمد دین کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا نشہ ہرن ہونے لگا۔ اُس

نے آج بہت عرصے بعد حنیف خان کے پیسوں سے ولایتی شراب کی بوتل خریدی تھی

اور ندیدے بچوں کی طرح اُس پر پل پڑی تھی۔ اس بات کا تو اُسے احساس تھا

اسے اے ایس آئی محمد دین کو اس پر بہت غصہ آ رہا ہو گا حالانکہ اُس بے چاری

اس میں کوئی دوش نہیں تھا۔

ایک مرتبہ تو وہ لڑ لڑ کر رہ گئی —!

لیکن —

خاندانی طوائف تھی۔ حوصلہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئیے چوہدری صاحب۔ ہمارے دھن بھاگ جو آپ تشریف لائے۔“

اُس نے اپنی روایتی زبان بولنی چاہی لیکن محمد دین اس کی طرف دیکھے بغیر اُس

برے سے کمرے سے گزر کر اس سے ملحقہ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا جیسے بظاہر

باہر سے گنڈی لگا کر عنایت بائی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اندر کوئی موجود نہیں۔

محمد دین نے دروازے کی گنڈی کو جیسے ہی ہاتھ لگا یا۔ اندر موجود زہرہ بائی کا دل

دھک سے رہ گیا۔

”کیا مصیبت آگئی ہے۔“

اُس کے مُنہ سے جیسے ہی یہ الفاظ نکلے۔ دروازہ زور سے کھلا اور حنیف خان کو

ملنے اپنے والد، ماموں اور ایک رشتہ دار کی شکلیں دکھائی پڑیں تو اس کے ہاتھ

پاؤں گھراہٹ سے پھول گئے۔

اور —

بغضو خاں کے لیے زندگی کا یہ سب سے بڑا جائگسل اور اندوہناک لمحہ تھا۔

اُس نے ساری زندگی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بسر کی تھی۔ سرحد کے

آر پارہ گویوں کی بارش میں سے رنگ کر گزر جاتا تھا — زندگی میں درجنوں مرتبہ

ایسے مقامات آئے جہاں اُس کے اور موت کے درمیان چند ثانیے کا فرق ہی رہ

گیا تھا۔

لیکن —

اس پر کبھی ایک لمحے کے لیے گھراہٹ یا خوف طاری نہیں ہوا تھا۔ اُس نے

ساری زندگی شیر مردوں کی طرح گزاری تھی اور اپنے بیٹے کو بھی اس نہج پر پالا پوسا

اور جوان کیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو لاشعوری طور پر اس بات کا قائل کرنے کی

کوشش کی تھی کہ بزدلی کی زندگی جینے سے بہادری کی موت مرجانا کہیں اہن عمل ہے۔

لیکن —

آج اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے ہاتھوں اور پیروں سے جان نکل گئی ہو۔ عمر کے اس حصے میں بھی اس کی توانیاں ناقابلِ چیلنج تھیں لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں کا مریض رہا ہو اور کسی بھی لمحے اس کا چراغ زندگی نکل ہونے والا تھا۔ غصے اور افسوس سے اس کے منہ سے ڈھنگ کے الفاظ بھی نہیں نکل پڑے تھے۔ اُسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس وقت اپنے بیٹے کو کیا کہے۔

”حنیفے — باہر آ جا۔“

اُس لمحے جب نذر محمد نے حنیف خاں کو غصیلی آواز میں کہا تو ننھو خاں کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سالے نے اس کے دماغ سے منوں بوجھ اُتار دیا ہو۔

”ماما تو اُسے کو لے چل میں آتا ہوں۔“

حنیف خاں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”حنیفے — کھڑا ہو جا۔۔۔“

اچانک ہی ننھو خاں گلا پھاڑ کر چلے آیا اور اپنے بیٹے کو اس نے آگے بڑھ کر بالوں سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ سامنے دھرے صوفے پر جا گرا۔

جانے اُس کی آواز میں کیا رعد کر ٹکی تھی کہ زہرہ بائی کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ عنایت بائی بجلی کی طرح اپنی بیٹی کی طرف لپکی۔

لیکن —

ننھو خاں کو وہاں سواتے حنیف کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دے کر کھڑا کیا اور دیوانہ وار اُس پر پل پڑا۔ زہرہ بائی اور اس کی ماں تو چیختی چلاتی کمرے سے باہر بھاگ گئی تھیں جب کہ نذر محمد اور محمد دین کے لیے ننھو خاں پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

”ننھو — ہوش کر۔ کیا سارے شہر کو تماشادکھانے کا۔“

بالآخر نذر محمد نے جب اُسے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو ننھو کو ہر شہ آ گیا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ شہر کا بازار حسن ہے واقعی یہاں کسی بھی لمحے تماشاک جاتا۔ اس

کی بھلائی اسی میں تھی کہ اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے نکل جائے۔

”چل میرے ساتھ چل۔“

ننھو نے چلاتے ہوئے اپنے جواں سال چشم و چراغ کو سپرھیوں کی طرف دھکا دیا تھا وہ بچوں کی طرح سر جھکائے شرمندگی سے اُس کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔

عنایت بائی اور اس کی بیٹی کے لیے یہ منظر اتنا اذیت ناک تھا کہ دونوں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چھپ گئی تھیں۔ انھوں نے احتیاطاً کمرے کو اندر سے گنڈی لگا کر بند کر لیا تھا۔ عنایت بائی کی زندگی میں اس نوعیت کے صدمات کبھی نہیں آتے تھے۔ اس نے تو ساری زندگی بڑے طمطراق سے گزاری تھی۔

ننھو خاں اپنے بیٹے کو دھکیلتا ہوا نیچے مہک لایا تھا جہاں نذر محمد نے فوری طور پر ایک ٹیکسی کار کا بندوبست کیا اور وہ لوگ لاری اڈے کی طرف چل دیئے۔

حنیف خاں کا نشہ اُترا تو سب سے پہلے اُسے اپنی بے عزتی کا جان لیوا احساس ہوا۔ اس کا مجبورہ کے گھر میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے حنیف خاں کی جو زرگت بنی تھی اُس نے حنیف کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

”آبا تو نے اچھا نہیں کیا۔“

بالآخر وہ لاری اڈے پہنچے ہی پھٹ پڑا۔

”اور تو نے بہت اچھا کیا۔ اوے کمبخت تجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ تو تیری جوانی کے خلاف کھلی سازش تھی۔ فضل شاہ نے تیرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ وہ تجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔“

ننھو کے بجائے نذر محمد نے جواب دیا۔

”تجھیں یہاں بھیجا کس نے تھا؟“

نذر محمد کی بات کا جواب حنیف خاں نے پھاڑ گمانے والے لہجے میں سوال کرتے ہوئے دیا۔

تجھے اس سے کیا؟ تو چُپ چاپ گاؤں چل۔ میں دیکھوں گا اس مرانی کی اولاد

کو۔ اس بھوٹے شاہ کو دیکھوں گا میں۔ کس طرح جیتتا ہے الیکشن۔ سالے کے پر مارتا ہوں پیسے — کیا سمجھ رکھا ہے اُس نے مجھے — ساری زندگی زبردستی سرحد پر بد معاشی کی ہے۔ کسی کو جرات نہیں تھی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا جانے کب میرے دماغ میں یہ فتور سما گیا جو میں اس موذی کے چنگل میں جا پھنسا۔ نختو خاں نے پچھتاوے کا اظہار کیا۔

حنیف خاں کے گمراہ ذہن نے فوراً ہی اُسے دوسرا راستہ دکھا دیا۔ اس سمجھ لیا کہ یہ ساری شرارت سرداروں کی ہو سکتی ہے۔ انھوں نے فضل شاہ سے لینے کے لیے اُس کے باپ کو فضل شاہ کے خلاف بدظن کیا ہے۔ تاکہ نختو خاں ریاست شاہ کی حمایت سے الگ کیا جائے۔

لیکن —

میں ظلم ہو گیا تو زہرہ بائی سے بھی اُسے الگ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ زہرہ اور اس ماں کا تو رداں رداں فضل شاہ کا احسان مند تھا۔ انھوں نے زندگی میں شاید پہلی بار اس کے حکم سے سزائی کی جرات کی اور اُس کا خمیازہ بھی بھگت لیا اب تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ بھی کریں۔ تذیرا بھی نہیں رہا تھا۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا گزری اور وہ بھی بھاگ گیا۔ اگر اس کا باپ ریاست شاہ کی حمایت سے الگ ہو گیا تو عین ممکن ہے کہ فضل شاہ کے حکم یا اشارے پر زہرہ بائی بھی اُسے منہ لگانا چھوڑ دے۔

وہ تو زہرہ کے بغیر مرتے گا۔

نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ "اُس کے شیطانی ذہن نے راہنمائی کی کہ اُسے فضل شاہ کے پاس پہنچ کر اُسے سارا معاملہ سمجھا دینا چاہیے تاکہ فضل شاہ پہلے ہی کو بندوبست کر کے نختو خاں کو ٹھنڈا کر لے۔ وہ اپنے باپ کو جانتا تھا جس نے ساری زندگی نہ تو شراب کو چھپوا تھا نہ ہی کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کے دیکھا تھا۔ کے نزدیک یہ دونوں ناقابل معافی جرم تھے۔

ادرا —  
اپنے بیٹے کا یہ جرم وہ کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ جن لوگوں نے اس موقعہ واردات پر پہنچا یا تھا وہ یقیناً اُسے یہ بھی سمجھا کر لائے ہوں گے کہ یہ سارا کیا دھرا فضل شاہ کا ہے۔ "تم لوگ چلو میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔"

حنیف خاں اتنا کہہ کر ایک طرف چل دیا۔ نختو خاں اُسے گالیاں دیتا۔ اس ارادے سے اُس کی طرف بڑھا تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتے۔

لیکن —

اچانک اس کو زبردست ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ "ابا ہوش کر۔ میں نے تیری بہت عزت رکھی۔ تو نے طوائفوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا میں خاموش رہا۔ اب تو بھی میری عزت کا خیال کر۔ میں کوئی دودھ پینا بچہ نہیں ہوں۔ کہہ دینا کہ آ جاؤں گا تو چل گھر۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دوسری طرف مڑ گیا۔

نختو خاں غصے سے بے قابو اُس کی طرف لپکا لیکن نذر محمد اور اس کے ساتھی نے نختو خاں کو پکڑ لیا۔

"نختو — عقل کر۔ جوان اولاد ہے۔ ہاتھ سے نکل گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتا رہ جاتے گا۔"

نذر محمد نے اُس سے چپا تے ہوئے کہا تو نختو خاں کو ذاتی عقل آ گئی۔

اُس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ایک بات اُسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اُس نے چوری کا دھندہ چھوڑ کر سیاست کا جو کاروبار شروع کیا تھا یہ اس کے لیے تو سے کا گھنٹا تھا۔

یہ لوگ اتنا طرکتے ہیں اور اتنے گھٹیا ثابت ہوں گے۔ اس نے تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس سے تو وہ چور ہی ہزار گنا بہتر تھا۔



نقوڑی دیر بند نقوڑ خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس عزم کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔  
جاریا تھا کہ آج کے بعد وہ کبھی شاہ پور کی طرف منہ کر کے پیشاب بھی نہیں کرے گا۔

فضل شاہ اپنے بھائی ریاست شاہ کے ساتھ ہی موجود تھا جب حنیف خاں پہنچا۔ اُس کی خصوصی حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر اُسے فوراً ہی شاہ صاحبان کے سامنے پیش کر دیا گیا جہاں حنیف خاں نے اچانک خود پر ٹوٹنے والی قیامت کی کہانی اُس کے گوش گزار کر دی۔ فضل شاہ کے چہرے پر تو چند ثانیے کے لیے تشویش کے سارے لہرانے لگے۔

لیکن —

ریاست شاہ کا چہرہ بالکل سہاٹ رہا۔  
اُس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حنیف خاں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے شیطانی چال چلی —

”حنیف خاں! تم مرد ہو۔ اس علاقے میں تمہارا ایک نام ہے۔ مرد جس کا ہاتھ پکڑیں اُسے چھوڑا نہیں کرتے۔ ہمیں کسی طوائف سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم نے اُسے رہائی صرف تمہارے کہنے پر دلائی ہے لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ اگر اس وقت تم پر اعتماد کیا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اُس کا ساتھ بھادو —“

اُس نے حنیف خاں کی مردانگی کو لٹکارتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! میں بھی نقوڑ خاں کا بیٹا ہوں۔ اگر زہرہ بانی کا ہاتھ پکڑا ہے تو مرنا دم بہک نہیں چھوڑوں گا۔ ہم زبان کے پتے لوگ ہیں۔ اگر میرے باپ نے ایکشن آپ کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے تو اُسے بہر صورت پورا کرنا ہوگا۔ خواہ ہمیں اس کی بھی ذمیت ادا کرنی پڑے۔“

حنیف خاں کو پیش آ گیا۔

ریاست شاہ بڑے مکاری سے ایک ایک مہرہ آگے بڑھا رہا تھا۔ اس نے ذمہ

کو کبھی شطرنج سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

”حنیف خاں تمہارا خون ابھی گرم ہے۔ تم سرداروں کو نہیں جانتے۔ وہ بڑے حرام کالہ ہیں۔ انھوں نے ہی یہ سارا چکر چلایا ہوگا۔ وہ جو حوالدار کی اولاد اُن کے ساتھ موجود ہے ناں۔ وہ عالم داد وہی اس شرارت کی بنیاد ہوگا۔ اس کا دماغ شیطان کا چرچہ ہے۔ سارا دن وہ شیطان منسوبے بنتا اور سرداروں کو پیش کرنا کرتا ہے اور سردار اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ ساری سازش اُس نے تیار کی ہو گی۔ وہی تمہارے باپ کو دہاں لے کر گیا ہے۔ اور کس کی یہ جرات ہو سکتی تھی۔ کوئی بات نہیں حنیف خاں تم ہمارے دوست ہو۔ ہم اپنے یاروں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑا کرتے۔ ہم سرداروں اور عالم داد سے اس اچھی حرکت کا بدلہ ضرور لیں گے۔ مجھے حساس ہے کہ تمہاری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ مرد کو اگر اُس کی معشوقہ کے سامنے ذلیل کر دیا جائے تو وہ مٹی میں مل جاتا ہے لیکن تم مطمئن رہنا۔ فضل شاہ! تم جاؤ اور نقوڑ خاں کو سمجھاؤ کہ یہ ساری شرارت سرداروں کی ہے جس کا مقصد اس کے اور ہمارے درمیان اختلافات پیدا کرنا ہے۔ وہ ہمارا بزرگ ہے اگر تمہیں گامیاں بھی دے تو خبردار اُن تک نہ کرنا۔ اس کے سامنے زبان نہیں کھولنا اور کیا نام ہے اُس کا زہرہ بانی اُسے بھی سمجھا دینا کہ وہ حنیف خاں کی عزت میں ذرا فرق نہ آنے دے۔ سمجھ گئے ناں“

اُس نے اپنے بھائی کی طرف منہ پھیر کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”بالکل سمجھ گیا بھائی جی۔ بالکل سمجھ گیا۔ میں چاچے نقوڑ خاں کے پاؤں بھی اگر پکڑ گیا تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہمارے یار کا باپ ہے۔ اس کی ہم بہر صورت عزت کریں گے اور حنیف خاں! تم بالکل مطمئن رہنا زہرہ بانی کی طرف سے اُس کی کیا مجال کہ تمہارے سامنے اُن بھی کر سکے۔ میں اُسے سمجھا دوں گا کہ تم نے یہ ساری ذات اسی کی خاطر برداشت کی ہے۔ ادھ یار تو بے فکر ہو جا۔ تو اب شاہ پور میں ہی قیام کر۔ میں سات آٹھ دن کے لیے تیری معشوقہ کو یہیں بلا لیتا ہوں۔ کس کی ہمت ہے جو یہاں

تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اور ہاں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بالکل نظر نہ کرنا۔ آج رات ہی زہرہ باقی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ ابھی تو گاؤں نہ جا رہا۔ جوان آدمی ہے۔ سرداروں نے تیرے باپ کو بھڑکایا ہوا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ تم دونوں آپس میں ٹکرا جاؤ تاکہ وہ جی بھر کے تماشا دیکھیں لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ حنیف خاں! ہم انہیں تماشا دیکھنے کا موقعہ نہیں دیں گے۔“

فضل شاہ نے اپنے بھائی کی بات آگے بڑھائی۔

”شاہ جی آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے بھی آپ ہمیشہ اپنا دفا دار ہی پائیں گے۔ کچی شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔“

حنیف خاں نے گدھوں کی طرح بے دقتی سے گردن ہلاتی۔

”تم چلو جوہلی میں۔ تمہارے لیے میں نے جوہلی کا ایک الگ حصہ مخصوص کر دیا ہے۔ وہاں کوئی تمہاری اجازت کے بغیر نہیں آسکتا۔ چلو تم۔“

یہ کہہ کر اُس نے اپنے منشی کو آواز دی اور اُسے کچھ ہدایات دے کر حنیف خاں کے ساتھ باہر بھیج دیا۔

”فضل شاہ! آج رات ننھو خاں کی آخری رات ہونی چاہیے۔ اُسے کل صبح ڈھلنے سے پہلے قتل کر دو۔ قاتل کا ٹھکانا پلوال کی طرف جانا چاہیے حنیف خاں پر آج شام ہی کو زہرہ باقی کو مسلط کر دو۔ اُس کا دماغ صرف وہی سوچے جو ہم چاہتے ہیں۔ اُس کے باپ کا قتل سرداروں پر ڈال دو۔ حنیف خاں کو یقین ہو جائے تاکہ سرداروں نے باپ اور بیٹے کے درمیان لڑائی میں ناکامی کے بعد باپ کو قتل کر دیا ہے تاکہ اُسے ہماری حمایت کی سزا مل سکے۔ ننھو خاں کے گاؤں میں موجود اپنے مہروں کو حرکت میں لاؤ۔ موقع کے دوگواہ تیار کرنے چاہئیں جنہوں نے عالم داد اور سردار مرید کو موقعہ داروں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

ریاست شاہ نے حنیف خاں کی روانگی کے فوراً ہی بعد فضل شاہ کو ہدایات دینے ہوئے اگلا منشن سوچا۔

”شاہ جی ایسا ہی ہوگا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

فضل شاہ نے اپنے سوتیلے بھائی کے شیطانی ذہن کو دل ہی دل میں ہزاروں مرتبہ سلام کہتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اُس کی گھٹی موچھوں کے نیچے مسکراہٹ رنگ رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت کے ماتے لہرا رہے تھے۔

”جلدی کرو۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔“

ریاست شاہ نے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”ہو گیا شاہ جی۔ ہو گیا۔“

فضل شاہ نے سانپ کی طرح سر سرانے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے موبائیل ٹیلی فون پر عنایت باقی سے رابطہ کر رہا تھا جس پر اسی تک گزشتہ روز کے پے در پے واقعات کی وجہ سے لرزہ طاری تھا۔

عنایت باقی کو مطمئن کرنا اُس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یوں بھی اِس نازک مرحلے پر جب کہ بازار میں اس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ عنایت باقی کو فضل شاہ کیسے مضبوط مالی اور جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔

”میرا منشی تیس ہزار روپے لے کر آیا ہے۔ زہرہ کو ہمارے ہاں بھیج دو۔ تم بھی آ جاؤ۔ ذرا تمہاری ہوا بدلی بھی ہو جائے گی اور زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔ میری بات سچو گئی ناں۔“

اُس نے فون پر زہرہ باقی کی ماں کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

”سید بادشاہ تیرے بچے جیٹس۔ مولا کچھ نہال رکھے۔ ہم غریبوں کا بھتیس کتنا خیال ہے۔ میں تیار ہوں۔ منشی کو گاڑھی دے کر بھیجنا ہم دونوں ہی آ رہے ہیں۔“

عنایت باقی نے چال چوسے سے کہا۔

”یہ ہوتی ناں بات۔ شاہباش۔ منشی ابھی پہنچتا ہے۔“

فضل شاہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

گھنٹی مچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو چلی تھی۔ اب وہ ایک اور نمبر ملا رہا تھا۔ یہ اُس کا خاص نمبر تھا۔

”بلا کہاں ہے“

اُس نے سلسلہ ملنے پر پوچھا۔

”حاضر ہے سائیں۔ موجود ہے“

دوسری طرف سے آواز آئی۔

اُسے میری طرف بیچ دو۔ ابھی فوراً۔ احتیاط سے۔ سمجھ گئے ناں“

فضل شاہ نے دوسری طرف ہدایت دی۔

”سمجھ گیا سائیں۔ سمجھ گیا“

جواب ملا۔

بلا اشتہاری مجرم تھا جو دوسرے کسی صوبے کی جیل سے فرار ہو کر اُس کے پاس پناہ

لیئے آیا تھا۔ بتے کے لیے کسی انسان کا قتل کیڑے کوڑے کو مسل دینے سے زیادہ اہمیت

نہیں رکھتا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے اُس نے ریاست شاہ کے پاس پناہ لے رکھی تھی۔

اب فضل شاہ نے اس سے اپنی چھ ماہ کی محنت اور مہانداری کی قیمت وصول کرنا تھا۔

یہ اُن لوگوں کے لیے کوئی نیا کام نہیں تھا۔ نہ ہی بتے اشتہاری کے لیے کوئی مشکل مشن تھا۔

قریباً دو گھنٹے بعد بتے اشتہاری کو اس کے خاص آدمی فضل شاہ کے ڈیرے پر پہنچائے گئے تھے۔

بتے کے لیے یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔

اُس نے اپنی زندگی میں ایسے درجنوں قتل کیے تھے۔ وہ پیشہ ورتا تھا اور اشتہاری

مجرم تھا جسے دیکھتے ہی گوئی مار دینے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ اس صوبے میں وہ

پہلی مرتبہ پناہ لینے آیا تھا۔ فضل شاہ سے اُس کا تعارف جرائم کی زیر زمین دنیا میں ہو چکا تھا۔

جس نے اُسے کہا تھا کہ مشکل کے وقت وہ جب بھی چاہے اُن کے پاس مدد کے لیے آسکے۔

فضل شاہ نے آج سے تین سال پہلے اُسے کہا تھا کہ اُس کی حویلی کے دروازے بنے

کے لیے کھلے ہیں۔

لیکن —

ان کھلے دروازوں کے آگے کیا تھا۔ اس کا احساس اُسے نہ ہو سکا۔ اُس نے نکتوں خاں کو

قتل کرنے کی ہامی بھی اپنے عُسن کا حق نمک ادا کرنے کے لیے بھری تھی۔ جس کے لیے اگلے

روز رات کا پہر مقرر ہوا تھا۔ تب تک فضل شاہ نے اُسے حنیف خاں کی آنکھوں سے

چھپائے رکھا تھا۔

یوں تو اگر وہ حنیف خاں کی آنکھوں کے سامنے بھی موجود رہتا تو انھیں کوئی فرق نہ پڑتا

کیونکہ اُس کو سادوں کے اندھے کی طرح ہر طرف زہرہ بانی کی ہر بابی ہی دکھائی دے رہی تھی۔

جو اپنی ماں کے ساتھ فضل شاہ کی گاڑی میں سرشام ہی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

غایت بانی کو اُس کی بیٹی کی زنگین راتوں کی قیمتِ خلافت توقع زیادہ ادا کی گئی تھی۔

اور یہ امر اس کے لیے مزید باعثِ اطمینان تھا کہ اس کی بیٹی حنیف خاں کے پاس ہی پہنچاتی

گئی تھی۔

فضل شاہ نے اُن کے لیے اپنی حویلی کا ایک مکمل حصہ مختص کر دیا تھا جہاں ضروریات

زندگی کے ساتھ تعیش کے بھی مکمل سامان موجود تھے۔

غایت بانی تو ایک کمرے میں دی سی آر پرفیوں سے ادرا اُس کی بیٹی دوسرے کمرے

میں حنیف خاں سے دل بہلاتی رہی جو شراب اور شباب کے نشے میں اُتنا بہک گیا تھا کہ

دن اور رات کی تمیز بھی اس کے لیے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

فضل شاہ نے اُس کے لیے بطورِ نصابِ دلالتی شراب کی وہ بوتل نکالی تھی جو وہ عام

حالات میں کبھی پینے لگاتا تھا لیکن ایسی چند بوتلیں ریاست شاہ نے ہی اسے اپنے پاس محفوظ

رکھی ہوتی تھیں تاکہ شہر سے اس طرف ددرے پر آنے والے اعلیٰ افسران کو پیش کر سکیں۔

اس بات کا شدت سے ریاست شاہ کو احساس تھا کہ نکتوں خاں اب سمجھی اُن کی

طاہت پر کمر بستہ نہیں ہو گا۔

وہ اصولوں والا بد معاش تھا۔

ساری زندگی اُس نے اصولوں کی بھینٹ چڑھائی تھی۔

ریاست شاہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سرداروں نے نھو خاں کو اُس کی حمایت سے الگ کرنے کے لیے اُس پر ہر ممکن معاشرتی دباؤ ڈالا ہوگا۔

لیکن —

ایک مرتبہ ریاست شاہ سے وعدہ کر لینے کے بعد نھو خاں کے لیے اپنی زبان سے پیر جانا ممکن نہیں تھا۔ ریاست شاہ نے اپنی دانست میں نھو خاں اور اُس کے بیٹے کو بڑے مزہدا نکتے میں جکڑا تھا لیکن، وہ اس تلخ حقیقت کو نظر انداز کر گیا کہ سرداروں کے ساتھ عالم دار جیسا شیطان بھی موجود ہے جو یونین کونسل کی چیز بین شپ پر نظر میں جاتے بیٹھا تھا۔

عالم دار نے دنوں میں ترقی کی تھی —

پولیس کا معمولی حوالدار عالم دار اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے کتا آگے نکل گیا تھا۔ سرداروں کی اچھی خاصی ساکھ بن چکی تھی۔ یہ عالم دار ہی تھا جس نے اس علاقے میں سب سے پہلے بین الاقوامی سمگلنگ کا چکر چلایا تھا۔ اُس نے تین چار کامیاب چکر اپنے بندوں کے ذریعے یورپ کے گوا دیئے تھے جس کے بعد سے اس کے پاس اتنا پیسہ آ گیا تھا جو اُس کا دماغ قزلب کرنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن —

عالم دار جیسے شاطر کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ یہ پرنے پانی ہیں بلکہ سرداروں کی اس بزنس میں نئے نئے آتے ہیں۔ اُس نے سمگلنگ سے اتنا رد پیسہ کمایا تھا کہ اب وہ سیات میں آ جاتا اور ریاست میں آنے کے بعد کوئی اہم پوسٹ حاصل کرنے کے لیے اُس کے راتے میں اگر کوئی دیوار آ سکتی تھی تو وہ ریاست شاہ ہی تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عالم دار کا جھکاؤ شروع ہی سے سرداروں کی طرف رہا —

پولیس میں دس بارہ سال کی نوکری نے عالم دار کو وہ داؤ بیچ سکھا دیئے تھے جو کبھی ریاست شاہ کے دہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔

اب بھی اُس نے ایسا ہی داؤ کھیلنا تھا۔

اس کھیل کے مرکزی کردار حنیف خاں اور زہرہ بائی کے سردوں کو ریاست شاہ بڑی

لہاسیالی سے چلا رہا تھا جب اُس نے اچانک ہی ریاست شاہ کو شرمات دی تھی — !  
ریاست شاہ جانتا تھا کہ عالم دار نے نھو خاں کو پٹی پڑھا دی ہوگی کہ فضل شاہ نے اس

اس کے بیٹے کو ساری زندگی اپنا محتاج رکھنے کے لیے اس چکر میں ڈالا ہے —

اس علاقے میں دشمنی بھلنے کا بہترین طریقہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دشمن کو نشہ لگا دیتے تھے —

ریاست شاہ نے تو اس کے بیٹے کو دو نشہ اکٹھے لگا دیئے تھے۔

حنیف خاں اُس کی واحد اولاد زریزہ تھی۔

نھو خاں اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا جس کا علم بھی انھیں اُس رات ہو گیا تھا جب اس کے گاؤں ہی سے اس کا ایک خاص ہرکارہ رات ڈھلے فضل شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

”شاہ جی — بڑا ظلم ہو گیا —“

جیسے ٹیل نے چھٹتے ہی کہا۔

”کیا مصیبت آگئی ہے — تمھاری ہوا تیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ ڈھنگ سے بات تو کر۔“

فضل شاہ نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی نھو خاں نے آج شام ہی اپنی برادری کی میٹنگ بلوائی ہے۔ جس میں انھوں نے اس ایکشن میں آپ کی حمایت کا فیصلہ واپس لے لیا ہے — اُس کی برادری والے بہت غصے میں ہیں — شاید صبح وہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے۔ وہ حنیف خاں کو فوراً لے جانا چاہتے ہیں — اور ہاں عالم دار اور سردار مرید بھی اس میٹنگ میں موجود تھے —“

جیسے نے اُسے ساری بات سمجھانے ہوتے کہا —

”کوئی بات نہیں جیسے — ہم نھو خاں کے لیے صبح ہونے ہی نہیں دیں گے — تم اپنے بندوں کو تیار رکھنا —“

یہ کہہ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں اُسے کچھ باتیں سمجھائیں۔

”ایسا ہی ہوگا شاہ جی —“

بیچے نیلی نے اُس کی گفتگو کے خاتمے پر کہا

”دیکھنا کہیں بیوقوفی نہ کر لیتا — جو میں نے سمجھایا ہے۔ اس پر صرف بہ حرف نل

ہونا چاہیے“

یہ کہتے ہوئے فضل شاہ نے اپنی الماری کھولی اور نوٹوں کا ایک بندل نکال کر اس کی لڑ بڑھا دیا۔ جیجائنی نوٹوں پر اس طرح لپکا جیسے خارش زدہ گتہ چھپچھپوں پر لپکتا ہے۔

”اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی اس میں سے حصہ دے دینا — اور ایک بات یاد رکھنا کہ تم جو کچھ کرو گے یا کہو گے اُس کی قیمت وصول کر چکے ہو۔ اس کے بعد اگر تمہارے بیان بیا یاتم سرداروں کے کسی چکر میں آتے تو تمہاری دونوں بیٹیاں...“

”نہیں شاہ جی — سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“

اُس نے تڑپ کر فضل شاہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے تم اس وقت نکل جاؤ۔ لیکن جس طرح تمہارے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہیں

ہوتی اسی طرح تمہارے یہاں سے واپس جانے کا بھی کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے — شاباش

اپنے دونوں آدمیوں کو تیار رکھنا کہیں جا کر سونہ جانا — یاد رکھنا جیجے اگر تم سو گئے تو پھر کوئی

نہیں جاگ سکے گا۔“

فضل شاہ نے اُسے دم رخصت آخری وارنگ دیتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — میں کوئی پیچہ ہوں — ہم تو نوکر ہیں آپ کے

بس ایک التجا ہے کہ بعد میں ہمیں عالم داد سے بچاتے رکھنا“

بیچے نے نوٹوں کا بندل اپنے تہہ بند میں مضبوطی سے گاتھ دے کر باندھتے ہوئے کہا۔

”تم بے فکر ہو جاؤ — نتھو خاں کے بعد ہم تمہیں عالم داد کے خطرے سے بھی بچائے

کے لیے بے نیاز کر دیں گے“

فضل شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

نتھو خاں کو ایک لمحے کے لیے چین نہیں آیا تھا۔ نذر محمد نے ہر ممکن کوشش اُسے ٹنڈا رکھنے کے لیے کر لی تھی لیکن وہ اس وقت شاہ پور جانے پر تلا ہوا تھا۔ نذر محمد اپنے بہنئی کی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نتھو خاں اگر اس حالت میں شاہ پور چلا گیا تو اُس کے واپس آنے کے امکانات باقی نہیں رہیں گے۔

نتھو خاں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ فضل شاہ اور اس کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ انہوں نے ایک طرح سے اُس کے بیٹے کو اغوا ہی تو کر رکھا تھا۔

نذر محمد نے اس کا غصہ قدرے ٹنڈا کرنے کے لیے ہی برادری کی میٹنگ طلب کی تھی جس میں اس نے مستقبل کے خدشات کو پیش نظر رکھ کر سردار مرید اور عالم داد کو بھی دعوئی تھی جو اپنے اس کارنامے پر چھوٹے نہیں سہا رہے تھے۔ نذر محمد جانتا تھا کہ اس مرحلے پر اُن لوگوں کو ضرور ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ منجہبی طور پر تو وہ ریاست شاہ کی بدعاشی کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

لیکن —

سردار دربار میں انہیں بہ حال ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ جو سردار دل کی شکل میں ہی اُن کے سامنے موجود تھا۔ تاکہ تھا نے کچھری کے معاملات کو ڈھنگ سے نٹایا جا سکے۔ نذر محمد کو احساس تھا کہ ایک مرتبہ ریاست شاہ کی حمایت کا فیصلہ واپس لینے کے بعد انہیں کس طرح کی مشکلات کا سامنا ہوگا۔

ریاست شاہ سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جا سکتی تھی —

نذر محمد کی طرح نتھو خاں بھی آج اپنے فیصلے پر پچھتا رہا تھا کہ وہ اس ”کبوتر خانے“ میں آکر ہی کیوں — اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ اسے سرحد پر ہی کسی مقابلے میں گولی لگ جاتی۔

اس وقت نتھو خاں میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنی حویلی میں آکر لیٹ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نذر محمد کو ہی ان لوگوں کی چکر بازیوں کا زیادہ ادراک ہے اور وہ اس مرحلے پر۔ جبکہ اُس کا اپنا دماغ توش ہو چکا تھا زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے نذر محمد کی طرف سے اس مجلس میں سردار مرید اور عالم داد کو بلا کر اُن کا شکر یہ ادا کرنے

پر اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔

ایک بات کا البتہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ریاست شاہ نے اُسے نوٹوں کا چور بننے دیا تھا وہ اُسے ضرور واپس کرے گا۔ وہ کم از کم اتنا نہیں گرتا چاہتا تھا کہ اُن لوگوں کی سزا ہی آجاتا۔

نختو خاں رات دیر گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

اُسے نیند شاید رات کے دوسرے پہر میں آتی تھی۔ ساری زندگی اس نے چور کی طرح گزار دی تھی۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کے اصول کا فائل رہا تھا۔ نہ اُس نے سارا زندگی کوئی باڈی گارڈ رکھا تھا نہ ہی اس بات کو کبھی پسند کیا تھا۔

اس گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا گھرانہ تھا جو اس کا ممنون احسان نہ رہا ہو۔ اُس نے اپنے گاؤں کی درجنوں غریب بچیوں کو بیا یا اور اُن کے گھروں کو آباد کر دیا تھا۔ وہ اُن اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دے سکتے تھے۔ اس کی اُن نیکیوں ہی کی وجہ سے آرا تک پولیس کو اس گاؤں میں داخل ہونے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔

جب بھی پولیس نے نختو خاں کے گھر سے چوری کا کوئی جانور برآمد کرنے کی کوشش سارا گاؤں دیوار بن کر پولیس کے راستے میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

لیکن —

اُس نے کبھی ان لوگوں کو یہ اجازت نہیں دی تھی کہ اُس کی حفاظت کے لیے پہرہ دینا شروع کر دیں۔

اُسے اپنی قوت بازو پر کم از کم اتنا بھروسہ ضرور تھا کہ وہ کسی بھی ممکنہ آفت سے نو کو بچا سکتا ہے۔

فضل شاہ کے پاس صرف پانچ چھ گھنٹے کا وقت تھا۔

وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا اسی درمیان کر سکتا تھا —

یہاں سے نختو خاں کے گاؤں کا فاصلہ تو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں تھا لیکن اس

پنپان اگلی رات کا رکھا تھا جبکہ اس خبر نے اُسے فوراً منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا عمل دیا تھا۔ اس وقت اس کا وفادار ملازم عاشق ادب بلا اس کے سامنے موجود تھے۔

”ساری بات سمجھ گئے ناں۔“

فضل شاہ نے عاشق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”بالکل سمجھ آگئی شاہ جی — آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ صبح خوشخبری آپ کو مل

جاتے گی۔“

عاشق نے گردن ہلاتی۔

”ٹھیک ہے شہاباش تم نکل جاؤ۔ یہاں سے رام گڑھ تک پیدل جانا۔ گھوڑی

وہاں سے تھیں مل جاتے گی۔ خیال رکھنا عاشقے! اصل کام تمہارا ہے۔ قتل کے

بد ہی تم نے اصلی کھیل کھیلنا ہے۔ اپنے پیروں پر پکے رہنا۔“

فضل شاہ نے انھیں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

”آپ نے یوں ہی تکلف کیا شاہ جی۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لیے یہ کوئی

مسئلہ نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی کافی تھا۔“

بلتے بد محاش نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

”بلتے تم دلیر آدمی ہو مجھے علم ہے تمہارے لیے نختو خاں کو قتل کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل

تھا لیکن میری جان یہ شہر نہیں۔ یہاں کام بڑے حساب کتاب سے کرتا پڑتا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ معمولی سی غلطی ہو اور ہمیں ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑے۔

تم نے اُسے قتل کرنا ہے۔ باقی سارا کام عاشق کرے گا۔ بس جیسے یہ کہے تم دیئے ہی

عمل کرنا۔“

فضل شاہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا

نختو خاں دیر بعد دونوں اُس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے انھوں نے

گھوڑی لینی تھی۔ اس گاؤں کا فاصلہ یہاں سے آدھے گھنٹے کی مسافت کا تھا۔ گھوڑی چوری

کی تھی اور فضل شاہ کا ایک مقامی مجرم ساتھی گاؤں کے باہر موجود ٹیوب دیل پر گھوڑی

سمیت اُن کا منتظر تھا۔

دونوں ایک ہی گھوڑی پر سوار ہو گئے —

اب عاشق کا کام شروع ہوا تھا جس کے لیے اسے فضل شاہ نے اگے تھمیں پہاڑ

دی تھیں —

عاشق نے گھوڑی کو ایڑ لگائی —

گھوڑی بڑی مضبوط کھٹی کی مالک تھی —

کیا مجال جو اُس نے دونوں کو اس بات کا احساس ہونے دیا ہو کہ اُس پر کئے

موجود ہیں۔ عاشق نے وہ راستہ اپنا یا تھا جو پلوال سے نتھو خاں کے گاؤں کی طرف آ

تھا۔ اس کے لیے اُسے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ بس اٹھوں نے ایک پھرا

چکر کاٹا تھا —

نتھو خاں کا نزدیک ترین گاؤں پلوال ہی تھا —

گھوڑی بچو اب اُس نے ایسے راستے پر ڈالا تھا جہاں وہ اپنے قدموں کے نشان

چھوڑتی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ حملہ آور پلوال کی طرف

آتے ہیں۔

پندرہ بیس منٹ کی مزید مسافت کے بعد وہ نتھو خاں کے گاؤں کے نزدیک

گئے۔ یہاں سے عاشق نے گھوڑی کی چال بدل لی اب وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی

آ رہے تھے۔

گاؤں کے باہر جہاں کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا عاشق وہاں رُک گیا۔ پلوال

تھا جیسے اُسے یہاں کسی کا انتظار رہا ہو —

چند منٹ بعد ہی کھیتوں میں سرسراہٹ ہوتی۔ بٹے کا ہاتھ فوراً اپنے پستول

طرف گیا —

لیکن

عاشق نے اُس کے کندھے پر ہاتھ کا ہکا سا دباؤ ڈال کر اُسے احساس دلایا کہ

دلے اُن کے دوست ہیں اگلے ہی لمحے اس کے سامنے گاؤں کا چوکیدار اور جیاتیلی موجود تھے!

”میدان صاف ہے۔ نتھو خاں باہر والی حویلی کے صحن میں سو رہا ہے۔“

چوکیدار نے جو فضل شاہ کا زرخیز ٹیٹو بن چکا تھا انھیں کہا

”ٹھیک ہے۔ بٹے تم اس کے ساتھ جاؤ۔ جس کی یہ نشاندہی کرے گا۔ اُسے قتل

کرنا ہے۔“

عاشق نے کہا

”چلو۔“

بٹے نے پستول ہاتھ میں تھام لیا اور چوکیدار کے ساتھ نتھو خاں کی حویلی کی طرف چل دیا۔

جو گاؤں کی آبادی کے ایک کونے پر واقع تھی۔ اُس کے لیے یہ امر بے حد باعث تسکین تھا

کہ گاؤں کا چوکیدار بھی اُن کا ساتھی ہے۔ اب اُس کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔

اُن کی روانگی کے قریباً دو منٹ بعد ہی بیجے نے کوئی خاص اشارہ کیا تو کھیتوں سے تین

آدمی اور باہر نکل آئے جنھوں نے ہاتھوں میں مقامی دیہاتیوں کی طرح برچھیاں اور کلہاڑیاں

پکڑ رکھی تھیں —

”انھیں سمجھا دیا ہے ناں۔“

عاشق نے بیجے سے دریافت کیا۔

”بالکل سمجھ گئے ہیں جناب۔“

اُن میں سے ایک نے بیجے کے بجائے جواب دیا۔

”شاباش بڑی ہوشیاری سے سارا کام ہونا چاہیے۔ اور ابھی دو تین روز تک کسی

سے تم میں سے شاہ پور کے نزدیک نہیں پھٹکنا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔“

عاشق نے انھیں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

تینوں نے بیوقوفوں کی طرح سر ہلا دیتے۔

بٹے چوکیدار کی رہنمائی میں بڑے اطمینان سے چلتا نتھو خاں کی حویلی تک آیا تھا چوکیدار

نے حویلی کی چھوٹی سی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ اندر صحن میں چاروں طرف پرنتھو خاں سو رہا ہے۔ اس کی عادت تھی وہ گرمیوں میں صحن میں اکیلا ہی سویا کرتا تھا۔ چھوٹی سی دیوار تلے نے بندر کی سی پھرتی سے پھلانگی اور تلی کی طرح پنجوں پر اندر کر گیا۔

اُس نے صحن میں سوتے نہتو خاں کو حرکت کرنے کا موقعہ دیتے بغیر اس کے جسم پر ہلا پستول خالی کر دیا اور بجلی کی سی تیزی سے باہر کر لپکا۔

اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی چونکہ وہاں سے غائب تھا۔ حالانکہ اُسے جو منظر ہر گھبرا گیا تھا اُس کے مطابق چونکہ وہاں ہونا چاہیے تھا۔

فاترنگ کی آواز سے سارا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ تلے نے اندازے سے اسی سمت بھاگ شروع کر دیا جہاں اُس کے خیال کے مطابق عاشق گھوڑی سمیت موجود تھا۔

ابھی وہ بشکل پندرہ بیس گز ہی دوڑ پایا تھا جب اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی نے شور مچاتے ہوئے اس کے سر پر کلہاڑی کا زور دار وار کیا تھا۔

بلا جکر اگر گر پڑا۔ یہ ججائی تیلی اور اُس کے ساتھی تھے۔ جنہوں نے گاؤں کے باقی لوگوں کے دال

ہمک پہنچنے سے پہلے پہلے کو موت کی نیند سُلا دیا۔  
”ایک گھڑ سوار بھی اس کے ساتھ ہے۔ اُس طرف بھاگا ہے۔“

ججے نے چیخے ہوئے کہا اور کچھ لوگ اُدھر کو بھاگے لیکن اُن کے مطلوبہ جگہ پہنچنے تک گھڑ سوار اُن کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔

بہت سے لوگوں نے اُسے پلوال کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔  
”نہتو خاں قتل ہو گیا۔“

چند منٹ بعد ہی گاؤں کے لوگ ہتھیاروں سمیت باہر کھیتوں کی طرف بھاگے۔ جوشِ غضب سے پاگل ہوتے جا رہے تھے۔ کئی ایک نے تو مردہ تلے کے جسم پر بھی

نکالا تھا۔

سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی تھی کہ دو حملہ آور دن نے نہتو خاں پر حملہ کیا تھا۔ ایک کو تو گاؤں کے لوگوں نے بھاگتے ہوئے مار ڈالا جس کے ہاتھ میں خالی پستول

بھی پکڑا ہوا تھا جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی گھوڑی پر پلوال کی طرف بھاگ گیا ہے۔ علی الصبح ہی وہاں نزدیک دُور کے گاؤں سے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان

سب کو جیسے تیلی کے ساتھی انک انک ٹولیوں میں ایک ہی بات یاد کر دیا ہے تھے کہ حملہ آور پلوال کی طرف سے آئے تھے۔

نذر محمد کا بُرا حال تھا۔ اُس کے ادا مان خطا ہو رہے تھے۔  
لیکن

گاؤں کے کھوجی نے اپنا فرض نہیں بھلایا تھا۔ اُس نے گھوڑی کا کھڑا نزدیک کھیتوں سے اٹھا لیا اور اُسے پلوال تک لے گیا۔

کھوجی نے نہتو خاں کی برادری کو پلوال کی طرف سے اُسی گھوڑی کے آنے کے نشانات بھی دکھا دیئے تھے۔

”سرداروں نے اچھا نہیں کیا نذر محمد“  
ججے نے اچانک ہی بازو دہری تیلی پھینکی۔

اور  
اُس کی توقع کے عین مطابق آگ بھڑک اُٹھی۔

نذر محمد کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی برادری کے لوگ بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے فوراً یہ نذر ختم کر لیا تھا کہ حملہ آور چونکہ پلوال کی طرف سے آئے تھے لہذا یہ قتل بھی سرداروں

تلے ہی کر دیا ہے۔  
نذر محمد کی آواز یہاں کون سُنتا تھا۔

جوشِ غضب میں اندھے درجنوں نوجوان لائٹیاں، برچھیاں اور راتھیں اٹھا کر پلوال کی طرف پلکے۔

ابھی پلوال کے سردار جو اگلے روز کی کامیابی کے نشے میں رات گہری نیند سوتے تھے،



نہند سے بیدار ہی ہوتے تھے جب انھیں فاترنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ اُن کے پیریدار شور مچا رہے تھے کہ گاؤں پر حملہ ہو گیا ہے۔

پہلے تو سردار رشید نے یہی سمجھا کہ شاید حملہ آدرشاہ پور سے آئے ہیں لیکن جب اُسے پتہ چلا کہ اُن کا تعلق ننھو خاں کے گاؤں سے ہے تو اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ لوگ کیا پاگل ہو گئے ہیں۔

سردار رشید نے چاہا تھا کہ حویلی سے باہر جا کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرے۔

لیکن —

سردار مرید اور عالم داد نے اُسے زبردستی روک لیا —

”سردار صاحب یہ ریاست شاہ کی بھڑکائی آگ ہے۔ اس کی طرف ایک قدم بڑھنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ فی الوقت سواتے اپنے دفاع کے اور کوئی چارہ نہیں — مجھے حملہ آوروں کے نعروں سے احسّس ہوا ہے کہ وہ ننھو خاں کی اہل کا بدلہ لینے آتے ہیں — ہم نے کل ہی ننھو خاں سے ہاتھ ملایا تھا — میرا اندازہ ہے کہ ریاست شاہ نے ننھو خاں کو قتل کروا دیا ہے اور اس قتل کا ذمہ دار ہمیں گردانے کا بھی بندوبست ساتھ ہی کر رکھا ہوگا — یہ سازش ہے سردار صاحب ہمیں اس کا حصہ نہیں بننا — آپ باہر مت جائیے — جب تک میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کوشش کرتا ہوں کہ اس ہنگامے کو ٹھنڈا کر سکوں —“

عالم داد نے سردار رشید کو سمجھا یا تو اُسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔

”یہ لوگ اتنے بگڑ سکتے ہیں — اُف میرے خُدا یا!“

بے ساختہ اس کے مُتہ سے نکلا اور وہ نزدیک رکھی آرام وہ کرسی پر ڈبھیر ہو گیا۔

عالم داد مکان کے لُغی دروازے سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے فوراً علاقے کے معززین اکٹھا کر کے حملہ آوروں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

## سازش

جیجے تیلی نے پلوال کی مسجد کے امام اور دوسری مساجد کے مولوی صاحبان کو اس طرف آتے دیکھا تو اندازہ کر لیا کہ یہ بل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آرہی — عین ممکن تھا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا کیونکہ پلوال والی مسجد کے مولانا صاحب کی یہ سارا علاقہ بہت عزت کرتا تھا۔ کم از کم یہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اُن کی بات موڑ سکتا۔

”اور اس معاملے کو یہیں ختم نہیں ہونا چاہیے“

اُس نے سوچا۔

فضل شاہ نے اُسے خطیر رقم دے کر یہ مشن سونپا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ننھو خاں کی برادری کا سب سے عقل مند آدمی اس وقت نذر محمد ہے اور اُسے اب اس بات کا یقین نہیں آسکا کہ ننھو خاں کو سرداروں نے قتل کر دیا ہے یقیناً اس کا ذہن دوسری طرف سوچ رہا ہوگا اور یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ کم از کم اس مرحلے پر نذر محمد ضرور پلوال والوں کی ہاں میں ہاں ملاتے گا اور معاملہ دونوں دیہاتوں کی مشترکہ پنچایت پر چھوڑ کر وقت کو ٹال دیا جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو فضل شاہ اُسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے جیجے کو پیسے آگ بھڑکانے کے لیے دیئے تھے ٹھنڈی کرنے کے لیے نہیں —

کیا کیا جاتے ؟

اُس کے شیطانی ذہن نے جلد ہی اس سوال کا جواب تلاش کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے مجمع میں موجود اپنے تین چار ساتھیوں کو اپنے پاس بلا لیا اور اب آٹھ دس آدمیوں کا ایک گروپ دور پٹھوں میں سوار شاہ پور کی طرف اٹا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے

بظاہر یہی تاثر دیا تھا کہ وہ حنیف خاں کو اس کے باپ کے قتل کی خبر کرنے جا رہے ہیں۔

لیکن —

اصل میں ان کے عزائم کیا تھے؟

نذر محمد کو اس کا گمان بھی نہ ہو سکا ورنہ وہ کبھی انھیں نہ جانے دیتا اور خود اپنے باپ کو لے کر آتا۔ یوں بھی اب بے وقوفوں کے گردہ میں وہی ایسا تھا جو صورتحال کو قابو کرنا۔ اُس نے اپنی یہاں موجودگی کو زیادہ ضروری خیال کیا۔ اگر وہ یہاں سے ہٹ جاتا تو کئی اور لائیش بھی یہاں کر سکتی تھیں۔ اُس کا دل اور دماغ دونوں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ قتل سرداروں نے کروایا ہے کیونکہ اُسے نھو خاں کے قتل میں سرداروں کا کوئی مفاد نظر نہیں دیتا تھا۔ ابھی کل ہی تو انھوں نے نھو خاں کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ پھر انھیں... جیسے نیلی کو علم تھا کہ اگر یہ سازش کامیاب نہ ہوتی تو فضل شاہ اس کی تنکا بوٹی کر دیا گیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ فضل شاہ نے رقم دیتے ہوئے کبھی ہاتھ نہ کھینچا۔

لیکن —

وہ جس طرح کسی کام کے لیے پیسے دیا کرتا تھا۔ اُسی طرح رزلٹ بھی اپنی مرضی کے مطابق چاہتا تھا۔

”حنیف! سرداروں نے نھو کو مار ڈالا“

یہ سنی وہ پہلی آواز جو حنیف خاں کے کانوں میں صور اسرافیل کی طرح بھونکی گئی۔ وہ زہراں بائی کے ساتھ ساری رات رنگ رلیاں منانے کے بعد بڑھی گہری نیند سو رہا تھا جب فضل شاہ کے خاص ملازم نے اُسے بادلِ نحواستہ اٹھایا۔

”کیا قیامت آگئی ہے؟“

حنیف خاں بڑے غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

”حنیف خاں ہماری تو مجال نہیں کہ اس طرح قدم بھی رکھ سکیں لیکن بات ہی اتنی ہو گئی تھی۔ دونوں شاہ صاحب شہر گئے ہوتے ہیں اور تمھارے گاؤں سے دس پنڈروں

آ رہی آتے ہیں۔ وہ اس وقت ملنے پر بند ہیں — کوئی اچھی خبر نہیں“

منشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

فضل شاہ نے اُسے پہلے سے سمجھا دیا تھا کہ اُس نے ڈرامے میں کون سا کردار ادا کرنا ہے۔ دونوں بھائی اپنی حویلی میں موجود تھے۔

لیکن —

گادوں والوں کے لیے دونوں کل شام ہی سے شہر گئے ہوتے تھے تاکہ حنیف خاں کو کسی سازش کا شک بھی نہ گزرے۔ یوں بھی اب اس گھنٹاؤں کی کھیل کا سب سے اہم ایکٹ شروع ہونے جا رہا تھا۔ جسے حنیف خاں کے ہاتھوں انجام پانا تھا۔ انھوں نے یہ سارا کھڑاک حنیف خاں کو گمراہ کرنے کے لیے ہی تو پھیلا یا تھا۔

جیسے ہی حنیف خاں کمرے سے نکل کر حویلی کی بیٹھک میں پہنچا۔ ججاتی اُس سے لپٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”حنیف! گادوں کے لوگ پھال گئے ہیں۔ وہاں لڑائی ہو رہی ہے۔“

اُن شیطانوں میں سے دوسرے نے کہا۔

”کیا ہوا — کیسے ہوا؟“

حنیف خاں کو زمین آسمان گرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نھو خاں کے قتل کی خبر سنا کر جیسے جیجے تیلی نے گھنٹا ہراسیہ اُس کے کانوں میں اُٹھیل دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے، کدھر جائے؟ اس علاقے میں کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت ہو گی کہ وہ نھو خاں کو، اُس کے باپ کو قتل کر ڈالے؟

اُس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا۔

”کس نے مارا میرے باپ کو —“

اُس نے چیختے ہوئے پوچھا

”حنیف خاں ہم نے قاتل کو مار ڈالا ہے — ہم اتنے بے غیرت نہیں کہ نھو خاں کے

قاتل کو زندہ بچ کر جانے دیتے۔ اُس کا گھرا اٹھایا ہے کھوجی نے۔ قاتل کسی دوسرے علاقے کا رہنے والا ہے لیکن وہ پلوال کی طرف سے آیا تھا۔ گھوڑی کا گھرا اُدھر ہی رہا ہے۔“

تیلی نے زہر نشانی کی۔

”چلو۔ میں سالوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ان کی نسل ہی ختم کر دوں گا۔ میں اُس نے جنون اور غصے کے عالم میں سرداروں کو مختلفات کہنی شروع کر دیں۔“

”حنیف خاں تمہارا اس طرح اکیلے جانا ٹھیک نہیں شاہ صاحب...“

منشی نے بڑی مکاری سے کہنا چاہا۔

”منشی ہٹ جا پرے۔ یہ میرا اور سرداروں کا معاملہ ہے۔ اس میں کوئی تیر نہ آتے۔“

حنیف خاں نے تہراؤ دونظروں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا:

”اس طرح خالی ہاتھ نہ جاؤ حنیف خاں۔ تم نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحب مجھے کئے

موت مراد دیں گے۔ اگر انہیں علم ہوا کہ میں نے تمہیں اس طرح جانے دیا ہے۔“

آدمیوں کی ضرورت ہو تو۔۔۔“

منشی نے اگلا پانسہ پھینکا۔

”نہیں منشی۔ ہم کیا مر گئے ہیں؟“

اس مرتبہ اُس کی بات کا جواب حنیف خاں کے بجائے جیسے نے دیا۔

”اچھا یہ رکھ لو۔ کام آئے گا۔“

یہ کہتے ہوئے منشی نے اپنے کمر سے بندھا ۳۸ پور کا ریوالور اور گولیوں کا پورا پورا

کر حنیف خاں کو تھا دیا تھا۔

اس نے اپنی دانست میں حنیف خاں کے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی

اور بڑی مکاری سے ایک ایک مہرہ بڑا سوچ سمجھ کر یہ ساری بازی کھیلی تھی۔ منشی کو علم

کہ فضل شاہ کے فریدے ہوتے یہ لوگ جو اُسے درغلانے کے لیے آتے ہیں حنیف خاں

یہاں سے سیدھے پلوال لے جائیں گے۔

ریوالور اُس کے پاس موجود ہے وہ یقیناً آتش انتقام سے اندھا ہو کر سرداروں

پر حملہ کرے اور مقابلے میں مارا جائے گا۔

خس کم جہاں پاک جو ریوالور اُس سے برآمد ہوگا وہ غیر قانونی تھا اور اس کا کوئی

ریکارڈ نہیں موجود نہیں تھا۔ کسی کو علم نہیں ہوگا کہ اس نے اسلحہ کہاں سے حاصل کیا ہے۔

لیکن

منشی کو علم نہیں تھا کہ مکافات عمل بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اس مرتبہ اُن کا مقابلہ

نذر محمد جیسے گھاگ آدمی سے تھا۔ جس نے ساری زندگی ریاست شاہ کے بزرگوں کے ساتھ

سبر کی تھی اور ان کی ایک ایک رمز سے آشنا تھا۔ نذر محمد جانتا تھا کہ ریاست شاہ نے دونوں

باپ بیٹا کا صفایا کرنے کے لیے بڑا خطرناک جال بچھا دیا ہے۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک

کو زندہ رکھ کر اُن کی برادری کو نہیں درغلا سکتا تھا۔

اُسے اپنے قبیلے کے اگلے سردار کو اس سازش سے بچانا تھا۔ ورنہ حنیف خاں کی نسل کا

نام دشمن ہی مٹ جاتا۔

اس وقت نذر محمد اُس کے تین چار ساتھی امام مسجد کے ساتھ سرداروں کی حویلی میں موجود

تھے۔ انہوں نے گاؤں کے نوجوانوں کو سمجھا اُٹھا کر واپس بھیج دیا تھا۔ کیونکہ سرداروں کی تشکلوں پر

ایک نفر ڈالنے سے نذر محمد کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کر دیا۔

امام صاحب نے اپنی ضمانت دیتے ہوئے نذر محمد سے کہا تھا کہ اگر کبھی مستقبل میں یہ

الزام سچ ثابت ہوا تو وہ خود کو بطور مجرم نذر محمد کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں

”میاں جی۔ وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ ساری سازش انہیں حرامیوں کی ہے لیکن

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم حنیف خاں کو اس کا شکار ہونے سے کیونکر بچائیں گے کیونکہ

گزرتی تھی اور اس کے بندے اُسے اطلاع دیتے چلے گئے ہیں۔ اگر یہ سازش ہی ہے تو یقیناً

اُن لوگوں کا اس میں اہم کردار ہوگا اور اب وہ حنیف خاں کو مردانے کے لیے اس طرف

بھیج دیں گے۔“

نذر محمد نے تشویش ظاہر کی۔

”نذر محمد تم صرف ایک بات ذہن پر زور دے کر سوچو کہ قاتل کو تمہارے گاؤں میں کن لوگوں نے بھانگتے ہوئے قتل کیا۔ میرے خیال سے وہی لوگ اس سازش میں شریک ہیں۔ کیونکہ قاتل کو اگر زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو وہ کچھ بتا سکتا اور اس سازش کی سمجھ آجاتی۔ اُسے شاید مارا ہی اسی لیے گیا ہے کہ سازش کرنے والے اس کھیل کو انجام تک پہنچا دیں۔“

عالم داد نے پوچھا۔

نذر محمد کو یاد آگیا کہ قاتل کو اُس کے گاؤں کے تیلی احاطے کے باہر قتل کیا گیا تھا اور

قتل کرتے والے بھی عزیز تیلی کے رشتہ دار ہی تھے۔

”یہی لوگ تھے جو اب شاہ پور گئے ہیں۔“

نذر محمد نے کہا

”چلو اٹھو پھر دیر نہ کرو۔ اب اس عذاب کو ٹالنے کی صرف ایک ہی ترکیب برتا

سمجھ میں آتی ہے۔“

عالم داد نے کہا۔

”کیا؟“

نذر محمد اور اُس کے ساتھیوں نے بے چینی سے پوچھا

”ہم پولیس کے ذریعے ہر ممکن کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح حنیف خاں کو قافلو کو روانہ

ہیں حوالات میں اس سے ملاقات کر کے اُسے ساری بات سمجھانے کی کوشش کریں گے

اس وقت اس کا دماغ گرم ہے اور اُسے کچھ سمجھایا نہیں جاسکتا۔ اس مرحلے پر وہ سمجھانے والا

کو بھی اپنا دشمن خیال کرے گا۔ اس درمیان ہم عزیز تیلی کو قافلو کریں گے پھر اس سے

ساری حقیقت اُگلوا کر اُسے حنیف خاں کے سامنے پیش کر دیں گے۔“

عالم داد نے اپنا منصوبہ بتایا۔

سب نے اُس کی طرف مستحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

دوسرے ہی لمحے سردار رشید فون پر ایس پی سے رابطہ کر رہا تھا۔

ایس پی صاحب اُن کے رشتے کے عزیز تھے۔ سردار رشید نے مختصراً بات سمجھا کر اُن سے مدد طلب کی تھی اور ایس پی صاحب نے پلوال کے گرد موجود دونوں تھانوں کو دائرہ لیس کے ذریعے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ کسی ممکنہ بد مزگی سے بچنے کے لیے شہر سے ریزر د پولیس بھی اُس طرف روانہ کر دی تھی۔

حنیف خاں فضل شاہ کے ڈیرے پر بندھی ایک گھوڑی پر ہی آندھی اور طوفان کی رفتار سے پلوال کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ عزیز تیلی اور اس کے ساتھی بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ اس سے پیچھے رہ گئے تھے۔

اس وقت دن قریباً طلوع ہو چکا تھا۔

جوش انتقام میں گمراہ حنیف خاں کے دماغ پر ایک ہی دُھن سمائی تھی کہ وہ اپنے باپ کی میت کو تب ہی کندھا دے گا جب اس کے قاتلوں کو کفر کردار تک پہنچا دے۔ پلوال سے کچھ فاصلے پر اس نے راستہ بدل لیا تھا۔ اور اب کھیتوں کے سلسلے میں داخل ہو گیا تھا۔

لیکن

دوسری طرف بھی مکمل تیاری کی گئی تھی۔

جیسے ہی وہ اس کپے راستے پر چڑھا جو یہاں سے سیدھا سردار رشید کی جوہلی کی طرف جاتا تھا اچانک ہی راستے کے دونوں اطراف چھپے پولیس کے جوانوں نے اسے لٹکایا۔ حنیف خاں کے لیے اس طرح گھرے میں آجانا کوئی ایسی نئی یا انورنی بات نہیں تھی لیکن اس وقت دن چڑھا ہوا تھا اور اس نے ایک لمحے ہی میں اطراف کی صورت حال کا اندازہ کر کے دیکھ لیا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ باقی نہیں بچی۔

”شاید سرداروں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کا انتقام لینے آئے گا۔ اس لیے بڑوں نے پولیس کو بلا لیا ہے۔“

اُس نے سوچا اور رُک گیا۔

پولیس کے جوانوں کو شاید اُس سے متعلق خصوصی ہدایات دی گئی تھیں انہوں نے شاہ کے لہجے کی غفلت دکھائے بغیر بجلی کی سہی پھرتی سے اُسے قابو کر لیا۔ پولیس کے جوانوں نے اُسے اپنی جیب میں بیٹھا لیا تھا اور اب اُسے مقامی تھانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ تھانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں دیوانہ وار چبھتے ہوئے حنیف خاں سرگودھا کو بزدلی کے پلٹے دیتے ہوئے مغفلات بکنا رہا۔

غصے اور غم سے اُس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اس کا ذہن ماؤت ہو چکا تھا اور اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں کی گرفت سے کس طرح نکل کر پلوال تک پہنچے اور اپنا باپ کے قانون کو کئی کر دار تک پہنچائے۔

عین ان لمحات میں جب پولیس کے جوان حنیف خاں پر قابو پانے کے بعد اُسے تھانے کی طرف لے جاتے ہوئے وائر لیس پراسیس پی صاحب کو کامیابی کی خبر دے رہے تھے۔

اس "خصوصی آپریشن" کے دوسرے حصے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔

عزیز تیلی اپنی دانست میں بڑا معرکہ مارنے کے بعد مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ انہوں نے فضل شاہ کے منصوبے کے مطابق حنیف خاں کو قربانی کا بکرا بنا کر پلوال کی طرف روانہ کر دیا تھا اور اب اُس کی موت کی خبر سننے کے لیے گاؤں جا رہے تھے تاکہ یہ خبر سننے کے بعد فضل شاہ سے دوبارہ انعام حاصل کر جائیں۔

آنے والے حالات سے بے فکر عزیز تیلی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ پیلو گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے دونوں گھوڑوں کی باگیں ختم رکھی تھیں اور اب اپنی کامیابی پر تھمتے لگاتے آ رہے تھے۔ جب اچانک ہی یہ قیامت اُن پر ٹوٹ پڑی اُن کی تعداد اٹھ تھی۔

اٹھ مسلح آدمیوں نے اُن کی طرف بندوقیں تانی ہوتی تھیں۔ اُن کے چہرے بندھے کپڑوں کی وجہ سے اُن میں سے کسی کو بھی ابھی تک عزیز تیلی اور اس کے ساتھیوں

نیں پہچانا تھا۔

"کیا حال ہے جیسے۔ آگے شاہ پور سے اپنا کام کر آئے۔

اچانک ہی ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔

آواز اُن کی پشت سے بلند ہوتی تھی۔ یہ سردار مرید تھا۔ جواب اُن کے سامنے

آگیا۔

عزیز تیلی کو اپنے وجود سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے حملہ آوروں کے حکم پر اپنے ہاتھ اور پراٹھائے ہوتے تھے اور اُن لوگوں نے اب تیلیوں کی تلاش لے کر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ اُن کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہے۔

"سردار صاحب اس حرکت کا کیا مطلب ہے۔"

عزیز تیلی نے سنہیل کر کہا

"حرام خور میں نے تجھے رشتہ دار بنانے کے لیے تو یہاں نہیں گھیرا۔ مطلب بتانے

کے لیے ہی تجھے ہم اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ تجھے ایسا مطلب سمجھائیں گے کہ تیری آنکھیں کھل جائیں گی۔ تو کیا سمجھتا تھا کہ فضل شاہ کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہت زیادہ نقل مند ہو گیا ہے۔"

سردار مرید نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"سردار صاحب ہم غریب آدمی ہیں۔ ہمیں سیاست سے کیا لینا دینا۔ ٹھیک ہے

ہم نے اپنے گاؤں کے دوٹ نہتو خاں کے کتے پر شاہ صاحب کو دینے کا فیصلہ کیا ہے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ..."

"اِسے ڈالو جیب میں ذرا میں اسے مطلب تو سمجھا دوں۔"

سردار مرید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا

سردار مرید کے ساتھیوں نے جیسے تیلی کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھا کر کچھ فاصلے

پر لکڑی جیب میں پھینک دیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں کو وہ ایک دوسری جیب میں لے

گئے۔ اُن کی دونوں گھوڑیاں بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔

بیچے تیلی کو سردار مرید کے ڈیرے پر بیچا دیا گیا تھا جہاں اس کی نظر سب سے پہلے  
حوالدار عالم داد کے چہرے پر پڑیں اور اُسے یوں لگا جیسے موت کے فرشتے نے اس کی  
رُوح قبض کر لی ہو۔

عالم داد کی موجودگی کا مطلب سوائے اس کی کبھی کے اور کچھ نہیں تھا۔ عالم داد نے پھر  
اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس طرح اطمینان کا اظہار کیا تھا جیسے وہ اسی کے لیے یہاں  
موجود تھا اور اب اس کی محنت اس آگئی ہو۔

”اٹا لٹکا دو۔ میں اسے پہلے مطلب ہمارے سمجھا دوں پھر کوئی اور بات کرتے  
سردار مرید نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

جنھوں نے دوسرے ہی لمحے پیچھے چلا تے عزیز تیلی کے دونوں پاؤں ایک مضبوط  
رستی سے باندھے اور اُسے ایک مضبوط شہتیر کے ساتھ اٹا لٹکا دیا۔

”اب ذرا اس کی مالش کرو پہلے اس کا دماغ ٹھکانے پر آجالتے پھر اس سے بات  
کرتے ہیں“

اس مرتبہ عالم داد نے کہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اُلٹے لٹکے بیچے تیلی پر جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش شروع ہوئی  
ان لوگوں نے پیچھے چلا تے عزیز تیلی کی چند منٹ ہی میں اس طرح مالش کی تھی کہ  
اس کے ہوش و حواس ہی گم ہو گئے تھے۔

مشکل تین چار منٹ بعد ہی وہ چیختے چیختے خاموش ہو گیا۔

عزیز تیلی بے ہوش ہو چکا تھا۔

عالم داد کے اشارے پر سردار مرید کے آدمیوں نے اُسے زمین پر لٹا کر اس  
مٹہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اُسے ہوش میں لے آئے۔

ہوش میں آتے ہی عزیز تیلی نے دوبارہ چیخنا چاہا۔

لیکن —

اس مرتبہ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ اس کے جسم سے درد کی ٹہنیں  
اٹھ رہی تھیں اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر اس کے ساتھ ان لوگوں نے ایک  
آدھ مرتبہ اور یہ سلوک دہرا دیا تو شاید وہ مر ہی جاتے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اُسے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟

کہیں ان لوگوں کو شک تو نہیں ہو گیا کہ اس سازش...؟

اس سے آگے اُس کے ذہن نے کچھ سوچنے سے انکار کر دیا۔ اگر ان لوگوں کو عزیز تیلی  
کے کروت کا علم ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ لوگ اُسے چھوڑیں گے نہیں اور اُس  
سے سچائی اُگلوا کر ہی رہیں گے۔

”میرا کیا گناہ ہے؟“

اُس نے کپکپاتے ہوتے دریافت کیا۔

”اچھا اب تمہیں تمہارا گناہ بھی ہم ہی بتائیں گے۔ گویا تمہیں ابھی تک جوتے کھانے کی  
دربھی سمجھ نہیں آتی۔“

عالم داد نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوتے کہا

”اسے ایک کوز اور کر دو“۔ ابھی اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آیا۔

سردار مرید نے اپنے ساتھیوں سے کہا

”خدا کے لیے مجھے نہ مارو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔“

بالآخر عزیز تیلی کو عقل آ ہی گئی۔

”اب ہوتی نال بات۔ اب سچ بتاؤ کہ تمہارے باپ فضل شاہ نے کیا  
کلمہ بنائی تھی۔“

عالم داد نے اسے پیاز کھانے والے بچے میں پوچھا

”میں بالکل بے قصور ہوں جناب۔ مجھے کچھ علم نہیں ہمیں تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ ہم  
نے قاتل کو زندہ نہیں جانے دینا اور یہی کہنا ہے کہ قاتل پلوال کی طرف سے آیا تھا اور  
غیظ خاں کو درغلا کر آپ پر حملہ کر دانا تھا۔“

عزیز تیلی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا —

نقوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ نذر محمد کو وہاں لے آئے۔ نذر محمد کے ساتھ گاڈل کے دس اور معززین بھی تھے جن کے سامنے عزیز تیلی نے بالتفصیل ساری واردات بیان کر دی۔ وہ قاتل کا اتنا پتہ تو نہیں بتا سکا۔

لیکن —

اس کا اندازہ تھا کہ قاتل کوئی مفرد بدعاش ہوگا۔ ایسے لوگ اکثر فضل شاہ کے پاس پناہ کے لیے قیام کیا کرتے تھے کیونکہ اس علاقے کا سب سے بڑا رستہ گیر وہی تھا جن سے پھر وہ اپنی مرضی کے مطابق ایسے کام ہی لے لیا کرتا تھا۔

نذر محمد اور دیگر معززین کے سامنے عزیز تیلی اور اس کی برادری کے لوگوں نے سارا کچھ بیان کر دیا تھا۔ نذر محمد کے ساتھی تو انھیں دہیں مار دینے پر تھے ہوتے تھے۔

لیکن —

انہوں نے سرداروں کی درخواست پر انھیں فی الوقت کچھ نہیں کہا اور اپنے ساتھ گاڈل لے گئے۔ سردار رشید نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کامیابی کی صورت میں وہ اصلی مجرموں سمیت سب کو کفر کر دینا تک پہنچا کر ہی دم لے گا۔ اُس نے فی الوقت عزیز تیلی اور پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ فضل شاہ اُس کی گواہی پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

حنیف خاں سے نذر محمد کی ملاقات تھا نے کی حوالات میں ہوتی تھی۔ جہاں وہ گاڈل کا بہت سے معزز بزرگوں کے ساتھ آیا تھا اور ان لوگوں کی ضمانت پر ہی تھا نذر نے حنیف کو اپنے باپ کے جنازے میں شمولیت کی اجازت دی تھی۔

حنیف کا غم و غصے سے بڑا حال تھا۔

اس کی حالت سرکس کے بے گرفتار کیے گئے جنگل کے اس خطرناک شیر کی سی ہوتی تھی جسے حال ہی میں ہانکا کرتے کے بعد قابو کیا گیا ہو اور جس کے اندر ابھی تک جنگل کا پتہ درندگی موجود تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سرداروں کے گھروں سمیت نیست و نابود کر ڈالا

تھانے سے پوری گارڈ اس کے ساتھ آئی تھی۔

اپنے گھر پہنچنے تک وہ خاموش رہا۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا ضمیر اتنی شدت سے جاگا تھا کہ وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ماموں نذر محمد کے سامنے بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اس بات کی قسم کھائی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں کی ساری نسل ختم کر دے گا۔ اس کے نزدیک اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی اب بھی ایک صورت باقی رہ گئی تھی۔

جب پہلی مرتبہ نذر محمد نے اُس کے باپ کی لاش کے سر ہانے بیٹھے ہوتے اُسے بتایا کہ جنہیں وہ اپنے باپ کے قاتل سمجھ رہا ہے وہ تو اس کے محسن ہیں تو حنیف خاں کا بھی چاہا کہ اپنے ماموں کا منہ نوج لے لے

لیکن —

وہ خاموش رہا —

کیونکہ یہاں موجود اور لوگ بھی یہی کہانی سنا رہے تھے۔ شام کو اپنے باپ کی میت دفنانے تک اُس کو ان لوگوں نے کم از کم اس بات کا یقین دلادیا تھا کہ نقوڑاں کو سرداروں نے قتل نہیں کر دیا۔ شام کے بعد جب حنیف خاں اپنی روتی بین کرتی ماں کو اکیلے چھوڑ کر تھانے کی طرف واپس جا رہا تھا تو نذر محمد اور گاڈل کے معززین کا جلس بھی اُس کے ہمراہ تھا — یہاں تھانے کے صحن میں پہلی مرتبہ جب ارد گرد کے دیہاتوں کے سرکردہ لوگوں کی پختہ اکٹھی ہوئی اور تھا نذر کی موجودگی میں جب ان لوگوں نے عزیز تیلی کو پیش کیا تو حنیف خاں کی آنکھیں کھلیں۔

عزیز تیلی نے اُسے ساری کہانی سنا دی —

اب حنیف خاں کو علم ہوا کہ آخر ریاست شاہ اور اُس کا بھائی اُسے خود سے الگ کیوں کر رہے تھے اور اصل میں اُس کے دشمن کون تھے؟ اُسے رہ رہ کر اس بات کا غم کھاتے جا رہا تھا کہ اُس کے بہادر اور غیرت مند باپ کو محض اس کے کرتوتوں کی وجہ سے موت کے منہ میں جانا پڑا۔ اگر وہ بیستہ کی طرح اپنے باپ

کی بات پر عمل پیرا ہوتا تو شاید اس سائے سے بچ جاتا۔

”فضل شاہ — تو نے حنیف خاں اور اُس کے باپ کی دوستی ہی دیکھی تھی۔ اور تو میری دشمنی دیکھے گا فضل شاہ — میں تجھے نیرے ہی ہتھیاروں سے قتل کروں گا۔“

اس نے دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے کہا

اس سارے قصے میں اُسے زہراں بانی پھر بے قصور نظر آ رہی تھی۔ زہراں کے مشتعل کی عقل پر صحیح معنوں میں پردہ ڈال دیا تھا۔

اگلے روز صبح تک سردار مرید اور اس کے ساتھی خود تھانے پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے قرآن پڑھتے دے کر اس بات کی شہادت دے دی تھی کہ اُن کا نھتوں خاں سے کبھی کوئی تنازعہ نہیں رہا تھا اور یہ تھی بھی حقیقت کہ نھتوں خاں نے اُن کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا اور فضل شاہ اور ریاست شاہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

دو پہر تک انھوں نے حنیف خاں کو رہا کر دیا تھا۔

حنیف خاں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا صرف تلاشی لینے پر اُس سے ایک ناجائز پستول برآمد ہوا تھا۔ جو سردار رشید کے ایک ملازم کے کھاتے میں ڈال دیا گیا جس کی ضمانت بھی ان لوگوں نے قبل از گرفتاری ہی کر والی تھی اور اب وہ سردار مرید کی جیب میں اپنے گاڈا کا طرف جا رہا تھا۔

اُس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی احاطہ تپتی کے تمام میکان اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اُس سے اگلے روز ہونے والے نھتوں خاں کے قتل کے اخراجات سرداروں نے زبردستی ذمہ لیے تھے۔ انھوں نے نھتوں خاں کی باقاعدہ پختہ قہر تعمیر کروانے کے لیے شہر سے قابل مزہ اور سنگ مرمر کے پتھر منگواتے تھے اور اس کی قبر پر نھتوں خاں شہید درج کو داکرا اپنی دانت میں اُسے مزاد کی شکل دینے کی کوشش کی تھی۔

ایک سیفہ تک حنیف خاں بے سدھ ہو کر کھڑا رہا۔

اس درمیان روزانہ سرداروں کی طرف سے خیرات کی دیکھیں نھتوں خاں کی روح کو زندہ پہنچانے کے لیے تقسیم کی جاتی رہیں اور گرد و دیہاتوں کے ہزاروں غریبوں نے یہ نیا کارخانہ

نھتوں خاں کے لیے دعائیں مانگیں۔ قرآن خوانی کا سلسلہ امام صاحب کی نگرانی میں آگ سے مسلسل جاری رہا اور اب حنیف خاں کو یقین ہو گیا تھا کہ سردار اُس کے ہمدرد اور فضل شاہ اُس کا دشمن تھا۔

وہ جانتا تھا پولیس کی اتنی ہمت بھی نہیں کہ عزیز تیلی کے بیان پر ریاست شاہ سے کچھ پوچھ گچھ ہی کر لے۔ وہ بے پناہ اثر و رسوخ کا مالک تھا اور کم از کم کسی کے بیان کو دلیل بنا کر کوئی پولیس آفیسر ریاست یا فضل شاہ کے وارنٹ گرفتاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا باپ ایک جوانمرد تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جب تک اپنے باپ کے خون کا فرض نہیں چکلتے گا۔ کبھی چین کی نیند نہیں سو سکے گا۔ اُس کے ماموں نذر محمد کو اس کی پل پل بدلتی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

نذر محمد کی زمانہ ساز نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ حنیف خاں کے اندر کیا جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر حنیف خاں ایک مرتبہ ہاتھ سے نکل گیا تو زندہ واپس نہیں لوٹے گا اور اب اس خاندان کی اگر کوئی امید تھی تو یہی تھی۔

اُس کی خواہش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو نھتوں خاں کی آخری خواہش پوری کرتے ہوئے اس کے بیٹے کی شادی حنیف کی بیوی بھی زاد صغراں سے کر دے جو بچپن ہی سے حنیف سے منسوب کر دی گئی تھی۔

لیکن

حنیف کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

اُس روز رات دیر گئے جب اُس نے اپنی حویلی کی بیٹھک پر ایک مانوس سی دستک لگی تو چونکے بغیر نہ رہا۔

یہ کون تھا جو اس طرح چوری چھپے حویلی کے اندر گھس آیا تھا اور اب بڑے رازدارانہ انداز میں دستک دے کر اُسے بیدار کر رہا تھا۔

اپنے سر ہانے دھرے پستول کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اچانک دروازہ کھول دیا۔ بیٹھک کے باہر چلنے والے بلب کی روشنی میں جب اس کی نظر



اپنے سامنے کھڑے نوجوانوں پر بڑی تعجرت اور خوشی سے ایک لمحے کے لیے تو اس کی زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پستول بستر پر پھینکا اور دونوں ہاتھیں بچوں کو باری باری دونوں سے لپٹ گیا۔

”تم“

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا

یہ دونوں کھٹے سانس کے بیٹے تھے۔ اس کے باپ کے دیرینہ دوست کے بیٹے جنہیں کھٹے سانس نے اپنے یار کی تعزیت کے لیے بھیجا تھا۔  
”تم لوگ۔ جچی۔ تم کیسے، کب آتے؟“

حنیف خاں بقتاری سے اُن کے بازو ہلا ہلا کر اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ خواب تو نہیں دیکھ لیا۔

”نیفے! انتھو خاں صرف تیرا باپ ہی نہیں تھا۔ ہمارا بھی کوئی رشتہ تھا اس سے۔ اُس نے ہماری دو بہنوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔ ہم چھ بھائی ہیں نیفے۔ میری ماں نے ہم دونوں کو اپنی دھاری بخش کر یہاں بھیجا ہے۔ ہم پر کھانا پینا حرام ہے جب تک کہ ہم اپنے باپ کا بدلہ نہ لے لیں۔ ہمیں برسوں ہی خبر ملی تھی کہ چاچے کو کسی نے قتل کر دیا۔ ادھر سے کچھ لوگ گئے تھے انہوں نے بتایا۔ تب سے اب تک ہماری ماں نے ایک نوالہ روٹی کا نہیں کھایا۔ میرے باپ کی آتما کو چین نہیں آتے گا۔ جب تک ہم اپنے چلچے کا بدلہ نہ چکا دیں۔ نیفے۔ ہم مر نہیں گئے تھے۔ ساری زندگی اس بات کا دکھ ہے گا کہ تو نے ہمیں خبر نہ کی۔ ہم انتھو خاں کا جنازہ نہ اٹھتے دیتے جب تک اس کے قاتل کا جنازہ بھی اس کے ساتھ نہ اٹھتا۔ تو نے ہمارے ساتھ ایک بھائی ہو کر ظلم کیا۔ ارے، دو دم گئے تو کیا ہوگا۔ ابھی چار باقی تھے۔ اور پھر ہم تھے ہی کتنی دور۔ بس دو میل کی فاصلہ پر۔ تو نے کیا سمجھ لیا تھا کہ ہمارے باپ کھٹے سانس کی موت سے سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ ارے! ابھی ہم زندہ تھے۔ ہم تو نہیں مر گئے تھے۔“

جچی اور تزووک بچوں کی طرح سسکیاں لیتے اُس سے لپٹ گئے۔ حنیف خاں کو آج پہلی مرتبہ دل کھول کر رونے کا موقع ملا تھا۔ اُس نے دونوں کے ساتھ مل کر اپنے باپ کی جُدائی کا ماتم کیا اور خود پر لعنت ڈالی کہ اُس کے زندہ ہوتے ہوتے اُس کے باپ کے قاتل زندہ گھوم رہے تھے۔

لیکن —

وہ بھی کیا کرتا؟

اس درمیان نذر محمد سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکا رہا تھا۔ اُس کی ماں نے متحدہ مرتبہ اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کی تھی کہ وہ اپنے خاندان کی واحد امید ہے اور اس کا کوئی بھی غلط قدم اس کے خاندان ہی کا نام و نشان مٹا دے گا۔

کیا یہ سب دلائل اس کے لیے کافی تھے؟

اُس نے سوچا۔

اور —

زندگی میں پہلی مرتبہ شدت سے اُسے اپنی بزدلی کا احساس ہوا۔ اس کا باپ سچ کہا کرتا تھا کہ عورت کی صحبت اور شراب کی رغبت مرد دل کو بزدل بنا دیا کرتی ہے۔ اُس نے تو ایک ہی وقت میں دونوں بُرائیاں اپنائی تھیں۔

”تزووک ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی میرا خون اتنا بے غیرت بھی نہیں ہوا کہ باپ کے قاتلوں کا حساب کتاب سرکار و دربار پر چھوڑ دوں۔ میں تو رسومات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب میں خود یہ قرض چکاؤں گا۔“

اُس نے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔

”نیں حنیف خاں — اکیلے نہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی زندگی میں تمام بڑے کام اٹھائے ہیں۔ اب تو اکیلا کیوں جائے گا۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے یا نہیں۔“

تیسرے اور چارے باپ کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہ ہی آخر کو ایک رشتہ تو تھا۔ اور تو جانتا ہے کتنا مضبوط — !

تروکی نے کہا۔

”شاید ماں آرہی ہے۔ اُس کے سامنے انتقام کی کوئی بات نہ کرنا۔ سمجھ گئے ناں۔  
حنیف خاں نے دوسرے کمرے میں آہٹ محسوس کر کے دونوں سے کہا اور دونوں پر  
ہو کر کھڑے ہو گئے۔

اصتری دوسرے کمرے میں گفتگو کی آواز سن کر آئی تھی۔ اُسے باتوں کی سمجھ تو نہیں آتی  
لیکن آوازیں جانی پہچانی دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ تک تو وہ دم سادھے بیٹھی رہی  
اس سے مزید ضبط نہ ہو سکا تو ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوتی اب وہ اپنے بیٹے کے کمرے  
طرف جا رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھٹے پر اس کی نظر کھٹے سانس کے لڑکوں پر پڑی تو بے اختیار اس  
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ قبل از تقسیم سے اس خاندان سے آشنا تھی۔ دونوں ”چاچی ماہار  
لگاتے اس سے پیٹ گئے۔

کانی دیر تک کمرے کی فضا سو گوار رہی۔

حنیف خاں نے کبھی زندگی میں اپنی ماں کو اتنی باتیں کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ ہانسی  
ایک حوالہ دہرا کر خود بھی رو رہی تھی اور انھیں بھی رلا رہی تھی۔

صبح تک وہ اُن سے باتیں کرتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز  
ہوتی تو نماز پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

روانگی سے پہلے اُس نے اپنے بیٹے کو سختی سے تاکید کی تھی کہ ان دونوں کو گاؤں  
نہ جانے دے۔

”بیٹا! تمہارا باپ زندہ تھا اور بات تھی۔ اگر خدا نخواستہ ان کے ساتھ کچھ  
روز قیامت میں اُسے اپنی شکل نہیں دکھا پاؤں گی۔ اُس نے ساری زندگی ان میں اور  
درمیان کوئی فرق نہیں سمجھا۔ کھٹے کی موت پر دس دن وہ سرحد پار رہا تھا۔ پورے  
دن —“

اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

## انتقام

عزیز تیلی کی گرفتاری اور سرداروں کی طرف سے ننھو خاں کی موت کے بعد کی روایات  
میں بھرپور شرکت کی اطلاعات ملنے کے بعد سے ریاست شاہ کو خاص تشویش لاحق ہوئی تھی۔  
اُسے اچانک ہی پانسہ پلٹنے کا احساس ہوا تھا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا جن کی اطلاع اُسے ملی تھی  
تو اس کا مطلب ریاست شاہ کے لیے بے پناہ مصائب کے اندر کچھ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا  
سردار رشید اب اس کے لیے لایحیل مسائل کھڑے کر دے گا۔

لیکن —

ننھو خاں کی موت کے تیسرے ہی دن جب اُسے سردار رشید کی طرف سے ملاقات  
کاٹھیہ پیغام ملا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔!

کوئی چال نہ ہو۔

فضل شاہ نے تبصرہ کیا تھا۔

”ہیں فضل شاہ۔ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا کہ ڈھنگ سے کوئی چال چل سکے البتہ  
اُس نے اپنے پتے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ شاید سیانندان بنا چاہتا ہے بے چارہ۔“  
ریاست شاہ نے بڑی سکاری سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”بہر حال یہ بات تو ماننی ہوگی کہ فی الوقت اُس کا پلڑہ بھاری ہے۔ ننھو خاں والی  
بڑی ہی اُلٹ گئی اور۔۔۔“

اور —

ریاست شاہ نے غصے سے فضل شاہ کی بات کاٹ کر طنز یہ لہجے میں دریافت کیا

”میرا مطلب تھا بھائی صاحب کہ . . .“

”تمہارا جو بھی مطلب ہو۔ ایک بات دھیان سے سن لینا کہ اگر خدا نخواستہ ہمارے ہاتھ سے اسپیلی کی سیٹ نکل گئی تو ہم پر لامتناہی عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور تمہیں وہ تمام امکانات ختم کرنے ہونگے جو ہماری شکست کا سبب بن سکتے ہیں۔“

ریاست شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا شاہ جی — ایسا ہی ہوگا۔“

فضل شاہ نے گردن جھکا دی۔

”کل دوپہر ہی کو ملاقات کا پروگرام رکھ لو — اور وہ دوسرے پروگرام کا کیا ہے۔“

حنیف خاں کو پیغام گیا یا نہیں؟

ریاست شاہ کوئی گہری چال چلنے جا رہا تھا۔

”زہراں بائی کی طرف سے آج شام ہی حنیف خاں کو فوری ملاقات کا پیغام مل

جائے گا شاہ جی — اور ایک مرتبہ جب وہ زہراں بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا تو ہماری

گرفت سے نہیں نکل سکے گا۔ عنایت بائی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی مدد

سے حنیف خاں کو باہر کر دے گی کہ اس قتل سے شاہ پور والوں کا دور دورہ دور تک ہی کوئی

تعلق نہیں اور عزیز میلی دراصل سرداروں کا آدمی ہے جسے انہوں نے لمبی رقم دے کر اس

طرح کا بیان دینے پر آمادہ کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قتل میں شاہ پور والے لپیٹل

کا ہاتھ ہے۔ دراصل یہ سارا گھڑاگ ان کا اپنا پھیلایا ہوا ہے اور گھرا ل جانے کی وجہ

سے انہوں نے بوکھلا کر ہم پر الزام تراشی شروع کر دی ہے تاکہ حنیف خاں کے انتقام

سے بچ سکیں — شاہ جی — ایک مرتبہ جب شراب اور شہاب کا نشہ اس کے دماغ

کو چٹھا تو سادوں کے اندھے کی طرح اسے ہر طرف ہراہی ہرا دکھائی دے گا اور زہراں بائی

اُس کا خیال بھول کر بھی اس طرف نہیں جانے دے گی — میں نے اس بڑے وقت کے

یہ تو یہ کارڈ سنبھال کر رکھا ہوا تھا —“

فضل شاہ نے اُسے دوسرے منصوبے کی تفصیلات بتائیں۔

”ٹھیک ہے فضل شاہ — بس ایک بات ذہن میں رکھنا اگر اس مرتبہ کوئی چال

فلپ کر گئی تو ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا —“

ریاست شاہ نے اپنی مونچھوں پر اٹل ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

”میں جانتا ہوں شاہ جی — میں جانتا ہوں۔“

فضل شاہ نے اپنی بات دہرائی۔

سردار رشید سے ملاقات کے لیے انہوں نے شہر کے ایک دور دراز علاقے میں

درازداری کے عمل اہتمام کے ساتھ ملاقات پر آمادگی ظاہر کی تھی چونکہ جگہ کا تعین ریاست شاہ

نے خود کیا تھا اس لیے وہ خاصا مطمئن تھا اور اُسے یقین تھا کہ اس ملاقات کی بھینک بھی

کسی کے کانوں تک نہیں پڑے گی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے دوست باڈی گارڈز کے ساتھ اپنی لینڈ اور جیپ میں

شہر کی طرف اُڑے جا رہے تھے جہاں انہوں نے سردار رشید سے ملاقات کرنی تھی —!

ان کی توقعات کے عین مطابق سردار رشید اپنے بھائی سردار مرید اور عالم داد کے

ساتھ پہلے ہی سے اُن کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ یہ اُن کے ایک مشترکہ

دوست کی کوٹھی تھی جس کے تعلقات بیک وقت سیدوں اور سرداروں سے تھے۔

دونوں کی میزبانی مقامی دوست نے کی اور تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد اس نے

دونوں پارٹیوں کو مذاکرات کے کمرے میں پہنچا دیا۔

دونوں کو ہی اس بات کی گارنٹی پہلے سے دے دی گئی تھی کہ اُن کی بات چیت

کا خیاب ہو یا نام کام رہے بہر حال اس ملاقات کا راز کبھی افشا نہیں ہوگا اور دونوں

پارٹیاں حلقاً اس کی پابند کر دی گئی تھیں۔

کمرے میں ایک طرف سردار رشید اور عالم داد اور دوسری طرف ریاست شاہ

اور فضل شاہ بیٹھے تھے۔ سردار رشید نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ریاست شاہ ہماری تمہاری کوئی ذاتی دشمنی یا دوستی نہیں ہے کیونکہ نہ ہم آج

یوں بھی ہمارا اصول ہے کہ جو کام بھلے مانسی سے ہو جائے اس کے لیے زیادہ دھوم دھڑکا  
 اچھی بات نہیں۔ ریاست شاہ محبت اور جنگ کی طرح سیاست میں بھی سب جائز ہے۔  
 اس بات کو کبھی نظر انداز نہ کرنا کہ حنیف خاں ہمارے قبضے سے نہیں نکل سکتا۔ تم ایک  
 طوائف کے ذریعے اُسے کب تک قابو میں رکھ سکو گے۔ ہم ایسی درجنوں طوائفیں جمع کر  
 لیتے ہیں لیکن میں کم از کم اس سطح پر اترنا نہیں چاہتا۔ ایکشن میں چار روز باقی ہیں۔  
 اور تم ہار چکے ہو۔ تم اگر احمقوں کی جنت میں نہیں رہتے تو تمہیں علم ہو چکا ہو گا کہ تم ہار  
 چکے ہو۔ البتہ میرے پاس تمہارے لیے اب بھی ایک قابل عزت پیشکش موجود ہے۔  
 اس بات کو ذہن میں رکھنا ریاست شاہ کہ فی الوقت پڑھ میری طرف بھٹکا ہوا ہے۔ اس  
 ایکشن کے نتیجے میں اگر میں ہار بھی جاؤں جو بظاہر ممکن نہیں تب بھی میرا کیا بگڑے گا۔ جو  
 سال بعد نئے ایکشن ہونے والے ہیں میں پھر میدان میں آ جاؤں گا لیکن تم ہار گئے تو۔  
 تمہارے لیے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

سردار رشید نے اُسے سمجھایا۔

ایک لمحے کے لیے تو صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہونے سے ریاست شاہ بھی  
 لرز کر رہ گیا۔ واقعی شکست کے بعد اُس کے لیے کوئی چانس باقی نہیں رہتا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

بالآخر اُس نے قدرے کمزوری دکھا ہی دی۔

”میرے پاس ایک بہترین آفر موجود ہے جس سے تم بھی کامیاب رہو گے اور  
 تم بھی۔“

سردار رشید نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا؟“

اُس کی بجائے فضل شاہ نے پوچھا

”تم ہمارے لیے یونین کونسل کی چیئر مین چھوڑ دو۔ اور اگلے انتخاب میں ایم این اے

کی سیٹ بھی ہماری ہونی چاہیے۔ اس کے عوض موجودہ ایم پی اے کی سیٹ ہم تمہیں

تک مختارے دھندے پر اثر انداز ہوتے اور نہ تم ہمارے پر۔ یوں بھی ہم اگلے  
 علاقوں میں کام کرتے ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ اب بھی ہم اسی طرح اگلے  
 علاقوں میں کام کریں اور تعلقات کی نوعیت بھی برقرار رہے۔“

”لیکن اس معاہدے کی خلاف ورزی تم نے خود کی ہے۔“

ریاست شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

”نہیں ریاست شاہ۔ جسے تم خلاف ورزی کہہ رہے ہو۔ وہ ناگزیر ضرورت تھی۔“

تم سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے ریاست شاہ کہ اس ملک میں کسی بھی  
 کی بدعاشی کرنے کے لیے سرکار دربار میں اثر و رسوخ ضروری ہے۔ ہمارے پاس مزہ  
 یہی ایک کمی تھی۔ تم گزشتہ پندرہ سال سے سرکار کی گود میں بیٹھ کر شطرنج کھیل رہے ہو۔

میرے خیال سے اب ہمیں بھی یہ موقع ملنا چاہیے۔ آخر ہم کب تک تقانیداروں اور ریجز  
 انسپکٹروں کے پیٹ بھرتے رہیں۔ کیوں نہ اب ہم ان سے اپنا حصہ وصول کریں۔

سردار رشید نے مسکراتے ہوئے کہا

”دیکھو سردار رشید سب کام سب لوگوں کے لیے نہیں ہوتے تم خواہ مخواہ ہمارے

پچھے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ جس طرح کی ضمانت تمہیں چاہیے میں دینے کے لیے تیار ہوں

تمہارے غیر قانونی دھندوں کی حفاظت میرا ذمہ ہوگی۔ لیکن تم اس کھیل میں نہ اڑاؤ۔“

ریاست شاہ نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا

”شاہ جی۔ کم از کم آپ کو یہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ اب تک آپ کو اندازہ

چاہیے کہ میں اس کھیل کے دائرے میں سے زیادہ بہتر سیکھ گیا ہوں۔“

شمال مختارے سامنے ہے ریاست شاہ۔“

سردار رشید نے الفاظ چبانے ہوئے کہا

اور۔۔۔ بس ایک ہی فتح پر دماغ خراب ہو گیا۔“

ریاست شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا

”دیکھو ریاست شاہ ہم یہاں ایک دوسرے کو ادب چاہیے دکھانے کے لیے نہیں۔“

دینے کے لیے تیار ہیں۔“

سردار رشید نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور فضل شاہ کو یوں لگا پڑا کہ کسی نے بڑے زور سے گھونسا اُس کے دل پر مار دیا ہو۔ اگر یونین کونسل اُس کے ہاتھ میں نہ آئی تو اُس کی طرف سے سب کچھ بھاڑ میں جاتا۔ اس طرح تو صرف ریاست شاہ ہی فائدے میں رہتا وہ تو مارا جاتا۔

یہ کیسے ممکن ہے؟

بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا۔

ریاست شاہ نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا کیونکہ اپنی موجودگی میں وہ فضل شاہ بات کرنے کا اختیار دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”مجھے کچھ سوچنے دو سردار رشید۔ یہ فیصلہ وقت چاہتا ہے۔“

ریاست شاہ نے کہا۔

”نہیں ریاست شاہ۔ اس وقت دراصل ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے مارنے کے لیے وقت ہی سب سے بڑا اختیار ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ میں نہیں دے سکتے تھے اس میں سے فیصلہ کر کے اٹھنا ہوگا اور ہاں اپنی بات کا بندوبست ہم نے کر رکھا۔ کہ ایک دوسرے کو جو گاڑی بھی دی جائے گی اُسے پورا کیا جائے۔“

سردار رشید اُسے سیدٹ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ہم آدھے گھنٹے بعد ملتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ریاست شاہ نے فضل شاہ کو اٹھ کر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

”سردار صاحب اب میں دیکھتا ہوں اس کی ہوشیاری اور سیاست بازی کو۔ تو فضل شاہ کبھی اُسے یہ آفر قبول کرنے میں دے گا اگر اُس نے فضل شاہ کو راضی کر لیا تو فضل شاہ اُسے مار ڈالے گا۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کا تماشاً اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا رہے۔“

عالم داد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا:

”فضل شاہ بے وقوفوں کی طرح ضد نہیں کیا کرتے۔ ہم موجودہ ایکشن نہیں جیت لیتے۔ یہ تب ہی ممکن تھا اگر نختو خاں کی برادری ہمارے ساتھ رہتی۔ اُن کے آٹھ دس ہزار ووٹز ہی کسی کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میرے خیال سے یہیں یہ اُتران لینی چاہیے۔“

ریاست شاہ نے فضل شاہ کو زنج ہو کر کہا جو کسی بھی طرح اس کے حق میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”شاہ جی وہ تو ٹھیک ہے۔ اگر ہم وقتی طور پر مان بھی جائیں تو یونین کونسل اور آپ جانتے ہیں کہ یونین کونسل ہاتھ سے نکل گئی تو ہم ایکشن کا فریج بھی پرا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ کو ان حالات میں کوئی منطقی نہیں مل سکے گی اور کوئی ثنارت کی سیدٹ مل بھی گئی تو ہم کیا کمالیں گے۔ بہر حال مجھے آپ کے ہر فیصلے کا احترام ہے۔“

فضل شاہ نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دل میں اپنے سوتیلے بھائی کے لیے پھلے سے موجود نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس مرحلے پر بھی فضل شاہ کی کوثر بانی کا بکر اٹانے پر تڑپا ہوا تھا۔

”شاباش فضل شاہ۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم بے فکر رہو۔ اتنا لگا دیا میں بھی نہیں کہ آسانی سے انہیں حلوہ کھانے دوں گا۔ میں نے بھی دُنیا دیکھی ہے فضل شاہ۔ ان سکٹوں کو سیاست کہاں سے آگئی۔ ایک مرتبہ اسمبلی میں پہنچ جاؤں۔ ابھی یونین کونسل کے ایکشن کو چھ ماہ باقی ہیں۔ میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر سردار رشید پر ناکارہ توڑنے کا الزام لگا دوں گا۔ کوئی نہ کوئی جواز پیدا کروں گا۔ تمہاری سیدٹ بکلی ہے فضل شاہ۔ لیکن فی الوقت مجھے ایم پی اسے بن جانے دو۔“

ریاست شاہ نے اسے بچوں کی طرح بہلانا چاہا۔

”ٹھیک ہے شاہ جی۔ جو آپ کا حکم۔“

فضل شاہ نے دل پر پتھر رکھ کر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ اُس رات  
دل ہی دل میں کچھ اور طے کر لیا ہے وہ اس طرح بندھے ہاتھوں سے بندر کا  
ہاتھ میں گڑیا نہیں دے سکتا تھا۔

ایکشن سر پر تھا۔  
اگر دونوں کے درمیان ہوتے معاہدے کو اگلے روز سردار رشید یا ریاست شاہ  
کی طرف سے ریکارڈ پر لایا جاتا تو فضل شاہ کے لیے کچھ باقی نہ بچتا۔  
اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ فوراً کرنا تھا۔

اور۔  
اس کے شیطانِ ذہن نے ایک خطرناک منصوبہ سوچ بھی لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ  
ذین خان اُن دونوں کی تاک میں ہے۔ وہ اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے باؤ لانا ہوا  
بانا ہے اور اس معاہدے پر اگر عمل ہو جاتا تو سردار رشید کا گردب حنیف خاں کو بھی قابو  
ر لیتا جس کے بعد تو امید کی کوئی کرن فضل شاہ کے لیے باقی نہیں بچتی تھی۔  
اسے آج کی رات ریاست شاہ کی زندگی کی آخری رات بنانی تھی۔ خواہ اس کی کچھ  
بہ قیمت ادا کرنی پڑتی۔

اُس کے پاس اب ایک آخری دائرہ گیا تھا اور وہ تھا نذیر موچی! —  
وہ ریاست شاہ کو راتوں رات قتل کر کے یہ قتل نذیر موچی کے سر منڈھ سکتا تھا۔  
نذیر موچی کے فرار ہونے کے بعد اُس کے کھاتے میں کوئی بھی جرم ڈال سکتا تھا۔ دونوں  
جانوں نے تو یہاں تک سوچ رکھا تھا کہ اگر پولیس نے انتہائی دباؤ پر اُن کی طرف رخ  
کر بھی لیا تو وہ نختو خاں کا قتل بھی نذیر موچی کے کھاتے میں ڈلو کر اپنی جان چھڑا لیں گے۔  
فضل شاہ کے ماتھے پر حرام لکھا تھا۔

حرام کاری کے معاملات میں وہ قسمت کا دھنی کھلاتا تھا۔  
اُسے کیا علم تھا کہ جب وہ ہوس میں اندھا ہو کر اپنے بھائی کی بی بی دے کر اقتدار کے  
ایوانوں میں داخلے کی راہیں تراش رہا تھا عین اُن لمحات میں جوشِ انتقام میں اندھا حنیف  
خاں کھانسی کے لڑکوں کے ساتھ اُن کے راستے میں تاک لگاتے بیٹھا تھا۔

شہر سے اب وہ لوگ اُس ویران سڑک کی طرف مڑ گئے تھے جو نہر کے کنارے کنارے  
بنائی گئی تھی۔ اس سڑک پر عام ٹریفک کو چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے سڑک کے آغاز

ریاست شاہ کے جواب نے کچھ دیر کے لیے عالم داد اور سردار رشید کو بھی پرا  
کر دیا۔

لیکن —  
وہ جلد ہی سمجھ گئے کہ اب ریاست شاہ اس بُری طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس  
پاس فرار کا اور کوئی راستہ ہی باقی نہیں بچا۔

اس معاہدے کی ضمانت کا اہتمام یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو  
دونوں کی ملاقات کر داتی تھی اس کی اعلیٰ سرکاری حیثیت کے پیش نظر فریقین کو اس با  
کا تجویز علم تھا کہ اُن میں سے جس کسی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اُسے توقتات۔  
برٹھ کر اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

دونوں یہ بات تجویز سمجھتے تھے کہ جو معاہدہ یہاں ہوا ہے اس کی ایک ایک ش  
اہیں بہر صورت عمل کرنا ہے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بادلِ نحواستہ ہی سہی اس  
کو قبول کر لیا تھا۔

لیکن —  
فضل شاہ نے نہیں! —  
اس کے لیے یہ تصور ہی بڑا سوبانِ روح تھا کہ عالم داد تحصیل کو نسل کا اگلا جیز  
بننے والا ہے۔ اس طرح تو اُسے اپنے بیشتر دھندے سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اُس  
جس جس طرح عالم داد کو نقصان پہنچانا تھا اور اپنی دانست میں جیسے اُس کا دو نمبر کا  
تباہ کرنے کی کوششیں کرتا رہا تھا اس کے بعد سے عالم داد سے خیر کی توقع دینے  
خواب دالی بات ہی ہوتی۔

میں حکم ہنرداوں نے ایک لوہے کا گھٹ لگا رکھا تھا۔

لیکن

ریاست شاہ کی گاڑی کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

نہر کے کنارے خود رو گھاس کا ایک جنگل سا آگ آیا تھا اور اس جنگل کے ایک محفوظ کج میں حنیف خاں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سڑک پر نظرں جلتے بچاؤ اٹھوں نے ایسی مناسب جگہ منتخب کی تھی جہاں سے اپنا کام کر کے تینوں آساز سے نکل سکتے تھے۔

حنیف خاں کو صبح ہی اطلاع مل گئی تھی کہ دونوں شیطان شہر گئے ہوتے ہیں اور اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کے بعد اس جگہ ناکہ لگایا تھا۔ اُس علم تھا کہ اُن کی گاڑی اسی طرف سے واپس آئے گی۔ شاہ پور کو آنے کے لیے اور راستے بھی تھے۔

لیکن

وہ عوام الناس کے لیے تھے۔

شاہ صاحبان کے لیے یہی سرکاری راستہ تھا جہاں حنیف خاں اور اس کے ساتھی موت کے فرشتے بن کر اُن کے راستے میں جال بچھائے بیٹھے تھے۔

شام ڈھل رہی تھی جب اٹھوں نے ملگے اندھیرے میں ریاست شاہ کی جیب اس طرف آتے دیکھی۔ اس پجیر کو حنیف خاں سمجھیں بند کر کے پچان سکتا تھا کیا اُسے متعدد مرتبہ اس میں سواری کا موقع ملا تھا۔

”تکڑا ہو جا چتی“

حنیف خاں نے کچھ فاصلے پر موجود چتی سے کہا جو اس کا اشارہ پاتے ہی چتے سے منتخب کردہ اپنے مورچے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے اپنی ”رہسیر“ فائرنگ پوزیشن میں کر لی تھی اور اب گاڑی پر نظرں جاتے ٹریگر پرائنگلی رکھے بیٹھا تھا۔ چتی کا اشارہ پاتے ہی اُس کے بھائی ترلوک نے نہر کے ساتھ ساتھ جنگل کا

میں گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کلاشنکوف کپڑی پہنی تھی اور اس کی کمر سے گولیوں کا تھیلا بندھا تھا۔ تینوں کے درمیان اب کم از کم تیس تیس چالیس چالیس گز کا فاصلہ ہو گیا تھا۔ اس طرح اٹھوں نے اپنی دانست میں جیب کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ دونوں کے بیچ نکلنے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ ریاست شاہ اگلی سیٹ پر خراٹے بھر رہا تھا جبکہ فضل شاہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ پہلی سیٹوں پر بیٹھا تھا جب اچانک اٹھیں فائر کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی پجیر کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔

ڈرائیور نے کسی برقی عمل کے تابع اچانک ہینڈ بربیک کھینچی اور گاڑی زوردار جھٹکے سے رُک گئی۔ یہی جھٹکا۔ ریاست شاہ کی زندگی بچا گیا کیونکہ اس کی طرف آنے والی گولی پیچھے بیٹھے ایک ملازم کے سر میں لگی جسے آواز نہ لگنے کی مملت بھی نصیب نہ ہوئی۔ اچانک جھٹکا لگنے سے ریاست شاہ گاڑی سے باہر گر پڑا تھا۔ فضل شاہ اچانک بجلی کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے پھپھلا دروازہ کھول کر باہر پھلانگ لگا دی۔

”تم اٹھیں رو کو۔ ہم نہر کی طرف سے نکلتے ہیں“

اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی اور زمین پر گرے ریاست شاہ کو بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”بھائی صاحب — اس طرف“

فضل شاہ نے اپنے گلے میں ٹکٹا دیا اور اس درمیان اپنے ہاتھ میں نظام لیا تھا۔ ریاست شاہ ہونٹوں کی طرح اس کے ساتھ تیبھے کی طرف بھاگنے لگا۔

ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اس درمیان اپنی بندوقیں سمجھال لی تھیں، وہ جراتور پیشہ لوگ تھے اور ایسی صورت حال کا مقابلہ کرنے ہی کے لیے ریاست شاہ نے اٹھیں پالا ہوا تھا۔

فضل شاہ اپنے بھائی ریاست شاہ کو اپنے تیبھے جنگلی گھاس میں لے آیا تھا۔ اُس

نے سوچا تھا یہاں سے وہ لوگ نہز میں چھلانگ لگا کر دوسری طرف نکل جائیں۔  
اچانک ہی اس کے اندر شیطان جاگ اُٹھا۔

”فضل شاہ — عقل کے اندھے۔ اس سے بہتر موقع کب ملے گا“  
شیطان نے سرگوشی کی اور فضل شاہ کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دائمی اسے ہنر  
موقع ملا تھا اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا — !  
اچانک ہی اس نے اپنا رویا اور ریاست شاہ کی طرف سیدھا کر لیا۔

”ک ک کیا مطلب؟“  
ریاست شاہ نے حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھا۔

”شاہ جی — مجھے نہیں لگتا کہ ہم یہاں سے بچ کر نکل سکیں — لیکن میرے لیے  
بھی ممکن نہیں کہ آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دشمن کی گولی سے مرنا دیکھوں — یہ  
حنیف خان نے کیا ہے شاہ جی۔ وہ ہمیں بچ کر نہیں جانے دے گا — کیوں نہ نہیں آپ  
اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں“

فضل شاہ کی آواز خوف کی طرح ریاست شاہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی  
”فضل شاہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے — تم کیا بک رہے ہو“  
ریاست شاہ نے اچانک سنبھل کر جھلٹاتے ہوئے کہا  
”میرا تو دماغ ہی شاہ جی خراب ہو رہا ہے۔ اگر حنیف خاں کے ہتھے چڑھ گئے تو  
کا مُردہ خراب کر دے گا — آپ نادعلی پڑھیں تاکہ میں گولی چلاؤں“

فضل شاہ کی شیطانتیت نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔  
”فضل شاہ، کتے کے پتے، تیری یہ مجال —“

گالیاں بکتے ہوئے ریاست شاہ نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔  
لیکن —

مشکل دو تین قدم ہی چلنے پایا تھا جب اچانک وہ ٹنلا کر گر پڑا۔ فضل شاہ نے اُس  
اُس کے سینے میں اتاری تھی۔

زمین پر گرے اپنے سونپے بھائی کے سر میں ہوس کے اندھے فضل شاہ نے دو اور  
گولیاں اُتار کر اطمینان کر لیا کہ اب شاہ صاحب کے زندہ بچنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

ریاست شاہ کے ساتھیوں کو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان پر کسی فوج نے حملہ  
کر دیا ہو۔ انھیں فائرنگ کے ساتھ ساتھ حنیف خاں کی ریاست شاہ اور فضل شاہ کو  
گالیاں دینے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن —

حملہ آور دکھائی نہیں دے رہے تھے —

اُن کے ایک ساتھی کی لاش گاڑی میں پڑی تھی۔ جب اچانک انھوں نے اپنے دوسرے  
ساتھی کی چیخ سنی اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا۔  
باقی دونوں حواس باختہ ہو کر تپتے کی طرف کھسکنے لگے۔ اچانک ہی انھوں نے فضل شاہ  
کو چلائے سنا۔

”بڑے شاہ جی کو گولی لگ گئی ہے۔“

دونوں نے یہ سنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ نہز میں چھلانگیں لگا دیں — وہ جہرا م پیشہ لوگ  
تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست شاہ اُن کی ہر جائزہ ناجائز ضرورت پوری  
کرتا تھا اور پولیس کو کبھی ان کے نزدیک بھی نہیں پھینکنے دیا تھا۔

لیکن —

وہ ریاست شاہ یا فضل شاہ کے لیے جان دینے سے تو رہے۔ جب ریاست شاہ ہی مر  
گیا تو وہ لڑتے کس کے لیے۔ اُن کی حنیف خاں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔

فضل شاہ نے چند لمحوں کے لیے صورتحال کا جائزہ لیا۔ قدرے اندھے میں  
اُس نے کچھ فاصلے سے حنیف خاں کو ایک جھنڈ سے نکلے دیکھا تو دیوانہ وار تپتے کی  
طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ فرار ہونے کے لیے اس نے جھنگلی گھاس کی پناہ لی تھی —  
فضل شاہ کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ اس گھاس میں کتنا بھاگ چکا ہے۔ اُس



وجہ قتل اُس نے سیاسی دشمنی بتائی اور اپنی رپورٹ میں لکھا یا اور سردار رشید نے سیاسی میدان میں اپنی ناکامی کا یقین ہونے پر مقتول نختو خاں کے بیٹے حنیف خاں کو گراہ کر کے اُن پر حملہ کر دیا ہے۔ اس حملے کی کمان اس کا بھائی سردار مرید کر رہا تھا جس کے ساتھ عالم دادا اور حنیف خاں موجود تھے۔

فضل شاہ نے اپنی داستان میں ایسی آیت آئی کہ درج کر دادی تھی کہ اب سردار مرید اور عالم دادا کی ضمانت کا کوئی چانس باقی نہیں بچا تھا۔

اُس نے ریاست شاہ کی ملی یوں ہی نہیں دی تھی۔

اس ملی کے عوض وہ بیک وقت کئی فوائد حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اُسے نہ صرف اگلے الیکشن میں کامیابی حاصل کرنی تھی بلکہ یونین کونسل پر بھی قبضہ کرنا تھا۔ اس نے اپنی داستان میں ریاست شاہ کا جھٹکا کر کے سردار رشید کو چاروں شانے چیت کر دیا تھا۔

”لے بچو تو بن جا چیرمین یونین کونسل کا“

اس نے دانت پھینتے ہوئے عالم دادا کو دل ہی دل میں گالیاں دیں۔

راتوں رات وہاں شاہ پورا اور گردنواح کے سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے لاشیں اٹھائیں اور سرداروں اور حنیف خاں کو لعن طعن کرتے شاہ پور لے آئے۔ جہاں کسی ممکنہ تصادم کے پیش نظر پولیس نے ہنگامی چوکی بنا دی تھی۔

ریاست شاہ کی خصوصی حیثیت کے پیش نظر ایس بی خود فضل شاہ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے فضل شاہ سے درخواست کی تھی کہ تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس کے حوالے کی جائیں تاکہ معمول کی کارروائی پوری ہو سکے۔

لیکن —

غم و غصے سے بڑھال فضل شاہ نے اپنے بھائی کی لاش کی مزید چیر پھاڑ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ برٹمی منت سماجت کے بعد پولیس افسران نے تینوں لاشیں اس وعدے پر حاصل کی تھیں کہ وہ شام ہونے سے پہلے انہیں واپس لوٹا دیں گے تاکہ

کی سانس ہی نہیں ٹانگیں بھی چھوڑنے لگی تھیں۔ کپڑے پھٹ رہے تھے اور اس کا بڑا حال تھا۔ بھاگے بھاگے اس نے اپنا دیوالیورا اور گولیوں کا پیٹہ ہنر میں پھینک دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ہنر کا تیز بانی دونوں چیزیں بہا کر اب تک بہت دُور جا چکا ہوگا۔ یہ بغیر لاشیں کا اسلحہ تھا جس کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں تھا۔ اگر کبھی برآمد بھی ہو جاتا تو پولیس کے لیے بیکار تھا۔

فضل شاہ کی اس دوڑ کا خاتمہ فارسیٹ کا نوٹی پر ہوا۔ جس کے باہر بنی پولیس چوکی میں موجود کانٹیلوں نے اُسے یہاں پا کر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”حنیف خاں نے ہم پر حملہ کر کے بڑے شاہ صاحب کو قتل کر دیا ہے۔ میرے دو اور ساتھی بھی مارے گئے ہیں۔“

اس نے ہانپتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا

جس نے شاہ صاحب کو حوصلہ دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ پولیس کی جیب میں ہوتہ واردات کی طرف جا رہا تھا جہاں ریاست شاہ اور اُس کے دو ساتھیوں کی لاشیں موجود تھیں۔ حنیف خاں نے اپنا باقی غصہ اُن کی گاڑی پر نکالا تھا جس کو اُس نے گولیوں سے پھینکی کر کے رکھ دیا تھا۔ جاتے جاتے وہ ریاست شاہ کا مردہ بھی خراب کر گیا تھا۔ اُس نے یہی سمجھا ہوگا کہ ریاست شاہ اُن کی فائرنگ سے مرہا ہے اور جوش انتقام میں مردہ ریاست شاہ کے جسم پر اپنا پورا موزر خالی کر دیا تھا۔

رات کے اندھیرے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح نزدیک دُور کے دیہاتوں میں پھیل گئی تھی کہ ریاست شاہ کو نختو خاں کے بیٹے مار ڈالا ہے۔

فضل شاہ کے لیے یہ بڑی آئیڈیل سچویشن تھی۔

سب کچھ اس کی مرضی کے عین مطابق ہوا تھا۔ اُس نے ٹسوتے بہاتے ہوئے پولیس کو خود پر ٹوٹنے والے ظلم کی کہانی سنائی اور حملہ آوروں میں حنیف خاں، عالم دادا اور سردار مرید اور نامعلوم لوگوں کے نام لکھوا دیتے۔ اُس نے پولیس کو بتایا کہ تینوں کو اس نے شناخت کر لیا تھا جبکہ باقی لوگوں کو وہ شناخت نہیں کر سکا۔

لاشوں کو دفن کیا جاسکے۔

پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹروں نے فضل شاہ کے احکامات کے مطابق رپورٹ تیار کر کے پولیس کو دے دی تھی۔ شام ڈھلے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اُس نے لاشیں دفن کر دوائیں۔

ریاست شاہ کو شہید جمہوریت کا خطاب ملا تھا۔ کیونکہ اس نے علاقے کے غریب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایکشن لڑنا تھا اور علاقے کے سرداروں کو یہ قبول نہیں تھا کہ یہاں کے عوام کو پھولتے پھلتے دیکھ لیں۔

فضل شاہ نے اپنے بھائی کی میت کے سر ہانے کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے ”شہید بھائی“ کی قربانی راہیگاں میں جلتے دے گا اور اس کے عزائم پورے کیے جائیں گے۔ اُس نے اپنے بھائی کی لکاش کے سر ہانے ہی اپنے بھائی کی جگہ ایکشن لڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور سوگواروں سے کہا تھا کہ اب ریاست شاہ شہید کی رُوح کو توبہ ہی اطمینان حاصل ہوگا جب اس کا بھائی اسمبلی میں بیٹھ کر اُس کے مشن کو مکمل کرے گا۔

فضل شاہ کی جذباتی تقریر نے ماحول کو خاصا گرم دیا تھا۔ مجمع نے فضل شاہ زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اردگرد کے دیہاتوں نے قبرستان ہی میں فضل شاہ کو حلف دیا تھا کہ وہ اس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کر دیں گے اور اپنی جان لڑا کر بھی اُسے کامیاب کر دلائیں گے۔ یہی فضل شاہ چاہتا تھا۔

اُس نے ایک تیز سے کئی شکار کھیل لیے تھے۔

وہ بڑا گھاگ شکاری تھا۔

اب سب کچھ اس کا تھا۔ اس نے سرداروں کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قدرت نے جیسے خود ہی اُس کے راستے کی ساری رکاوٹیں دُور کر دی تھیں۔

جنازے سے واپسی پر اس نے اپنے گاؤں ہی میں پریس کانفرنس کا اہتمام کر رکھا تھا ”بھر پور“ بنانے کے لیے اس کے گرد کے شہر سے اخبار نویسوں کو گاڑیوں پر بٹھا کر اُن کی

میں گرما کر لاتے تھے۔

ان اخبار نویسوں کے سامنے ”صدے سے نڈھال“ فضل شاہ نے اپنے بھائی کے ہاتھوں کے نام ڈھراتے اور یہ شک بھی ظاہر کیا کہ موجودہ اعلیٰ پولیس حکام سے سرداروں کی رشتہ داری کے سبب اُسے خدشہ ہے کہ یہ لوگ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہونے دیں گے۔

اُس نے فوری طور پر ڈی آئی جی کے تبادلے کا مطالبہ کیا تھا اور کسی غیر جانب دار پولیس آفیسر کے ذریعے تفتیش کرنے کی درخواست کی تھی۔ سوگواروں کا تانا بندا تھا۔

اور —

ہر آنے والا لمحہ فضل شاہ کی پوزیشن مضبوط کر رہا تھا۔

سردار رشید نے اپنی دانست میں بڑا کامیاب داؤد کھیلا تھا۔ اس سارے کھیل کے پیچھے حوالدار عالم دار کا شیطانی ذہن کار فرما تھا۔ ابھی تک اس نے بڑی کامیابی سے اپنے ٹہرے ایک ایک کر کے آگے بڑھاتے تھے۔

اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ریاست شاہ کے لیے نتھو خاں کا قتل ناگزیر ہو جاتا اور اب حنیف خاں کو اُن کے سردوں پر ٹھکتی تلوار بنا کر جہاں سردار رشید کے لیے ایم پی اے کی سیٹ چھل کر لی تھی وہاں اپنے لیے یونین کونسل کی چیئرمین بھی پتی کر لی تھی۔

اب بظاہر اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ وہ جب چاہتا ریاست شاہ اور سردار رشید کو حنیف خاں کو بھی اس کے باپ کے پیچھے روانہ کر دیتے جس کے بعد راجی اس کی قسمت میں چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

لیکن —

یہاں جو کچھ ہو گیا تھا اُس کا تو کبھی عالم داد یا سردار رشید کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

وہ لوگ تو ریاست شاہ اور فضل شاہ سے معاہدہ کر کے اپنی دانست میں اپنی سیٹھیں لے کر کے آ رہے تھے کہ اچانک میر بلا ان کے سردوں پر آن پڑی۔

پولیس کے دو ٹرکوں نے ان کی زندگیوں میں پہلی مرتبہ پلوال کو گھیرے میں لیا تھا۔ پولیس فورس کو جس کی کمان ایک ڈی ایس پی کر رہا تھا۔ آتی جی صاحب نے خصوصی احکامات کے ساتھ پلوال کی طرف روانہ کیا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے چند منٹ ہی میں سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔

سردار رشید نے یہی سمجھا کہ شاید سرحدی علاقہ ہونے کے سبب یہاں دہشت گردوں کی موجودگی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے بھائی سردار مرید کے ساتھ اپنی حویلی سے نکل کر پولیس کی طرف جا رہا تھا۔

انہیں چند گز دور ہی سے ڈی ایس پی اپنی طرف آنا دکھائی دیا۔

”کیا بات ہے۔ خیریت ہے۔ تم لوگ...“

”آپ سردار رشید صاحب ہیں“

ڈی ایس پی نے جس کے ساتھ پولیس کے دس مسلح جوان موجود تھے، اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”ہاں۔ میں ہی سردار رشید ہوں اور یہ میرے بھائی سردار مرید اور گاؤں کے معززین ہیں۔“

اُس نے بڑی اکرطے سے گردن پھیلاتے ہوئے اپنے بھائی اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کر دیا۔

ڈی ایس پی نے اپنے جوانوں کو سردار مرید کو ہتھکڑی لگانے کا حکم دیا تو سردار رشید کا دماغ غصے سے پھٹنے کو آ گیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ جلنے ہو تم کہاں کھڑے ہو؟“

سردار رشید نے چپختے ہوئے غصے سے کہا

”سردار صاحب میری درخواست ہوگی کہ اپنی زبان کو لگام دیکھتے۔ شاید میرے ساتھی

ابھی میں بات سُننے کے عادی نہ رہے ہوں۔ میرے پاس سردار مرید کی گرفتاری کے بارے میں انہیں ریاست شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ آپ سے

نادان کی امید رکھتا ہوں۔ برائے مہربانی ہمارے کام میں مداخلت نہ کیجئے۔“

ڈی ایس پی کا لہجہ تیار رہا تھا کہ اگر سردار رشید نے اس کے بعد اپنے مُنہ سے ایک بھی نکالا تو وہ اُس کے مُنہ پر تھپڑ رسید کر دے گا۔

اس درمیان اس کے ماتحتوں نے ہلکے ہلکے سردار مرید کو ہتھکڑی لگا لی تھی۔

”جناب عالم داد یہ ہے۔“

سرداروں کے ٹھکانوں پر پہنچنے والے مقامی تھا نیرا نے جو اس خصوصی پولیس فورس کی رنے کے لیے ان کے ساتھ آیا تھا۔ گاؤں کے معززین میں سے حوالدار عالم داد کو پہچانتے

نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”گرفتار کر لو اسے بھی۔“

ڈی ایس پی نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے انھوں نے عالم داد کو جس نے آج ہی سے خود کو یونین کونسل کا اگلا

بن بھنا شروع کر دیا تھا ہتھکڑی لگا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد غصے اور صدمے سے بے حال سردار رشید اور اس کے ساتھیوں نے چڑا تا پولیس کا یہ قافلہ فضل شاہ کے نامزد دونوں ملزموں کو دھکے دیتا اپنے ٹرکوں

گرفتار کر کے پولیس لائن کی طرف جا رہا تھا۔

”فضل شاہ۔ تُو نے اچھا نہیں کیا۔ میں تجھے گتے کی موت مار ڈالوں گا۔“

کی موت۔“

سردار رشید دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا۔

اس کے ساتھی بمشکل اُسے سہارا دے کر حویلی کی طرف لے جا رہے تھے۔

پنچھنٹ کی تنگ دود کے بعد انہیں ریاست شاہ کی لاش نظر آگئی —

اب تک انہوں نے تین لاشیں شمار کر لی تھیں —

اچانک ہی تروک چلتا چلتا رک گیا۔ وہ ہوشیار سینے کی طرح فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا۔ یہ لڑکے کے کپڑے تھے —

خطرے کی بو وہ زور سے سوگھنے پر قدرت رکھتے تھے۔

”ہنیے — نکل چل پولیس آ رہی ہے“

جینی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”لیکن فضل شاہ!.....“

”کہاں جائے گا وہ پتہ کر — لیکن اگر ہم ہی مارے گئے تو وہ پجار ہے گا۔ ابھی لاپتہ شائش —“

تروک نے حینف خاں کا بازو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور تینوں دوسرے ہی لمبے تہرے ہاتھوں سے ہمارے بھانگے لگے۔ انہوں نے اپنے فرار کی راہ کا پہلے ہی سے تعین کر لیا تھا اور اب راحت جارہے تھے۔

تینوں نے اسی رات سرحد عبور کر لی اور صبح ہونے تک وہ مکھے سانی کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ریاست شاہ کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حینف خاں کے لہر پڑا منوں بوجھ اتر گیا تھا —

لیکن —

ایک تلاش ابھی تک باقی تھی۔

کاش اُسے فضل شاہ کی لاش بھی نظر آجاتی۔

فی الوقت اُسے یہیں چھپ کر وقت گزارنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر فضل شاہ زندہ پتہ لگا ہے تو اس کی حالت زخم خوردہ سانپ جیسی ہوگی اور وہ حینف خاں کو مارنے کے لئے کوئی کسر باقی رہا چھوڑے گا۔ حینف خاں کے پاس فضل شاہ کا مقابلہ کرنے کیلئے صرف زور بازو تھا۔

لیکن —

## عیش اور طوائف کا وہ

دوسری طرف سے اچانک فائرنگ رکنے کی آواز پر جیتی سب سے پہلے اپنی محفوظ پناہ سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے حینف خاں سے کہا تھا کہ شکار بھاگ رہے ہیں کیونکہ وہی اسے پوزیشن میں تھا کہ انہیں بھاگتے ہوئے دیکھتا —

تروک اور حینف خاں اُس کے متوجہ کرنے پر باہر نکلا تو شام کا گلی اندھیرا رات کی میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ابھی بھی سامنے کا منظر قدرے صاف اور نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ خاں اور اُس کے ساتھی بڑے چوکتے ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے اُن کی جیب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس حدشے کے پیش نظر کہہیں وہ لوگ نزدیکی جھاڑیوں میں تاک لگا کر ہوں انہوں نے تین چار برسٹ اپنے دائیں بائیں جھاڑیوں پر بھی برسا دیئے تھے۔

جیب کے نزدیک پہنچنے پر تینوں نے وقفے وقفے سے درختوں کی آڑ لے کر جیب پر کا چھٹ برسا یا تھا۔ اس یقین کے بعد کہ اگر کوئی وہاں چھپا ہے تو اب تک اُن کی گولیوں سے مارا چکا ہوگا۔ تینوں اب پھونک پھونک کر قدم رکھتے جیب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیب کے نزدیک پہنچ کر جینی نے انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود جیب کا محتاط ہو کر جائزہ لینے لگا۔

لیکن —

اُن کی توقعات کے برعکس اس میں صرف ایک لاش موجود تھی۔ یہ وہی شخص تھا جو اُس طرف سے فائرنگ کے آغاز ہی میں مارا گیا تھا —

تینوں نے اپنے پاس موجود ڈاڑھی نکال لی تھیں اور بڑی احتیاط سے تربیت یافتہ ڈوب کی طرح اس سمت بڑھ رہے تھے جس طرف سے فضل شاہ اور اُس کے ساتھی فرار ہوئے تھے۔

اُس کے دشمن کے پاس قانون اور غنڈہ گردی دونوں بڑے مضبوط ہتھیار موجود ہیں۔ یہ بات حقیقت خاں سمجھتا تھا کہ اُس کی ماں یا کسی اور رشتہ دار کو تنگ کرنے کی ہرمن نیت میں نہیں اس صورت میں اس کی برادری کے لوگ فضل شاہ کا جینا دو بھر کر سکتے تھے۔

انسپیکٹر میترا رام ایک سال کا کشت کاٹ کر اس علاقے میں واپس آیا تھا۔ اُس کے لئے کسی اور تھانے میں تبدیلی کوئی سزا نہیں تھی وہ تو جس تھانے میں بھی اُس کے وارے نیارے تھے۔ ہر جگہ وہ اپنی مرضی اور دھونس دھاندلی کر سکتا تھا۔ لیکن —

پگٹانے جیسی موح نہیں اور نہ ہی مل سکتی تھی۔

اس کی ایک وجہ اس تھانے کی حدیں آنے والے پندرہ تھیں دیہات تھے جن میں ہر ایک میں دو تین سنگھڑ ہتے تھے۔ سرحدی علاقہ ہونے کے سبب ان لوگوں کا آنا جانا کے پار لگا رہتا تھا اور انسپیکٹر میترا رام کی موح رہتی تھی۔ وہ شہر کے کسی تھانے میں بولے ہفتے میں ایک زائد مرتبہ تلاش کر پاتا تھا۔ یہاں اُسے روزانہ آسامیاں ہاتھ لگتی تھیں۔ دو تین دیہاتوں — میں اُسے اتنا ماما نہ مل جاتا تھا جتنے پیسے وہ ایک سال میں بھی دوسرے تھانے میں نہیں کما سکتا تھا۔

اس کی چھ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے اور ان سب کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ پرومان نترتری (صدر) کی اولاد ہیں یا ایک پولیس انسپیکٹر کے سپوت اور سوتیلیاں ہیں۔ اُن سب پلٹھن ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ اگر میترا رام کے پاس یہ حرام کی کافی نہ ہوتی تو اُن میں سے آئے اب تک خود کشی کر چکے ہوتے۔

اُس نے کمال ہوشیاری سے پنجاب کے دو تین شہروں میں اپنی اچھی خاصی جا بجا ڈال دی اور اپنی تین بیٹیاں اب تک بڑے اچھے طریقے سے بیاہ چکا تھا۔

اُسے زندگی میں ایک ہی قلق تھا کہ ننھو خاں کبھی اُس کے ہاتھ نہ لگایا۔ یہی غصہ اُسے سانی پر تھا ایک سال پہلے بھی دو مرتبہ ننھو خاں اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اُس نے

بڑی بادشاہی میں اُس کو لائن حاضر ہونا پڑا تھا۔ جس طرح چھ ماہ اُس نے لائن حاضری پر بس گزارے تھے وہ اُس کا پر ماتما (مذا) نہ بھر جاتا تھا۔ وہ اپنی صبح کا آغاز ننھو خاں کو گالیوں سے کرتا اور دن کا اختتام مکھے سانی پگٹانے دے کر ہوتا۔

یہ چھ ماہ اُس نے بیروزگاری کی حالت میں کاٹے تھے۔ صرف جیل کے قیدیوں کو تادیب کے لئے پگٹانے کیلئے لانے اور لے جانے کی ڈیوٹی سے اُس کا کیا بنتا تھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کا پرانا ساتھی ڈی ایس پی میکس کے ساتھ رہا تھا۔ اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اُسے شہر کا ایک تھانے دیا جس کے بعد اُس نے بھاگ دوڑ کر کے اپنا تبادلہ دوبارہ "پگٹانے" کر دیا۔

یہاں آکر اُسے علم ہوا کہ مکھے سانی مچھکے ہے تو اُس کے غصے کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ اُسے اپنے ہاتھ سے گولی مارنا چاہتا تھا۔ لیکن —

مکھے کے دونوں بیٹے جتنی اور ترلوک ابھی تک باپ کے کام کو آگے چلا رہے تھے۔ یہ نرالی کے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ اُس نے دل میں تہنیکہ رکھا تھا کہ جب بھی ان میں سے کوئی اُن کا داڑھہ کیے نیچے آگیا۔ میترا رام اُسے ضرور میں کر رکھ دے گا۔

میترا رام کے تھانے میں واپس لوٹنے سے جہاں سنگھڑوں اور مقامی چھوٹے موٹے بد معاشوں کے ساتھ جہاں جھول گئے تھے۔ وہاں کالیہ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ گو کہ وہ گزشتہ دس سال سے اُن کا ٹاؤٹ تھا۔ لیکن —

جوڑہ اُسے میترا رام کے ساتھ کام کر کے آیا تھا وہ کسی اور تھانے کے ساتھ نہیں آسکتا تھا۔ میترا رام کو سلام کرنے آیا تو یہ خوشخبری بھی ساتھ ہی لایا کہ ترلوک اور جتنی کے ہاں آج کل حقیقت میں چھوٹا بڑا ہے۔ کالیہ نے جب میترا رام کو یہ اطلاع دی تو زندگی میں پہلی مرتبہ بے اختیار اُس کو ہانپا کہ "کالیہ" کا منہ چوم لے۔

”تیرے منہ میں گھی شکر۔“

بے اختیار سیتارام کے منہ سے نکلا۔

”میں سمجھا نہیں مہاراج۔“

کالیانے بھی سمجھا کہ سیتارام نے شاید زیادہ پڑھا رکھی ہے اور وہ نشے کی حالت میں

بات کہہ گیا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ بس تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اگر اس مرتبہ میرا

گیا تو زیادہ رکھنا.....“

”مہاراج میرا کام تو آپ تک اطلاع پہنچانا ہے۔ باقی سب کچھ تو آپ نے ہی کرنا۔

اگر میری خبر غلط نکلے تو زبان کاٹ دیجیے گا۔“

کالیانے بڑی سسکاری سے دانت نکالے۔

”ٹھیک ہے۔ بس تم اُس کے گھر کے گرد ہی منڈلاتے رہو۔ خیال رکھنا کہیں شکار پڑا

نکل جائے۔ میں آج ہی چھاپہ مارتا ہوں۔“

سیتارام کو ڈھنگ کی بات ہی نہیں سمجھ رہی تھی۔

”مہاراج میں صرف یہی بیٹی (درخواست) کروں گا کہ ان پر کچا ہاتھ نہ ڈالے

بڑے پتے ہاتھ ڈال کر ہی آپ انہیں قابو کر سکتے ہیں۔“

کالیانے ڈرتے ڈرتے کہا

”زیادہ بک بک نہ کیا کرو۔“

اُس نے کالیانے کو ڈانٹ کر جھکا دیا۔

لیکن —

کالیانے جانے کے بعد سیتارام کے دماغ میں اُس کی کہی باتیں گونج پیدا کرتی رہیں

واقعی مکھے سانس کے گھر سے کسی کو گرفتار کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

سانسیوں کی آبادی کے عین درمیان اُس کا گھر قلعے کی صورت ایسا ڈھ تھا۔

جرائم پیشہ تھے... کوئی شراب نکال کر فروخت کرتا تھا اور کوئی سنگ لنگ اور

بازوں کی تو عورتیں پولیس کے قابو نہیں آتی تھیں جو اپنے گھر والوں کے جرائم میں ہمیشہ سپرد رہی تھیں

رد و وار کی بات تھی۔

یہاں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کے پاس جائز اور ناجائز اسلحہ نہ موجود ہو۔ مکھے سانس کو ان

کے سردار کی سی حیثیت حاصل تھی۔

ان لوگوں میں اتنا اتفاق تھا کہ ایک کے آواز دینے پر سارا گاؤں اُس کی مدد کو آجاتا تھا۔

پولیس کو یہاں سے کوئی جرم پکڑنے کے لئے بڑی تنگ و دو کرنی پڑتی تھی۔

پہلے تو سیتارام نے بھی سوچا تھا کہ وہ دوسری اینجینوں خصوصاً ایس ایف (بارڈر سیکورٹی

فوز) کی مدد بھی ضرور حاصل کر لے کیونکہ حینفا یہاں خالی ہاتھ تو بیٹھنے سے رہا۔

لیکن —

اُس کا مقصد صیغہ خاں یا مکھے کے رٹوں کو گرفتار کر کے سرکار دربار سے شاباش لینا نہیں

بلکہ ان کے مال پر قبضہ کر کے لاکھوں روپے ہڑپ کرنا تھا اور اس کا خیر میں وہ کسی کی شرکت کیسے

برداشت کرتا؟

بنا ایس ایف والے کوئی سادھو سنت نہیں تھے کہ متہ باندھے رکھتے۔ وہ بس اُس سے اپنا

مصلحت طلب کرتے یوں بھی اپنے شکار پر کسی بھی طرح کی بندر بانٹ سیتارام کو پسند نہیں تھی اُس نے اپنی

پولیس فوج کے ذریعے ہی یہ معرکہ سر کرنے کی ٹھان لی تھی وہ جانتا تھا ایک مرتبہ اگر ہمت کر کے مکھے

کے کسی ایک پر بھی قابو پالیا تو میدان مار لیا۔

اس سے پہلے کہ ”خیر“ کسی دوسری اینجین کو ملے اُس نے خود ہی میدان میں نکلنے کا فیصلہ

کر لیا تھا اور اپنے تھانے کے کار خاص کے چار کانسیٹوں کو اپنے کمرے میں طلب کر کے پہلے خصوصی

ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ اُس نے ”پگٹانے“ کی طرف روانہ کر دیا۔

سیتارام شام ڈھلے تک تھانے میں موجود رہا۔

سرحدی علاقے کا تھانہ ہونے کے سبب یہاں مختلف اینجینوں کے لوگوں کی آمد رفت

کرتی تھی اور سیتارام کو ہر دم یہی فکر لاحق رہی کہ کہیں اس ”اپریشن“ کی خبر اُس کی کسی پندشہ دارانہ مخالف

اینجین کو نہ پہنچ جائے۔

ہاں پولیس کو روکے رکھے گی جب تک وہ یہاں سے نکلی نہ جائیں۔

حینف خاں کے ہاتھ میں صرف ایک پستول تھا اور وہ ترلوک کی مدد سے اب دوسرے کی چھت پھلانگ چکا تھا مرکان کی چھت پر موجود سانیوں نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ لیا تھا اور وہ اپنے معمول کی مشق کے مطابق ایک دوسرے کا نام لے لے کر اُسے پکارتے ہوئے مکھے سانی کے گھر کی طرف بھاگ رہے تھے۔

اگر تم نے دروازہ دکھو لا تو میں گولی چلا دوں گا۔

سیتارام کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ اُس نے اندازہ کر لیا کہ ہر شے کو راہیں روک کر ملازموں کو بھاگنے کا موقع دے رہی ہے اور اس کے پاس اتنی پولیس فورس نہیں تھی کہ مارے گاؤں کو گیرے میں لے سکتا۔ اُس نے تو اپنے تھانے ہی کے دس جوان تیار کیے تھے۔

”تم گولی چلاؤ یا توپ چلاؤ جب تک نمبر دار نہیں آئے گا میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“

پہلے نمبر دار کو تلاشی کا وارنٹ دکھاؤ اُس کے بعد ہی دروازہ کھلے گا۔

ہر شے کو بھی اپنے پیروں کی بڑی پٹی تھی۔

”توڑ دو دروازہ۔“

اس نے غصے سے گھورتے ہوئے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔ جنہوں نے لکڑی کے مضبوط دروازہ پر اٹھالوں کے بٹ بیوقوفوں کی طرح مارنے شروع کر دیئے حالانکہ وہ بھی جانتے تھے کہ دروازہ اس طرح ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

ابھی انہیں طبع آزمائی کرتے مشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب انہوں نے سانیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا کیا بات ہے تمہارا صاحب کیا ہوا۔ یہ آپ کی نظم کر رہے ہیں۔“

نمبر دار کھینا نے سیتارام سے بظاہر بڑے ملتجی لہجے میں پوچھا۔

”دروازہ کھلو اور اندر سمگلر موجود ہیں۔“

سیتارام نے کھینا کو کھٹا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

اُس نے مکھے سانی کی حویلی کی طرف جو ٹیم روانہ کی تھی اُس کی کمان اپنے انتہائی رازدار اور قابل اعتماد ساتھی حوالدار جگن ناتھ کو سونپی تھی اور تھانے میں بظاہر کبھی کبھی تھی کہ وہ کسی دوسرے گاؤں کی طرف کوئی چھاپہ مارنے گئے ہیں۔

اس خصوصی ہم پر روانگی کا اندراج اُس نے شام ڈھلنے کے بعد سرکاری رجسٹر پر کر لیا اور اپنے ڈرائیور کو جیب نکال کر لپٹانے کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

گاؤں کے باہر ہی اُسے جگن ناتھ دکھائی دیا۔ جس نے دوسری سے ہاتھ ہلا کر۔ اچھا کی رپورٹ کر دی تھی۔ سیتارام کے اشارے پر جیب میں موجود چاروں سپاہی رانڈیں پکڑے اور آگے اور وہ سب جگن ناتھ کے تعاقب میں مکھے سانی کی حویلی کی طرف چل دیئے۔

شام ڈھل رہی تھی جب سادہ کپڑوں میں ملبوس حوالدار جگن ناتھ نے حویلی کے دروازہ پر دستک دی۔

کون ہے؟

کسی نے بارعب آواز میں دریافت کیا۔

دروازہ کھولو۔

جگن ناتھ نے غصے سے کہا

”کون ہو تم۔۔۔ کس سے ملنا ہے۔“

دوسری سوائی آواز سنائی دی۔

”ہم پولیس والے ہیں۔ دروازہ کھولو۔۔۔ درنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔“

اس مرتبہ سیتارام نے فوراً گرجدار آواز میں کہا تھا۔

اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف ہر شے کو بول رہی ہے۔ مکھے سانی کی بیٹی

جو کسی بھی طرح اپنے بھائیوں سے کم نہیں تھی۔

ہر شے کو رنے پولیس کا شک پڑتے ہی ترلوک کو اشارہ کر دیا تھا۔ جس نے سبکی کی سی پھرتی

سے حینف خاں کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور حویلی کی چھت کی طرف بھاگ گیا۔

اُن لوگوں کے لئے یہ کوئی نئی صورت حال نہیں تھی اسے علم تھا کہ ہر شے کو رنے کو کم از کم اُس وقت

”لیکن یہ کیا طریقہ ہے دروازہ کھولنے کا — آپ کو چاہیے تھا ہمیں بلائے اندر صرف عورتیں موجود ہیں“

مکھیا کے ساتھ آنے والے سانسی بولے۔

جواب میں سیتارام نے انہیں ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”دیکھو تھا نیدار صاحب قانون کو اس طرح ناجائز استعمال نہ کرو۔

مکھیا جانتا تھا کہ انہیں صرت وقت ٹالنا ہے۔

سیتارام اور سانیوں کے درمیان بحث شروع ہو گئی۔ وہ جان بوجھ کر بال کی کھال اُٹا

رہے تھے۔ مزید دس منٹ اس تو تکار کی نذر ہو گئے۔ جب سانیوں کو اطمینان ہو گیا کہ

”سب اچھا ہے تو مکھیا نے خود ہریش کو رکنا نام لے کر آواز دی۔

”کڑیے — دروازہ کھول دے۔ تھا نیدار صاحب اپنی تسلی کر لیں۔ پتہ نہیں

لوگ غریبوں سے کیوں زیادتی کرتے ہیں۔ کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں“

وہ بڑبڑانے لگا۔

ہریش کو رنے دروازہ کھولا تو میدان صاف ہو چکا تھا۔

سامنے دوپل کے برآمدے میں ایک چارپائی پر مکھے سانس کی بیماریا بیٹھی تھی یا

گھر کا ایک نوکر موجود تھا۔ پولیس والوں کے ساتھ پندرہ بیس سانسی بھی اندر آ گئے۔

”تم لوگ باہر نکلو“

حوالدار جگن ناتھ نے انہیں ڈانٹا۔

انہیں حوالدار صاحب — یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ لوگوں کے پاس تو تلاشی کا دارنڈ

بھی موجود نہیں۔ اور آپ دھونس سے مکان کی تلاشی لے رہے ہیں — ہم تو قانون کی

کرنے کے لئے آپ کو اس زیادتی کی اجازت دے رہے ہیں۔ ورنہ آپ ایسا نہیں کر سکتے

آپ کا کیا اعتبار اپنی طرف سے یہاں کچھ رکھ کر مقدمہ بنا لیں۔ ہمارے سامنے تلاشی لیں“

مکھیا نے سیتارام کو چڑاتے ہوئے کہا

سیتارام کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی زبان کاٹ دیتا۔

ان لوگوں کے یہاں جمع ہونے سے ہی اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اب اس کے لئے

اندازہ نہیں بچا —

یہ بڑے سکار بد معاش تھے —

اب سیتارام کو رہ کر یہ پچھتا وہ لگا رہا تھا کہ اس نے بی ایس ایف کی مدد کیوں نہ

مانگی کی۔ اس طرح کم از کم وہ حنیف خاں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار کر کم از کم اپنے دل کی

پیرس تو نکال لیتا اب تو دونوں طرف سے وہ مارا گیا۔

مزم بھی نکلی گئے اور مال بھی نہ ملا۔ اپنا منہ اس نے الگ سے کالا کر دیا۔ کیونکہ اس

ناکام چھاپے کا ضرور نوٹس لیا جائے گا۔

اس کے جوانوں نے بڑی بددلی سے دو تین کمروں میں تانک جھانک کی۔

لیکن —

یہاں ان کے لئے تھا ہی کی جو انہیں ملتا۔

مالیوس ہو کر گردن جھکاٹے وہ سیتارام کے ساتھ تھانے کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔

سیتارام نے واپس لوٹتے ہوئے دل ہی دل میں تم کھائی تھی کہ وہ ان سانیوں کی زندگی ضرور

جہنم بنا دے گا خواہ اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔

آج ان لوگوں نے واقعی اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔

مکھیا سانس تو نے اچھا نہیں کیا — میرے ساتھ دشمنی تجھے ہینگنی پڑے گی۔

بالآخر وہ چھٹ پڑا۔

کمال ہے ہمارا ج ایک تو ہم آپ سے تعاون کریں۔ آٹھے آپ ہمیں کو کوس رہے ہیں اس

دل میرا کیا تصور ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ مکان کے اندر نہیں گھس سکتے تھے — کمال ہے جی

ایک تو زیادتی کی ہے کہ بغیر وارنٹ کے گھر کی تلاشی لی اٹا دھکیاں دے رہے ہو — کہنا تو

نہیں چاہیے لیکن یہ تو اٹا چور کو توال کو ڈانٹنے والی بات ہو گئی ناں —

مکھیا سانس کہاں قابو آنے والا تھا۔

”بہنو تم بہت ٹر ٹر کر رہے ہو ناں — کل ہی اس کا مزہ چھکا دوں گا“



اس مرتبہ حوالدار لیکن ناتھ نے غیرت دکھائی۔

”دیکھو سینا رام جی — ہم بھی عزت دار لوگ ہیں — اس طرح اگر تمہارے ملازموں نے مجھے گالیاں اور دھمکیاں دینا بند نہ کیا تو میرے لوگوں کو بھی غصہ آ سکتا ہے۔ اور کوئی غلط صورت حال پیدا ہوئی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔“

کھٹیا کے منہ سے یہ نکلنے کی دیر تھی کہ باقی سب نے ہی بولنا شروع کر دیا۔

”چلو چلو — دیکھ لوں گا ان سب کو۔“

سینا رام نے گاؤں کے باہر ایک محفوظ مقام پر کھڑی اپنی جیب میں بیٹھ کر اپنے جوانوں کو واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈریوار نے اُس کے اشارے پر جیب بھگادی تھی۔ بڑی دُور تک اسے اپنے تاقاب میں سانیوں کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔

اُس کا خون کھولتا رہا۔

لیکن —

اب وہ ٹھٹھے دماغ سے کچھ کرنے کا قائل ہو گیا تھا۔ اس غصے کے ہاتھوں نے متعدد مرتبہ شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ اب وہ کوئی نیا تماشہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس نے اگلے ہی روز اپنا بدلہ چکالیا جب نزدیکی گاؤں کے ایک ”چور“ سے اپنے ”بیان“ میں کہا کہ ہاں اُس نے چوری کی دو بھینسیں کھٹیا سانی اور اُس کے بیٹے کے ہاتھ فروخت کی تھیں۔ اس مرتبہ خصوصی پولیس فورس کی مدد سے وہ کھٹیا اور اُس کے بیٹوں کو تھانے میں لے

آیا تھا۔ ساری رات وہ اُن پر تشدد کے پہاڑ توڑتا رہا۔

لیکن —

بے سود —

اس طرح وہ بھی جانتا تھا کہ کل والی بے عزتی کا بدلہ تو نہیں لے سکتا۔ بس ایک ذرا الگ کو قرار سا لگایا تھا۔ تیسرے روز سانیوں نے باپ بیٹوں کو اُس کی حراست سے چھڑا لیا۔

یوں تو حنیف خاں کو ایک روز یہاں سے واپس جانا ہی تھا۔

لیکن —

اس طرح اچانک آپڑنے والی بیٹیا سے متعلق کبھی کبھی سانی کے لڑکوں نے بھی نہیں چاہتا۔ تروک اُسے اپنے ساتھ بھگاتا گاؤں کے اُس محفوظ ٹھکانے کی طرف آنکلا تھا جہاں پہنچ وہ خود کو درے محفوظ سمجھتے تھے۔

”حنیفے شہر چل — میرے خیال سے اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ سینا رام واپس آ گیا ہے۔

وہ کوئی تماشہ لگانے رکھے گا“

تروک نے چلتے چلتے کہا:

”نہیں یاد تروکی — بس تیرا بڑا شکریہ۔ اب مجھے سرحد پار کر ہی لینی چاہیئے۔“

حنیف خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

”حنیفے کیا بات ہے یار — تو ایسے.....“

”کوئی بات نہیں تروک — اُدھر ماں بھی رہتی ہے۔ اب ایکشن کچھ دنوں بعد تو ہوں

گئی۔ اگر فضل شاہ جیت گیا تو پولیس کی مدد سے ہمیں بہت تنگ کر دئے گا۔ میں چاہتا

دل کر والدہ کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کم از کم میں اپنے باپ کی روح کے سامنے شرمندہ

ہوں ہونا چاہتا۔“

اُس نے تروک کی بات کاٹتے ہوئے کہا

تروک نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی حالات سادہ گار نہیں ہیں۔

لیکن —

حنیفے کی ضد کے سامنے اُسے ہتھیار پھینکتے پڑے۔

حنیف خاں نے البتہ اُس کی یہ بات ضرور مان لی تھی کہ وہ سرحد آج ہی عبور نہیں کریگا

لڑکے سینا رام کے ناکام چھاپے کے بعد اُن لوگوں نے سرحد پر بڑے ناکے لگا دیئے ہوں گے۔

وہ تروک کے ساتھ اسی رات شہر میں اُن کے ایک ٹھکانے پر آ گیا یہاں تین دن اُس

سے ناخوشی سے گزار دیئے۔

چوتھے دن مکھے سانس کی بیوہ، بیٹیاں اور بیٹے خود اُسے رخصت کرنے آئے۔  
حنیف خاں کے ”ناں ناں“ کہنے کے باوجود انہوں نے ایک خطیر رقم اُس کے پہلے بانٹ دیا  
تھی۔

”بیٹا تو یہ سمجھ کر رکھ لے کہ یہ تیرے باپ کے حساب کے پیسے نکلتے ہیں۔ اُس  
رخصت تو کر رہے ہیں لیکن ہمارے دل نہیں مانتے۔ تجھے تیرے اللہ رسول کی قسم ہے  
جب کوئی مشکل پڑے تو اس طرف آتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا۔“

مکھے سانس کی بیوہ نے بو جھل دل سے کہا  
”ماسی — تو مطمئن ہو جا — وہاں کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

حنیف خاں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔  
جیسی اُسے سرحد تک خود چھوڑنے آیا تھا۔  
وہ تو دوسری طرف جانے پر بھی بضد تھا۔

لیکن —

حنیف خاں نے ایک طرح اُسے زبردستی ہی واپس لوٹایا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا  
کہ اب وہ ایک مفروضہ شہاری کی حیثیت سے اپنے گھر جا رہا ہے۔ اُسے تو خود اپنی حفاظت  
کا بندوبست کرنا تھا۔ اگر خدا خواستہ جتنی کچھ ہو جاتا تو وہ ساری زندگی اُس کے گھر والوں  
مندہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔

جتنی آنسو بہاتے ہوئے واپس لوٹا تھا —

سرحد کے آر پار آنا جانا حنیف خاں کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔

لیکن —

آج وہ اپنے ہی ملک کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔  
علم تھا کہ فضل شاہ سے زیادہ اس بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ حنیف خاں کا زندہ رہنا  
کی موت ہے۔ وہ حنیف خاں کو مردانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالے گا۔

اس کے ہاتھ کتنے لمبے تھے ؟

تازن اور صبر اتم دونوں کی دنیا میں اُس کی ساکھ کیسی تھی ؟

اس بات کا اندازہ حنیف خاں سے زیادہ بہتر کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔

اس نے رات کے پہلے پہر ہی سرحد عبور کر لی تھی اور چوڑوں کی طرح دبے پاؤں

اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا تھا۔

گھر کے اندر دنی جتنے میں اُس کی مخصوص دستک پر جس شخصیت نے دروازہ کھولا۔

اُسے دیکھ کر حنیف خاں ایک لمحے کے لئے تو ڈگمگا ہی گیا تھا۔

یہ صغرا تھی —

اُس کی منیگر —

اُس کے باپ کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ اُس کی زندگی میں صغرا کو نبیہ کر لے آئے۔

ناید اُس کی ماں کو ایسے دیکھ کر اُس کے ماموں نے اپنی بیٹی کو ابھی سے اپنی بہن کے گھر بھیج

دیا تھا۔

”تم —“

بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں میں — میں تمہارے جانے کے دوسرے ہی روز آگئی تھی۔ چاچا چھوڑ گیا تھا۔

بے جا نہیں ہے ناں —“

صغرا نے اپنی دانست میں شاید اپنی صفائی پیش کی تھی۔

”اُم — میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اچھا جاؤ ماسی کو اطلاع کرو۔ اور ہاں کسی کو میرے

آنے کی خبر نہیں ہونی چاہئے سمجھ گئی ناں۔“

حنیف خاں نے کہا۔

صغرا چلی گئی —

تھوڑی دیر بعد اُس کی ماں اور نذر محمد آگئے۔ کافی دیر تک اُس کی ماں حنیف

لینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔

”بس کر جا ماں — تو کیوں روتی ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں — مر نہیں گیا۔“

حینت خاں نے اُسی تسلی دی۔

حینت نے — میرے بچے۔ اب حالات پہلے والے نہیں رہے۔ نتھو کی زندگی میں اس بات تھی۔ اس علاقے کی ساری پولیس بدل گئی ہے۔ فضل شاہ نے سرکار کو گزارش کیا تھا کہ تمہارا مقدمے دار بنا دیا ہے۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں آسکتی ہے۔ خدا بڑا کرے برادری والوں کا جو ہمارے ساتھ کھڑے ہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہے یہاں سے ہم نکل ہی جائیں۔“

نذر محمد نے کہا۔

میں نذر محمد۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا جس زمین پر میرے خاوند نے جان دی ہے میں اُسے چھوڑ کر جیتے جی نہیں جاسکتی۔ میری قبر نتھو کے ساتھ ہی بنے گی۔“

نتھو کی بیوی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

حینت خاں نے اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی ماں کو اپنے خاوند کی قبر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

”بیٹا۔ مجھے تجھ پر مان ہے۔ تو نے اپنے باپ کا بدلہ لے کر میرا کلیہ ٹھنڈا کر دیا۔ بس اب میری آخری خواہش پوری کر دے۔ اپنی اس امانت کو بھی لے جا اور کسی دوسرے شہر میں گھر بنا لے۔ پولیس کو گرفتاری نہ دینا بیٹا۔ فضل شاہ تمہیں زندہ باہر نہیں آنے دے گا۔ سردار رشید اپنے بھائی کو پرچے سے نکلوانے کے لئے اُس سے صلح کر لے گا اور دونوں لے کر تمہیں۔“

اس سے اگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

”میں جانتا ہوں ماں۔ تو فکر نہ کر۔ برادری والے ابھی اتنے بے غیرت نہیں بن گئے کہ تجھے تنہا چھوڑ دیں گے۔

مجھے ابھی فضل شاہ کا کھانا بھی مکمل کرنا ہے۔ پھر لے جاؤں گا صغیر کو بھی

حینت خاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تینوں صبح تک باتیں کرتے رہے۔!!

انہوں نے گاؤں میں کسی کو کانوں کان اُس کی آمد کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔

روز دہیر گئے ٹھنک سوتا رہا اور شام کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گاؤں۔

اپہر گیا۔ اُس نے فی الوقت اپنے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ سوچ لی تھی۔

اُس نے پگمانے میں دوران قیام داڑھی رکھ کر اپنی شکل خاصی تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب بھی عام دیہاتیوں کے سے انداز میں اپنے علاقے سے باہر آ رہا تھا۔

شہر کی طرف جاتے ہوئے اچانک ہی اُسے زہرا کی بانی کا خیال آ گیا۔

زہرا نے اس کے ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور ابھی تک حینت خاں کے داغ پر اُس کے عشق کا بھوت بھی بُری طرح سوار تھا۔

اس نے عنایت بانی اور اُس کی بیٹی پر لاکھوں روپے لٹائے تھے۔ اُسے امید تھی کہ اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ کم از کم یہاں رہ کر وہ اگلے دو تین روز میں فضل شاہ کے حالات اور اپنے بعد پیش آنے والے واقعات سے تو آگاہ ہو سکتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ عنایت بانی کا فضل شاہ سے مستقل رابطہ رہتا تھا۔ اس طرح وہ زہرا کو ہاتھ میں لے کر فضل شاہ سے اپنا بدلہ بھی چکا سکتا ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے اُس نے رنڈی بازار کا رخ کیا تھا۔

اس کے پاس ایک خطیر رقم موجود تھی جس سے وہ اگلے دو تین ماہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے بھر سکتا تھا اس درمیان اُسے امید تھی کہ کسی دوسرے شہر میں وہ کوئی ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

رات اس نے شہر کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ایک مزار کے نزدیک آڑائی۔ صبح اس نے ناشتے کے بعد ہوٹل چھوڑ دیا۔ دربار پر سلام کرنے کے بعد اُس نے

پہل ہی رنڈی بازار کی طرف جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

رات ہی اُس نے شہر سے نیا شلوار قمیض لے کر میہنیں رکھا تھا اور اپنی رقم قمیض کے پٹے پر اُس کی واسکٹ میں چھپا رکھی تھی۔ اپنا حلیہ اُس نے خاصا تبدیل کر لیا تھا اور اُس

کا کوئی بہت نزدیکی شخص ہی اُسے پہچان سکتا تھا۔

اُس نے جان بوجھ کر عنایت بائی کے کوٹھے پر دن کے اوقات میں جان بوجھ کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شام کے بعد بازار کی رونق بڑھ جاتی تھی اور کوٹھے پر رہنے والوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

زہراں بائی کا کوٹھا اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔

یہ سیرٹھیاں وہ درجنوں مرتبہ پڑھ اور اتر چکا تھا۔

اُس نے رکشہ بازار کے باہر ہی چھوڑ دیا اور اب پیدل ہی سر جھکائے کوٹھے کی طرف آنے لگا۔ بغیر دستک دیئے وہ چپ چاپ کوٹھے کی سیرٹھیاں پڑھ گیا۔

پہلے ہی کمرے میں زہراں صوفے پر کر دٹ کے بل لیٹی۔ کچھ گنگنار ہی تھی۔ آہٹ ہرنا پر اُس نے سر کر دیکھا تو ایک لمبے کیلئے وہ دنگ ہی رہ گئی۔ اُسے ہرگز امید نہیں تھی کہ حنیف اس طرح کبھی چپ چاپ آسکتا ہے۔ وہ اب ایک مفرد اشتہاری تھا۔ ریاست شاہ کا قاتل۔

لیکن

دوسرے ہی لمحے اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

تربیت یافتہ طوائف زادیوں کی طرح اُس نے اس طرح بائیں پھیلا کر حنیف کا استقبال کیا جیسے اس کے لئے باؤلی ہوئی جا رہی ہو۔

حنیف خاں نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی اور فوراً ہی قمیص کی ایک تھپی

میں رکھے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اُسے تھما دیئے۔

”اس کی کیا ضرورت تھی۔ ایک تو اتنے دنوں بعد آئے ہو اور۔“

زہراں بائی نے پیشینہ و طول الفنون کی طرح ہاتھ بڑھا کر نوٹوں پر چھیٹے ہوئے کہا۔

”کچھ لا نہیں سکا۔ کوئی تحفہ تو تمہارا سے لئے لانا ہی چاہئے تھا۔“ میری طرف سے

تحفہ ہی سمجھ کر رکھ لو۔“

حنیف خاں نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”تم خود جو آگئے۔ اس سے بڑا تحفہ میرے لئے کیا ہوگا۔“

اس نے حنیف خاں سے لپٹے ہوئے کہا۔

زہراں کو اپنی ماں کا انتظار تھا۔ فضل شاہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے حنیف کی گرفتاری میں مدد دی تو اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر اُسے شک بھی ہو گیا ہوں نے حنیف خاں کو اپنے پاس پناہ دی تھی تو انہیں برباد کر کے رکھ دے گا۔

دونوں ماں بیٹی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فضل شاہ جو کہتا ہے وہ کرنے کی طاقت بھی ہوتا ہے۔ یوں بھی حنیف خاں نے اُس کے بھائی ریاست شاہ کو قتل کیا تھا جو کوئی معمولی ماں نہیں تھا۔

عنایت بائی تھوڑی دیر بعد ہی آگئی۔

حنیف خاں کو وہاں دیکھ کر پہلے تو وہ چونکی پھر فوراً ہی اُس نے بھی اپنے چہرے کے زات نارمل کر لیے۔ اُسے علم تھا کہ حنیف خاں بہر حال ایک اشتہاری ہے۔ ان حالات کی حکمت سے ہی اس پر قابو پایا جاسکتا تھا۔

عنایت بائی نے بھی پیشینہ ورنہ اُس کی طرح اُس کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔

اُس نے نوکر سے وہیں حنیف خاں کی خاطر تواضع کے لئے کچھ منگو لیا تھا اور اب دونوں ایک لاکھ چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آگئی تھی۔ آنے سے پہلے اُس نے اپنی بیٹی کو آنکھ کے گوشوں اشارے سے اُس کے فرائض سے آگاہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی نوکر کھانے پینے کے لیے کچھ لے آیا۔

عنایت بائی کے ہاتھ پاؤں پکپکا رہے تھے۔ اُس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

کے کبھی طرح پولیس کو حنیف خاں کی آمد سے مطلع کرنا تھا۔ بصورت دیگر عین ممکن تھا کہ اگر نسل شاہ کو اس بات کا شک ہی گزر جاتا کہ وہ یہاں سے ہو کر گیا ہے تو اُن کی زندگی جہنم بنائی جاتی۔ یوں بھی ایک مفرد اشتہاری کا اُس کے کوٹھے پر کیا کام؟

قریباً دس منٹ بعد اُس نے نوکر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر صورتحال سے آگاہ کرنا

پہا اور اُس سے حنیف خاں کا تعارف کروا دیا۔

”یا مولانا خیر — بی بی یہ کیا غضب ہو گیا —“

نوکر کے تو پاؤں ہی پھول گئے تھے۔

”ہوش کر — خبردار اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔ اُسے بھینک میں پڑھی تو ہمارا جان کو آجائے گا۔ موئے دفع ہو جا اور انسپکٹر اللہ دتہ کے پاس جا کر میری طرف سے ایسے ہی بتانا جیسے میں نے تمہیں سمجھایا ہے۔“

اُس نے سرگوشی میں نوکر سے کہا جو رزتے قدموں سے سڑھیوں کی طرف چل دیا۔ عین اُن لمحات میں کسی ضرورت کے تحت ہی حنیف خاں کمرے سے باہر نکل کر باغیچہ کی طرف آ رہا تھا۔ جب اُس نے نوکر کو عنایت بانی کے کمرے سے نکلنے دیکھا۔

”کیا حال ہے بابا شریف —“

اُس نے نوکر کو پہچان کر یہی پوچھ لیا۔

جواب میں اُس کی طرف سے جس ردِ عمل کا اظہار ہوا اُس نے حنیف خاں کی چھٹی آنکھ کو بیدار کر دیا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

اس نوکر سے وہ پہلی مرتبہ نہیں ملا تھا۔

لیکن —

اُس نے گھبراہٹ میں نہ صرف اُسے پہچاننے سے انکار کیا تھا بلکہ بڑی گھبراہٹ تیزی سے سیرٹھیاں اُتر گیا تھا۔

حنیف خاں بھی نتھو خاں کا بیٹا تھا — کوئی شہری بابو نہیں تھا نہ ہی یہاں تک عیسوں کا تا آ گیا تھا اُس نے شعور کی آنکھ کھولی تو بین الاقوامی سرحد کے آر پار جانا شروع کیا تھا۔ وہ ملکوں کی سیکورٹی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اُس نے اپنے باپ کے ساری زندگی چوری کی۔ وہ لوگ تو فضا میں خطرے کی بوسونگھ لیا کرتے تھے۔

اچانک ہی اُس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔

جان کے لالے پڑے تو زہراں بانی عشق کا بھوت ایک لمحے میں اُس کے سر اُتر گیا۔ اُسے اپنے باپ کی بات یاد آ گئی جس نے کہا تھا کہ مرد کو ہمیشہ عورت کا بالہ

زنا ہے ساری زندگی قانون چور کو نہیں پکڑ سکتا۔

لیکن —

عورت اور مرد کی چوری فوراً پکڑی جاتی ہے۔

”کیا بات ہے بی بی — شریف کچھ گھبرا یا ہوا ہے؟“

اُس نے عنایت بانی کے کمرے میں داخل ہو کر اس انداز سے اُس کی آنکھوں میں جاننے ہوئے یہ سوال کیا کہ عنایت بانی کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

چور کی ڈارھی میں تنکا کے مصداق اُسے بھی شک گرا کہ حنیف خاں نے شاید اُس کی مائش کو بھانپ لیا ہے۔

کچھ نہیں کچھ نہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ اہم کی زیادہ مقدار چڑھانی ہوگی — آج کچھ زیادہ ہی لشکر نے لگا ہے۔

عنایت بانی نے جسکے چہرے پر ہوا میاں اُڑ رہی تھیں نے کھسانی ملی کھانا پچے کی طرح اپنی صفائی پیش کر کے بظاہر حنیف سے زیادہ خود کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔

”میں فکر نہیں کیا کرتا عنایت بانی — اگر فکر مند ہوتا تو یہاں کیوں آتا لیکن ایک بات یاد رکھنا میرے ساتھ دغا کرنے والا کبھی بیخ کر نہیں جاسکتا۔ میں نے تمہاری بیٹی پر لاکھوں روپے اکس لئے نہیں لٹائے تھے کہ تم وقت آنے پر مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔“

اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے اپنی شلوار میں چھپا پستول ہاتھ میں پکڑ کر لہراتے ہوئے کہا۔

”بڑا بیخ بتاؤ۔ اپنے خضم کو کہاں بھیجا ہے؟“

”مہم میں..... میں مجبور ہوں حنیف — فضل شاہ سے.....“

اُس نے لڑکھرائی آواز میں سنایا۔

لیکن —

مکمل بات نہ کر پائی۔

حنیف خاں کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا اُسے علم تھا کہ یہاں سے تھا نہ بیشکل اسی بیشکل سافٹ پر ہے اور یہ کوئی جنگلی علاقہ نہیں۔ نہ ہی رات کا اندھیرا یہاں پھیلا ہوا

اُس نے اپنی دانست میں عنایت بائی کے نزدیک سے گزر کر آگے نکلنا چاہا تھا مگر بیڑھیوں کے راستے باہر بھاگ سکے جبکہ عنایت بائی نے یہ سمجھا کر وہ اس پر حملہ کرنے والے اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ حیح نکلی۔

لیکن  
کمل نہیں

حنیف خاں نے بجلی کی سی پھرتی سے اُس کے منہ پر ہاتھ جمایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا پستول کا دستہ اُس کے سر میں مارا۔  
عنایت بائی کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گئی۔  
زہراں بائی دوسرے کمرے میں سے اچانک ہی باہر نکلی تھی۔ اُس کے کالوں تک اپنے ماں کی حیح کی آواز پہنچ گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر اُس نے جو منظر دیکھا وہ اُس کیلئے قابل برداشت نہیں تھا۔ اُس نے بھی واپس بھاگنا چاہا۔

لیکن

بشکل دو قدم ہی بھاگ پائی جب حنیف خاں نے اُسے بھی آگیا۔  
اپنی ماں کے برعکس وہ حنیف خاں کا ایک تھپڑ ہی منہ پر لگا کر چکر لگی اور کمرے اندر جا گری دوبارہ اُسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

حنیف خاں یہاں سے خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا دماغ غصے سے گھوم رہا تھا۔ اُس کے باپ کی باتیں سند تھیں۔ طوائف آخر طوائف ہوتی ہے۔ حنیف خاں کو سب سے زیادہ غصہ خود پر آ رہا تھا کہ اُس نے اپنے دل و دماغ پر اس رنڈی کے عشق کا جھوٹا سوار کر لیا۔  
اُس نے زمین پر گری زہراں کے گریبان سے جھٹکا دے کر بٹوہ نکالا اور اپنی جیب میں بٹونس لیا۔ عنایت بائی کا پرس اُس کے سنگھار میز پر پڑا تھا حنیف خاں نے اٹل دیا اور اس میں موجود ساری کرنسی اور سونے کی انگوٹھیاں اور دو چوڑیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور چپ چاپ بیڑھیاں اتر گیا۔

اُس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے سے کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ اوپر کیا کا نام

ہے آیا ہے۔

بے لہجے ڈنگ بھرتا وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اور اُسے سٹیشن کی طرف چلنے

کا

عین اُن لمحات میں جب سب انسپکٹر اللہ دینا بابا شریف کی اطلاع پر اپنے جوانوں کو روز زر سے ڈانٹا فوراً تیار ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کا شکار بڑے اطمینان سے بیٹھی کچھل نشست پر ٹیک لگائے نئی منزلوں کی طرف محور داز تھا۔  
اُس نے سٹیشن کے نزدیک ٹیکسی چھوڑ دی۔

یہاں سے ایک رکتہ کے ذریعے وہ لاری اڈے پر پہنچا۔ پھر لاری اڈے سے ایک کمرے کے ذریعے اپنے ہوٹل تک اور وہاں سے ایک اور ٹیکسی کے ذریعے دوسرے ہوٹل تک پہنچا۔ اُسے کو توج میں بیٹھ کر دوسرے شہر اپنے ایک دُور کے عزیز رشتہ دار کے پاس جانا تھا۔

ان حالات میں سردار رشید کی طرف سے صلح کا پیغام فضل شاہ کے لئے نعت غیر مترقبہ تک نہیں تھا اُس نے دل ہی دل میں خود کو متعدد مرتبہ شاباش دے لی تھی۔ اس پیغام کا مطلب یہ تھا کہ سرداروں نے شکست تسلیم کر لی ہے کیونکہ فضل شاہ نے اپنی پکر بازیوں سے اس لئے کو بڑا سیاسی ایشو بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت پر اسمبلی کی طرف سے باقاعدہ اُردو مذمت پاس کروائی تھی اور اخبارات کی طرف سے پولیس پر لعن طعن کا سلسلہ ہنز جباری نام سردار رشید بڑا کامیاب آدمی تھا۔

سرداروں میں اُس کا جانا آنا بھی فضل شاہ کی طرح لگا رہتا تھا اور اُس کے مہربانوں نے اسے فی الوقت جھک جانے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ یہ ایک طریقہ تھا جس سے اُس کی جان بچ سکتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر فضل شاہ اور سردار رشید مذاکرات کی میز پر ایک مشترکہ دوست کے ہاں



اُس کے پاس فی الوقت اس آخر کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔  
 فضل شاہ کا کیس بڑا مضبوط تھا۔  
 سرکار دربار میں اُس کی رسائی بھی سردار رشید سے کچھ کم نہیں تھی۔  
 سیاسی دباؤ اُنک تھا۔

اور

سب سے بڑھ کر حنیف خاں کا خطرہ — وہ بھرا ہوا زخم خوردہ پیتا سب کوچ  
 پھاڑ کر رکھ سکتا تھا۔  
 ”ڈن“

اس کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا۔  
 غنی خاں نے فوراً فریج سے شیمپن کی بوتل نکال کر کھولی اور تینوں شیطانوں کے  
 درمیان خفیہ معاہدہ طے پا گیا۔

لگے ہفتے جب نئے انتخابات کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کروانے کی باری آئی  
 تو اس حلقے سے فضل شاہ کے مقابلے میں کسی نے کاغذات داخل نہ کروائے۔  
 سردار مرید چند روز بعد ضمانت پر باہر آ گیا۔ مقدمے کا سارا بوجھ عالم داد پر ڈال دیا  
 گیا تھا۔

## اک نئے موڑ پر!

شیر خان سے اُس کی ملاقات باپ کی زندگی کے آخری ایام میں ہوئی تھی جب وہ اُن  
 کے پاس ایک یو پیاری کی حیثیت میں آیا کرتا تھا۔ پھر اچانک وہ غائب ہو گیا تھا۔ شیر خان  
 علاقہ غیر کا رہنے والا تھا۔ اُس نے نذیر سے سوچی سے بھی شیر خان کا بھرپور تعارف کروایا تھا  
 شیر خان کے متعلق حنیف کو اس بات کا علم تو تھا کہ وہ اُسے گئے کو سنبھالتا ہے۔

لیکن

ابھی تک اُس سے کوئی کام لینے کی فورت نہیں آتی تھی۔  
 اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ فضل شاہ اُس کے جرائم کی فہرست طویل کر داتا جا رہا ہے  
 اور جب پولیس اُن طوائفوں تک پہنچے گی تو اُس کے خلاف ڈکیتی اور ارادہ قتل کے تین چار اور  
 مقدمے درج ہو جائیں گے۔

اُسے موت یا گرفتاری سے کبھی کوئی خوف لاحق نہیں رہا تھا۔

لیکن

وہ اس طرح فضل شاہ کو زندہ چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ جس  
 طرح بھی ممکن ہو فضل شاہ والا بوجھ بھی اپنے ذہن سے اتار دے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے  
 باپ کی قبر پر جاسکتا تھا۔

شیر خان کے ڈیرے تک اُسے دوسرے دن رسائی میسر آگئی۔ علاقہ غیر میں وہ اس  
 سے پہلے بھی دو مرتبہ آچکا تھا لیکن تب وہ یہاں مفرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بزنس  
 مین کی حیثیت سے آیا تھا۔



شیرخان نے اُس کا استقبال اس طرح کیا تھا جیسے نھو خاں شیرخان کا استقبال کیا کرتا تھا۔

”حیفے۔ خدا کا شکر ہے تم آگے۔ میں پرسوں ہی تمہارے علاقے سے واپس لوٹا ہوں۔ میں نے تمہارے دوست کو بھی تمہاری خبر کے لئے بھیجا تھا۔ اُسے بھی تمہارا پیرہن نہیں چل سکا۔“

شیرخان نے اُسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

”کون سا دوست؟“

حیف نے حیرانگی سے پوچھا۔

”وہ نذیر۔۔۔ نذیرا۔۔۔ اور کون؟“

شیرخان نے کہا۔

”وہ یہاں ہے؟“

حیف نے حیرانگی سے پوچھا۔

شیرخان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی لمحہ کرے کا دروازہ کھلا اور نذیر موجی کی شکل

حیف خاں کو دکھائی دی۔

”حیف خاں۔“

کافرہ لگاتا ہوا نذیر اُس سے یوں پلٹا جیسے ایک مدت سے اسی کے انتظار میں

سوکھ رہا ہو۔ اُس نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نھو خاں کی موت پر ٹوٹے پھوٹے

شروع کیے اور خود پر ہونے والے ظلم کی ایک شاندار کہانی گھڑ کر حیف خاں کو سنا دی۔

اُس نے ثابت کیا کہ حیف خاں کے ساتھ وفاداری اور محبت کے جرم کی اُسے فضل شاہ

نے یہ سزا دی ہے کہ اُسے جان پہچانے کے لئے بھاگنا پڑا اور اب فضل شاہ نے جھوٹے

الزامات کے تحت اُس پر اتنے مقدمات درج کر دئیے ہیں کہ اگر وہ واپس گیا تو ساری زندگیاں

جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی کٹ جائے گی۔

نذیر موجی گاؤں کے حالات سے مکمل باخبر رہا تھا۔

وہ یہاں پناہ لینے آیا تھا کوئی مستقل قیام کرنے نہیں۔ اُسے علم تھا کہ نھو خاں کو فضل

شاہ نے کسی طرح قتل کر دیا ہوگا۔ اُس نے ساری زندگی فضل شاہ کے ساتھ گزارا تھی اور

اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اس وقت حیف خاں کی ہر ممکن ہمدردی حاصل کرنا تھا۔

یہاں ایک طریقہ تھا جو اُس کی آنے والی زندگی میں آسانیاں پیدا کرتا۔

حیف خاں نے اُس کی توقعات کے عین مطابق نذیر موجی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دو

تین روز ہی میں دونوں ایک مرتبہ پھر پرانے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے منسک

ہو گئے۔

نذیرے کو اپنی اگلی زندگی کے لئے حیف خاں کا مضبوط سہارا درکار تھا۔

یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رزق حلال اُس کی قسمت میں نہیں لکھا۔ وہ پہلے

بچھرا کھاتا آیا ہے۔ اور اب بھی حرام ہی کھائے گا۔ اپنی محنت سے کما کر کھانا اُس نے کبھی

بیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر اُسے حیف خاں جیسے بہادر شخص کا سہارا مل جاتا تو اپنی صلاحیتیں بروئے

کار لاکر وہ اُس کے ذریعے اتنی دولت حاصل کر سکتا تھا جس سے آئندہ ساری زندگی

گزار سکے۔

لیکن۔۔۔

حیف خاں کے دماغ پر تو ایک ہی بھوت سوار تھا۔

وہ کسی بھی طرح فضل شاہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

”حیفے! میں تم سے زیادہ اس کا ڈسا ہوا ہوں۔ میں نے ساری زندگی اس حرامی کی

خدمت میں گزار دی اور اُس کا صلہ مجھے اُس نے کیا دیا؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے حیف خاں

میرے فضل شاہ کے لئے کیا کیا نہیں کیا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ممکن

ہے اُس سے انتقام لوں۔ لیکن ابھی ہمیں صبر کرنا ہوگا۔“

ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ تمہیں گاؤں کے حالات کا علم نہیں ہے۔ میں

ہاں ہی واپس لوٹا ہوں۔ فضل شاہ بڑا مکار آدمی ہے حیف خاں۔ سردار

بزرگمانت پر رہا ہو چکا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ سرداروں اور فضل شاہ

کے درمیان صلح ہو چکی ہے۔ اس سے بڑا اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فضل شاہ  
 اکیلا ہی ایم پی اے کا امیدوار ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سردار رشید نے اپنے بھائی کا  
 رہائی کے عوض یہ کرڈا گھونٹ پی لیا ہے۔ لیکن میں فضل شاہ کی رگ رگ کو جھٹکا ہوں۔  
 میں جانتا ہوں کہ اُس نے سرداروں کے لئے کبھی کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑا ہوگا۔ وہ ان  
 حالات میں سرداروں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ دونوں بد معاشوں نے اس بار  
 سے اتفاق کیا ہوگا کہ تمہیں مل کر ختم کر دیں۔ حنیف خاں ابھی تم اُن کے سامنے سے بھی  
 دُور رہو۔ اور میری ایک اور بات دھیان سے سن لینا۔ فضل شاہ اب ایسی حرکت  
 کرے گا کہ تم اگر چھپے ہوئے ہو تو تمہیں طیش دلا کر سامنے لائے اور گھیر کر مار ڈالے گا۔  
 میرے جیتنے جی تم اُس کی سازش کے شکار نہیں ہو سکتے۔ بہت ہوشیار رہنا۔ میرے خیال  
 سے تو ہمارا یہاں زیادہ دیر تک رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ میں نے یہاں ایک  
 دو ایسے چہرے بھی دیکھے ہیں جو لوگ کبھی ریاست شاہ کے پاس پناہ لینے آیا کرتے تھے  
 ایک روز نذیر نے اُسے سمجھانے کے انداز میں حقائق کا تلخ احساس دلائے  
 ہوئے کہا۔

”لیکن ہم جاؤں گے کہاں؟“

حنیف خاں نے پوچھا۔

”یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میرے پاس کئی ٹھکانے ہیں۔“

نذیر نے اتنے پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ حنیف خاں کو واقعی اس کی بات پر یقین

کرنا پڑا۔

شیر خان کے پاس چند روز قیام کرنے کے بعد ایک روز دونوں وہاں سے آگے

شیر خان نے گورکھ بھیجی تاکہ انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کے لئے کوئی

بوجھ ہیں۔

لیکن

یہ بات حنیف خاں بھی جانتا تھا کہ شیر خان کا بزنس بھی اُن کے علاقے میں ہے۔

نکارا بلکہ بھی فضل شاہ سے ہو سکتا ہے۔

اُسے فضل شاہ سے ہر صورت بچ کر رہنا تھا۔

نذیر اُسے ملک کے ایک بڑے شہر میں لے آیا تھا جہاں انہوں نے ایک مکان کو لے

لے لیا۔

لیکن

چند روز کے بعد ہی نذیر نے کے مشورے پر اُس نے اس شہر کی ایک غریب سی بستی

میں دو کمروں کا ایک مکان خرید لیا۔ نذیر نے اُسے بتایا تھا کہ اس طرح کسی کا دھیان

ن کی طرف نہیں جائے گا اور مستقبل میں حنیف خاں اپنی ماں اور بہن کو بھی یہاں لا کر آرام

سے رہ سکے گا۔ حنیف خاں نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ کر اپنی شکل ایسی بنالی تھی کہ وہ پہلے

سے بہت مختلف نظر آنے لگا۔

انہیں یہاں رہتے دس پندرہ دن گزر گئے تھے جب ایک روز نذیر اُسے دو تین

دن بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اُس نے حنیف خاں کو بتایا تھا کہ وہ فضل شاہ کے حالات

کا پتہ کرنے جا رہا ہے اور اُسے مکمل رپورٹ لا کر دیگا۔

اس نے حنیف خاں کو کچھ بتایا تھا کہ وہ یہاں لوگوں سے زیادہ تعلقات نہ بنائے اور کسی

لڑکھائی اصلیت کی ہوا نہ لگنے دے اس میں دونوں کی بقا تھی۔

حنیف خاں ابھی تک اس کی باتوں پر آنکھیں اور دماغ کے درپے بند کر کے عمل کرتا

نہ تھا۔ کیونکہ ان شہروں کے متعلق اُس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُسے اپنے علاقے

میں کچھ کے دونوں اطراف سینکڑوں راستے از برستھے سینکڑوں دیہاتوں کے نام یاد تھے۔

لیکن

یہاں وہ اجنبی تھا۔

شاہد اُس کی بقا کا راز بھی یہی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کی زندگی میں اپنے ملک کی

نہیں دیکھی دنیا سے زیادہ رابطنہ نہیں رکھا تھا۔

تیسرے روز رات گئے دروازے پر ایک آہٹ نے حنیف خاں کو چوکنا کر دیا۔  
اُس نے پھرتی سے اپنے پاس موجود پستول اٹھایا اور دروازے سے لگ کر کھڑا ہوا  
یہ پستول اُس نے کبھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

”کون“؟

اُس نے دروازے کے نزدیک جا کر پوچھا۔

یار میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔ اور یہاں کون آسکتا ہے۔“

نذیرے کی آواز سن کر اُس کے تپتے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

دروازہ کھلنے پر ایک ادبیرت اُس کی منتظر تھی۔

اس مرتبہ نذیرے کی آمد ایک نوجوان دو شیرہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ جو بڑی بے

سے اُس کے ساتھ اندر آگئی تھی۔

”سلام کر۔ اپنا یار ہے یوسف“

نذیرے نے حنیف خاں کا تعارف اُس کے جعلی نام سے اپنے ساتھ آنے والی

سے کرواتے ہوئے کہا۔

انہوں نے یہاں اپنے نام تبدیل کر کے رہائش اختیار کی تھی۔ حنیف خاں کا نام یوسف

ہو چکا تھا اور نذیرے کا امین۔

حنیف خاں حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ ابھی تک اس نے لڑکی کا تعارف

نہیں کر دیا تھا۔ لڑکی نذیرے سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھی حنیف

دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا جبکہ نذیرا لڑکی کے ساتھ اُس کمرے میں سو رہا۔

صبح اٹھ کر وہ خود حنیف کے کمرے میں گیا تھا جس کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔

”کون ہے یہ؟“

حنیف خاں نے چھٹتے ہی کہا۔

”گھر والی ہے میری اور کون ہوگی؟“

نذیرے نے لاپردائی سے جواب دیا۔

”نذیرے۔۔۔ میرے ساتھ جھوٹ نہیں چلے گا۔ سچ بچ بنا کون ہے یہ۔ کہاں

سے لایا ہے تو اسے اپنے ساتھ؟“

حنیف خاں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”چھوڑ یار کیا کرے گا جان کر۔ تیرا کیا لیتی ہے۔ اچھا ہے ہمارے ساتھ کوئی عورت

بھی ہوگی تو کسی کو معمولی سا شک بھی نہیں گزرے گا۔ اسی طرح دو آدمیوں کا بھی ایسے رہنا

ٹھیک نہیں ناں۔“

نذیرے نے اُسے بہلانے کے انداز میں کہا۔

”نذیرے۔۔۔ تو جانتا ہے کہ مجھے جھوٹ سے کتنی نفرت ہے۔“

حنیف خاں کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔

”دیکھ حنیف خاں۔ میں نے تیرے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے۔ ہماری بھلائی اس

میں ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کا سہارا بنے رہیں۔ میں تیری طرح بہادر آدمی نہیں

ہوں لیکن میرے سر میں دماغ ضرور موجود ہے۔ ہم غمخوروں کی زندگی گزار رہے ہیں ہمیں تنم

تدم پر پیسے کی ضرورت پیش آئے گی۔ تیرے میرے پاس کوئی قانون کا خزانہ نہیں ہے۔ نہ

ہی ہم دونوں میں سے کوئی بزنس میں ہے اور نہ ہم دونوں محنت مزدوری کر سکتے ہیں۔ کم از کم

میں تو نہیں کر سکتا۔ یہ سہارا کاؤں نہیں۔ نہ کوئی سرحدی علاقہ ہے جہاں بارڈر کر اس کر کے

تم کسی کی گائے بھیس کھول کر لے آؤ گے۔ شہر کی زندگی کو تم اب تک سمجھ چکے ہو گے۔

یہاں ہماری کوئی ماں نہیں بیٹھی جو ہمیں گھی کے نوالے کھلادیا کرے گی۔ ہمیں ہاتھ پاؤں ملانے

ہی پڑیں گے۔ میں تو یہی فن جانتا ہوں۔ دو تین مہینے میں اگر ایک آدھہ شکار لیا ہاتھ

لے جلائے تو ہمارے دو تین مہینے آسانی سے گزر جایا کریں گے۔ میں نے اس شہر کے لڑکی

بازار میں بڑی مشکل سے واقفیت نکالی ہے۔ ابھی اسے یہاں اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا

ناکارہ گرد کے لوگوں کو ہم پر پوری طرح یقین آجائے جب ”کڑکی“ آئے گی تو اسے آگے پھلائی کر

دیں گے۔“

عام حالات میں اول تو نذیرا کبھی اس نوعیت کی گفتگو ہی حنیف خاں سے کرنے کی جرأت

نہ کرتا۔ اگر کبھی وہ یہ بات کہہ بھی دیتا تو حنیف خاں اس کی زبان کاٹ کر پھینک دیتا اس کے لئے یہ تصور بھی کرنا بہت اذیتناک تھا کہ وہ تمھو خاں جیسے نامی گرامی بد معاش کا بیٹا ہو کر رزندیوں جیسے کام کرے گا۔  
کسی عورت کو درغلا کر اغوا کرنا اور اسے بازار حسن میں فروخت کر دینا نذیر سے کا پتہ رہا ہو گا۔

لیکن —

اُس نے کبھی اشارہ بھی اس بات کا ذکر حنیف خاں سے نہیں کیا تھا۔  
آج وہ کھل کر اس طرح بات کر رہا تھا جیسے حنیف خاں اس ذلیل دھندے میں اس کا پارٹنر رہا ہو۔  
اُس کا خون کھول اٹھا

”نذیر سے — تو مجھے آج سے نہیں جانتا — تو نے یہ جرأت کیسے کر لی۔ مجھے تو نے سمجھا کیا ہے“؟  
اُس کا دماغ غصے سے پھٹنے لگا تھا۔

”آواز آہستہ کر لے حنیف — دماغ ٹھنڈا رکھ۔ یہ بات کبھی پاگل پن کی حالت میں بھی دماغ سے نہ نکالنا کہ تم دونوں مفروز ہیں۔ ممکن ہے گرفتاری کی صورت میں مجھے فضل شاہ پانچ سات سال کی قید کو دادے لیکن تیرے کھاتے میں اس نے کون کون سا قتل ڈال رکھا ہے اس کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے الگ ہو کر اپنا وقت گزارے گا تو تیری مرضی — میں بھوکوں نہیں مرنا چاہتا۔ جب کوئی متبادل روزگار مل جائے گا تو میں یہ دھندہ چھوڑ دوں گا۔ فی الوقت میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اور کوئی کام نہیں آتا نہ میں تیری طرح کوئی بہادر انسان ہوں — آگے تیری مرضی“

زندگی کے کسی کمزور ترین لمحے میں بھی وہ اتنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا؟  
حنیف خاں نے جینے جی کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن —  
آج اُسے یوں لگا جیسے اُس کی جنس بھی تبدیل ہو گئی ہو۔ اُسے خود پر حیرت ہوئی کہ بے کی ایک ہی دھمکی نے اُسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔  
اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے؟ کہ ہر حالے؟  
دل تو اُس کا بھی چاہتا تھا کہ ابھی دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلہ گھونٹ کر قصہ ہی پاک

دے۔

لیکن —

وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُسے بھی زندہ رہنا تھا۔ ابھی اُس کی ماں اور سونیوالی لازندہ تھیں۔  
صغرا اُس کی عزت تھی —

اگر وہ مر جاتا تو فضل شاہ اُس کی عزت کا سہ بازار نیلام کر دیتا۔  
وہ جانتا تھا کہ اُس کی برادری کے لوگ لاکھ بہادر اور غیرت مند سہی لیکن یہ حقیقت نا بگڑا قائم تھی کہ اُس کا باپ مر چکا ہے —

نقص خاں کی زندگی میں یہ لوگ کسی بھی گرفت کے سامنے سینہ سپر ہو سکتے تھے لیکن بدوہ آخر تک تک فضل شاہ اور سرداروں کی بد معاشیوں کا سامنا کریں گے۔ یہ لوگ اُن بڑی طرح ناطقہ بند کر دیتے کہ ساری برادری کو جان کے لالے پڑ جاتے —  
یوں بھی جب سائیں ہی زندہ نہ رہے تو اُن کی شرم کون رکھتا پھرے گا؟  
وہ جلد از جلد اپنی ماں اور میگتر کو اس جہنم سے نکال لینا چاہتا تھا۔  
اُسے اور تو کچھ نہ سوچھا۔ غصے سے ہونٹ کا شتاہ گھر سے باہر نکل گیا۔  
”کہاں جا رہے ہو“؟

نذیر سے نے لا پرواہی سے دریافت کیا تھا۔

”کسی پٹنے“

حنیف نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

شہنشاہ حنیف خاں — اپنا دماغ اگر ٹھنڈا رکھو گے تو کامیاب رہو گے۔  
بیٹا تم تو کیا اگر تمہارا باپ نہ تو خفاں بھی یہاں ہوتا تو میرے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ یہ  
بھی نذیرا ہوں۔ نذیرا سانپ — اگر تیرے ہاتھوں سے ہی یہ کارنامے انجام نہ پائے۔  
تو کسی موچی کی اولاد نہ کہنا۔

اُس نے دل ہی دل میں حنیف خاں کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔  
”اٹھ جا شیر کی بچی۔ صبح ہو گئی ہے۔ کچھ کھا پی لے۔“  
اپنی داشتہ کی کمر سہلاتے ہوئے اُس نے ہوسناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھا  
”ہائے اللہ — ساری رات سوئے نہیں دیا۔ اب تو ذرا آرام کر لینے دو۔“  
شریفان بی بی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔  
دونوں شیطاں ایک دوسرے سے لپٹ کر دوبارہ لمبی تان کر سو گئے۔

ایکشن ہوا اور فضل شاہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کے بدیشیز جلسوں کی صدارت سردار رشید نے کی۔ سردار  
کی چسپیں اور کاریں فضل شاہ کی معاونت کرتی رہیں۔ سردار رشید نے فضل شاہ کا  
کو اپنی کامیابی بنایا اور کہا تھا کہ فضل شاہ سے زیادہ اس میڈ کا کوئی حقدار نہیں ہے  
اُس کے بھائی ریاست شاہ کی قربانی رنگ لاکر رہے گی اور اس علاقے کی قسمت ضرور  
جائے گی۔

سردار رشید اور دیگر معززین کی طرف سے صوبائی حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ شاہ  
کی طویل خدمات خصوصاً ریاست شاہ کی قربانی اور پارٹی خدمات کے عوض اُس کی سبب  
کامیاب ہونے والے فضل شاہ کو صوبائی حکومت میں نمائندگی دی جائے تاکہ اس علاقے  
عوام کی محرومیوں کا ازالہ بھی کسی حد تک ہو سکے۔

اور

صوبائی حکومت نے اس اہم مطالبے پر فوراً کان دھرے تھے۔

ذریعہ اعلیٰ صاحب نے تین چار روز بعد ایک اہم تقریب میں فضل شاہ کو صوبائی وزیر بنانے  
کا اعلان کر دیا تھا اُسے بطور خاص سماجی بہبود کی وزارت دی گئی تھی تاکہ وہ سماج کی بچی  
نرکے بہبود کر سکے۔

آج شاہ پور میں جشن کا سماں تھا۔

ریاست شاہ کے مزار پر خصوصی چراغاں کیا گیا تھا۔ جہاں باقاعدہ محفل سماع منعقد ہوئی  
جس میں اُس کا بھائی وزیر سماجی بہبود سید فضل شاہ مہمان خصوصی تھا جبکہ اس محفل کی صدارت  
نیل شاہ کی درخواست پر سردار رشید نے کی تھی۔

ساری رات محفل سماع ہوتی رہی۔

لیکن

ایک محفل اور بھی اس کے ساتھ جاری رہی۔

اس محفل طرب کا خصوصی اہتمام فضل شاہ کی سویلی میں کیا گیا تھا۔ جہاں عنایت بانی کی  
بازمہراں نے حاضرین کے دلوں پر اپنی دلریا اور بہمانہ نائش سے بھلیاں بگرا رہی تھی۔  
نایت بانی نے اس محفل کی افادیت کے پیش نظر بازار سے پورا سکواڈ دانشاؤں کا منگوا رکھا  
ماہر فضل شاہ کے خاص مہانوں کو سامان عشرت فراہم کر رہی تھیں۔

سویلی کے قریباً تمام کمرے ان خصوصی مہانوں اور میزبانوں سے اٹے پڑے تھے۔  
ساری رات یہ رقص بھیس جاری رہا۔

صبح دیر گئے تک وہ لوگ بھی تان کر سوتے رہے۔

اس روز دوپہر کے بعد جب فضل شاہ اور سردار رشید ایک کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے  
تو اپنے علاقے کے غریب اور عوام کی خشک رگوں سے بچے کچھ ہوئے چند قطرے بھی  
پڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے تو دروازے پر بڑی موڈ بانہ آہٹ ہوئی اور شاہ صاحب  
ناجاہزت پر عنایت بانی اپنی بیٹی زہرا کے ساتھ ”کورنش“ بجاتی اندر آ گئی۔

”کہ عنایت بانی کوئی کمی تو نہیں رہ گئی تمہاری خدمت میں۔“

فضل شاہ نے اُس کی طرف دیکھ کر بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

”مولانا ندگیاں رکھے شاہ جی آپ کی — ہمارے تو آپ مائی باپ ہیں ہم تو غلام ہیں آپ کے میں نے بچی کو مستقل آپ کے نام لگا دیا ہے پیر بادشاہ — بس ایک دھڑکا سا دل لگا رہتا ہے —“

عنایت بائی نے نالکھ کے سے انداز میں بدن پچکائے ہوئے کہا۔  
”کیا عنایت بائی — ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کیا دھڑکا لگ گیا“  
فضل شاہ نے لا پرواہی سے ہنس کر کہا۔

”مائی باپ وہ مٹوا حینفا ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔ ڈرتے ہیں کہ خطر ناک آدمی ہے۔ اس روز تو مولانا جان بچالی — معلوم نہیں کب یہ بلاد و بارہ ہم پر آن پڑے“  
عنایت بائی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ہاں شاہ جی — کچھ کیجئے ناں اُس کا —“

زہرا بائی نے اپنی ماں کی معادنت کرتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

کیا بات کرتی ہو عنایت بائی — تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں — ارے اپنے شاہ صاحب کے ہوتے کسی کی کیا مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھے — جاؤ عیش کو دیکھ لیں گے اُس حرامی کو بھی —“

سردار رشید نے فضل شاہ کے بجائے جواب دیا۔

”بس حضور — باندیوں کا خیال بھی رکھیے — ہم مسکین لوگ ہیں۔ اور تھانے والوں کو کہہ دیجئے۔ مولانا کو آباد رکھے“

عنایت بائی نے سماجت سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے گھر پر مستقل گارڈ لگوا دوں گا۔“

فضل شاہ نے اُسے واپس لوٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عنایت بائی اور اُس کی بیٹی جس طرح کوشش بجاتی آئی تھیں اُس طرح لے لے کر واپس لوٹ گئیں۔

سردار صاحب یار واقعی بات تو خطر ناک ہے — میں تو سیاست میں ہی الجھا ہوا ہوں۔

بازم کو جانتے ہو — وہ سالاجانے کب کوئی مصیبت کھڑی کر دے —“  
فضل شاہ نے اُن کے جانے کے بعد تشویش ظاہر کی۔

”فضل شاہ ٹھیک ہے تم جو سوچ رہے ہو لیکن ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔

بیب کبھی آئے گا۔ دیکھ لیں گے۔“

سردار رشید نے لا پرواہی سے کہا۔

”نہیں سردار یار — اُسے نظر انداز کرنا غلط ہے — پھر وہ ہمارے بلانے پر تو نہیں

آئے گا۔ وہ تو موقع کی تاک میں ہے۔ اس کے لئے کسی کی جان لینا یا مرجانا کچھ مشکل کام نہیں۔

یہ خیال سے اُسے سب سے پہلے اُس کے بل سے نکالنا ہوگا — جب تک وہ چھپا ہوا

ہے محفوظ ہے — سامنے آنے پر ہم اُسے گھیر کر مار سکتے ہیں — ورنہ یہ تلوار جو خطرے

کا طرح ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے کسی کی بھی جان لے سکتی ہے۔“

فضل شاہ خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”لیکن اُسے باہر کیسے نکالیں —“

سردار رشید کو بھی تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔

”ایک ترکیب ہے میرے پاس —“

فضل شاہ نے کہا۔

”کیا —؟“

سردار رشید نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

”سردار صاحب اگر تم.....“

فضل شاہ نے اسے اپنے خطر ناک شیطانی منصوبے کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔

سردار رشید ہنسنے لگا تھا۔

کسی کار کی پچھلی وند مسکریں پر رکھے جا پانی گڈے کی طرح وہ اُس کی ہر بات پر سر ہلا بلا

اُن کی کودا دے رہا تھا۔ منصوبے کے آخر میں اُس نے بے شرموں کی طرح فضل شاہ کے

”فضل شاہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کل ہی لو۔ ذرا ایس پی کو فون کر دینا۔ بلکہ اس کا راز کل میں تبادلہ ہی کروادو۔ کچھ زیادہ ہی ایماندار اور فرض شناس بننے کا شوق نظر آ رہا ہے۔“

سردار رشید نے کہا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں اب چھ سات دن کے لئے شہر والی کوٹھی پر رہوں گا اس درمیان یہ کام ہو جانا چاہیے۔ میرے بھی اور تمہارے بھی آدمی چوکس ہو جائیں تو ہم باہر نکلنے پر اسے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ سردار رشید ایک بات یاد رکھنا اس زندہ پولیس کے ہاتھ لگنا ہم دونوں کے لئے کوئی نیا عذاب کھرا کر دے گا۔“

فضل شاہ نے اسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

”تم مطمئن رہو فضل شاہ۔ زندہ بچنے کا تو بات کرنا۔“

سردار رشید نے بڑے ہنکار سے کہا۔

دونوں شیطان دیر گئے تک اپنے خطرناک منصوبے کی جزئیات پر بحث کرتے رہے۔

نذر محمد نے ساری زندگی تجربات کی نذر کر دی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ سرداروں اور فضل شاہ کا اتحاد دراصل کس کے خلاف ہے۔ دونوں شیطان اپنے بڑے مقاصد پر اکٹھے ہو گئے تھے۔

اپنے بھانجے کی طاقت کا علم اسے بھی تھا اور فضل شاہ کو بھی۔ نذر محمد جانتا تھا فضل شاہ اور سردار دونوں نے اس خطرے کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ فضل شاہ کے صوبائی اسمبلی منتخب ہونے کے دوسرے ہی روز گاؤں کی طرف آنے والے راستے پر پولیس پوسٹ کا قیام اس کے خدشات کی تصدیق کے لئے کافی تھا۔

اس کا سامنا بڑے گھٹیا اور کینے دشمنوں سے تھا۔ اگر نتھو خاں زندہ ہوتا یا حالات نے حنیف خاں کو بھی گاؤں میں رہنے کی اجازت دی ہوتی تو کوئی اور بات تھی۔ اس صورت میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ہزار ہر تیبہ سردار اور فضل شاہ سوچتے۔

لیکن —

اب ایسا نہیں تھا۔

جہاں تک برادری کا تعلق تھا اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ ان کے پینے کی جگہ خون بہا سکتے تھے۔

لیکن —

وہ غریب اور بے اسرا لوگ تھے۔ ان کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ مالی طور پر وہ بے بارے کی اعانت کے قابل ہی نہیں تھے۔

ان حالات میں کوئی بھی انہیں ڈرا دھمکا اور دبا سکتا تھا۔

پولیس پوسٹ کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ اگر حنیف اس طرف آئے تو بچ کر نہ جانے پائے۔

اس روز جب گاؤں کے نمبر دار نے لوگوں کو بتایا کہ آج پولیس پوسٹ خالی ہے اور وہاں

والی پیرے دار بھی موجود نہیں تو گاؤں کے لوگوں نے حیرانگی کے ساتھ سکھ کا سانس بھی لیا کیونکہ

انہیں اس پوسٹ کے ملازمین کیلئے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑتا تھا اور یہ کوئی معمولی کھانا

بھی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن —

اس گاؤں میں ایک شخص ایسا ضرور تھا جس کو اس خبر نے پہلے حیران اور اب پریشان

کر دیا تھا اور وہ تھا نذر محمد۔ اس کی جہان ندیدہ نظروں نے پچھلے کچھ دنوں سے گاؤں کے

دوڑلے کے بدلتے رویے کو نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ حنیف خاں کے ایشہاری ہونے کے بعد

اسے ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی اس نے نتھو خاں کے خاندان سے ان کی ہمدردیاں

فانی کر دی تھیں۔ یوں بھی نتھو خاں کے بعد تھانے کپہری کے معاملات انہیں خود ہی نٹھانا

پڑتے تھے۔

فضل شاہ وزیر اعلیٰ کا مشیر بن چکا تھا۔

سردار مرید یونین کو نسل کا چیئرمین بن چکا تھا۔

دو دشمنوں نے اپنے مشترکہ مفادات پر حنیف خاں کے خلاف اتحاد کر لیا تھا۔

پولیس پوسٹ پر موجود ملازمین کے وقتی طور پر دہاں سے ہٹ جانے کا مطلب ہے۔ اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اب ان دونوں دشمنوں کی طرف سے نکتہ خاں کے خاندان پر کڑا عذاب آنے والا تھا۔ یہ اس کی چھٹی حس تھی جس نے نذر محمد کو یہ سوچنے پر مجبور کیا۔

لیکن —

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ان خدشات کا اظہار اپنی بہن کے سامنے بھی کرے۔ پھر بھی اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے اپنی بہو صفراں سمیت جو صنف خاں کے فرار ہونے کے بعد سے اصغری کے ہاں چلی آئی تھی کسی اور طرف نکل جائے۔ اس نے صفراں کی اس علاقے میں موجود زمین کو ادانے پونے دہائیوں فروخت کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور اب وہ بھی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

نذر محمد نے اس شام اصغری سے کہا بھی کہ اسے دال میں کچھ کالا دکھائی دیتا ہے اور انہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔

”اصغری! تم فضل شاہ کو نہیں جانتی اور ان سرداروں سے متعلق بھی ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ تمہیں ان کے متعلق کیا نہیں معلوم — اصغری! نکتہ خاں کی زندگی میں بات چیت اور تھی۔ پھر صنف ہی یہاں ہو تو برادری میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ہماری طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھتا۔ ان لوگوں کو علم ہو گیا ہے کہ اب نہ ہم ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سکتے ہیں۔ پھر یہ ہماری اور ان جنگلی درندوں کی لڑائی کے درمیان کیوں آئیں گے؟“

نکتہ خاں کے پرانے ساتھی جو آج بھی ہمارے وفادار ہیں کچھ دنوں سے یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ تمہیں اور صفراں کو یہاں سے نکال دوں۔ میں نے نکتہ خاں کی زمین بھی فروخت کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم فی الحال یہ زمین کسی کو ٹھیکے پر دے کر یہاں سے نکل جاتے ہیں بعد از حالات بہتر ہونے پر صنف خاں سے رابطہ ہو اور فروخت بھی کر دیں گے۔“

”نذر محمد — تیری تمام باتیں سچ ہوں گی — لیکن یاد رکھنا میرے جیسے جی کہتا رہا نہ رکھنا کہ میں اپنے خاوند کی قبر چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

اصغری نے اس کی ساری باتیں سننے کے بعد فیصلہ کن انداز میں کہا۔

یوں تو نذر محمد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اصغری جو کچھ کہہ رہی ہے اس سے سرواخراف نہیں لے گی پھر بھی اس نے بہت مغز ماری کی۔

لیکن —

ڈھاک کے تین پات کی مجال جو اصغری کے کان پر جوں بھی رہی ہو۔

”اور ہاں — اگر فضل شاہ یا سردار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نکتہ خاں کی عزت کی طرف میلی نظر بھی دیکھ لیں گے تو وقت آنے پر ان کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں گی — میری لاش سے لڑھی کوئی صفراں تک پہنچے گا؟“

اس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ صفراں جو کہہ رہی ہے وہ گزر کرنے کی ہمت بھی رکھتی

نذر محمد نے بھی اس روز نکتہ خاں کی سوجیلی ہی میں سونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اصغری اس کی ایک نہ چلنے دی۔

”کوئی بات نہیں نذر محمد — تو کیوں گھبرا رہا ہے۔ ابھی تیری بہن نہیں مر گئی۔ نکتہ خاں بڑا گیا ہے لیکن مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے — تو بھابی اور بچوں کے پاس — انہیں اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں —

فضل شاہ اور سرداروں کو علم ہے کہ صنف خاں کس کا بیٹا ہے — اگر انہوں نے حرکت کی تو وہ ان کی نسلوں کو برباد کر کے رکھ دے گا۔“

اصغری نے اسے اپنے گھر بھیجتے ہوئے کہا۔

اس روز نذر محمد بڑے بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے بطور باطن نکتہ خاں کے ٹیوب ویل پر ملازم دونوں لڑکوں کو بھی آج سوجیلی کے مردانہ حصے ہی پر زیادہ ہو کر سونے کی ہدایت کی تھی۔

رات ایک پہر بیت چلی تھی۔

گرمیوں کی اس بوجھل رات کو سر شام میں بچھم سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھانکوں



نے بڑا خوشگوار کر دیا تھا۔ سارا گاؤں ان ٹھنڈی سواؤں کے دوش پر لمبی تان کر سوراہاؤ  
لیکن —

آج اصغری کو ایک پل کے لئے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ حالانکہ اس کا معمول تھا کہ  
عشا کی نماز پڑھنے کے کچھ دیر بعد ہی سو جاتی اور پھر تہجد کی نماز کے لیے اٹھا کرتی تھی۔  
نذر محمد کو اُس نے بظاہر تو مطمئن کر کے بھیج دیا تھا۔ لیکن اُس کا اپنا دل مطمئن نہیں  
تھا۔ رہ رہ کر حدیثات اُس کے دماغ میں سر اٹھا رہے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ اُس کا واسطہ واقعی بڑے کینے دشمنوں سے ہے  
جن سے کسی بھی حرام کاری کی اُمید کی جاسکتی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اُس کی بہو صغرا اُس  
سامنے دوسرے کونے پر گہری نیند سو رہی تھی جب اچانک ہی اصغری کا دل گھبرانے لگا۔  
اُسے یوں لگا جیسے کسی نے حویلی کی دیوار پھلانگی ہو۔

پہلے تو اصغری نے اسے اپنا وہم جانا کیونکہ شام ہی سے اُس کے دماغ میں ہی فکرو  
رہی تھی، لیکن ایک کے بعد دوسری آواز نے اُسے یقین دلا دیا کہ کچھ نہ کچھ بڑا ضرور ہے۔  
حویلی کے دوسرے مہمان حصے میں تھوٹو خاں کے چار ملازم سو رہے تھے۔ اصغری نے انہیں بطور  
خاص آج ہدایت کی تھی کہ اُن میں سے ایک جاگ کر پہرہ دیا کرے اور باقی سو یا کریں۔

لیکن —

انہوں نے شاید اس نصیحت پر عمل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ !!  
یہ صورت حال اصغری کے لئے اِس لئے نہیں تھی کہ ساری زندگی تھوٹو خاں اور اُس کا بیٹا  
اس طرح دبے پاؤں رات کو دیر گئے سرد پار سے اپنے گھر میں بھی چوروں کی طرح واپس آ  
کرتے تھے۔

لیکن —

آج حالات مختلف تھے۔  
وہ بھی تھوٹو خاں کی بیوی تھی بغیر کسی گھبراہٹ کے اُس نے سر ہانے دھری کلہاڑی کا تھو

ہنٹوٹی سے تھا ما اور اس حدیث کے پیش نظر کہ کہیں اُس کی بہوی آنکھ نہ کھل جائے اور  
ڈر جائے۔ کمرے سے باہر برآمدے میں اگر صورت حال کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔

دروازے کی کنڈی اُس نے بڑی آہستگی سے کھولی اور بڑی بہادری سے باہر نکل آئی۔  
بناپشت پر موجود دروازے کو اُس نے باہر سے کنڈی لگادی تھی اور اب ہاتھوں میں کلہاڑی  
ہانے برآمدے کے سامنے والے اُس دروازے کی طرف جا رہی تھی جو دوسری طرف مردانہ  
ہتے میں کھلتا تھا۔

اچانک ہی اُسے دو تین سائے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔

کون ہے ؟

اُس نے کرخت آواز میں لگاکارا۔

لیکن —

اُس کی آواز کا جواب دو مزید سالیوں کی صورت میں ملا۔ اب وہاں پانچ چھ نقاب  
ش اُسے گھیرے میں لے کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لے لیکن  
نادر کی توقعات کے بالکل برعکس اصغری نے ”چور چور“ کا شور مچاتے ہوئے کلہاڑی  
مے اوپر اٹھائی اور پوری قوت سے حملہ آور پر چلا دی۔

حملہ آور کو شاید اتنی شدید مزاحمت کی اُمید نہیں تھی —

کلہاڑی کا پھل اُس کے شلنے کی ٹڈی میں اتر گیا جسے اصغری نے جھٹکا دے کر باہر  
لپٹا۔ حملہ آور ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔

پھر ہی ہوئی شیرنی کی طرح اُس نے چاہا کہ اپنے پہلو کی طرف سے حملہ کرے تو اُسے دوسرے  
کی بھی خبر لے۔

لیکن —

اب حملہ آور اُسے ہمت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ !  
تین چار اکٹھے اُس پر پل بڑے جبکہ اُن میں سے ایک نے جھک کر اپنے مضروب ساتھی

کی خبر لینا چاہی۔

یہ تو مرد ہا ہے۔

اُس نے اچانک ہی کھڑے ہو کر کہا۔

اصغری — سے چاروں حملہ آور اس طرح اس سے الگ ہو گئے جیسے انہیں با

بجلی کا شاک لگا ہو۔

”لڑکی کہاں ہے“

اچانک ہی اُن میں سے ایک نے اصغری کی طرف پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا  
اصغری اپنے آپ میں کہاں تھی۔ اُس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر پوچھنے والے کا

توجہ لے۔

لیکن —

اچانک ہی اُس کے پستول سے یکے بعد دیگرے تین شعلے برآمد ہوئے اور

خاں کی غیرت مند بیوی تھلا کر گر پڑی۔

اس ہنگامے سے کمرے میں موجود صغرا کی آنکھ کھل گئی تھی جس نے دیوانہ وار

پہلے ہوئے چیخنا چلانا اور گاؤں والوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

فائرنگ اور صغرا کے چیخنے کی آوازیں سن کر گاؤں کی زندگی نے اچانک ہی کر

لینی شروع کر دی تھی۔

سب سے پہلے اُن کے پھوپھاڑے کے تیسرے گھر سے سردار غلام احمد اور اُس

دونوں لڑکے جو ملی کی دیوار پھلانگ کر لگاکارے مارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ جن

تاقب میں نذر محمد بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

لیکن —

حملہ آور اپنے ایک ساتھی کی لاش چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔

جو ملی کے مردانہ حصے میں موجود چاروں نوکر غائب تھے۔ دو ہی صورتیں ممکن تھ

یا تو وہ گاؤں والوں کے خوف سے فرار ہوئے تھے یا پھر اس سازش میں برابر کے حصے

تھے — !!

نذر محمد نے سب سے پہلے اپنی بہن کی خبر لی جس کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر

گئی تھی۔

اس نے نذر محمد کو آج شام ہی کہا تھا کہ کوئی مائی کا لال جیتے جی اُسے اپنے خاندن کی

قبر سے الگ نہیں کر سکتا —

اُس نے جو کہا پرج کر دکھایا تھا —

وہ اپنی غیرت پر قربان ہو گئی تھی۔

یہاں موجود ایک حملہ آور کی لاش اس بات کی نشاندہی کے لئے کافی تھی کہ تھو خاں

کی بیوی نے کسی مرحلے پر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گو کہ حالات نے اُسے تھی دست کر دیا

تھا۔ اُس کا سائیں مرجچکا تھا اور بیٹا زندہ ہو کر بھی اس کی مدد سے قاصر تھا۔ اس کے باوجود

اُس نے حملہ آوروں کے لئے میدانِ خالی نہیں چھوڑا تھا۔

”ارے — یہ تو مسکین علی ہے — سردار مرید کا ملازم —“

وہاں جمع ہونے والے گاؤں کے لوگوں میں سے ایک نے اُسے پہچان کر اچانک

ہی کہا۔ نذر محمد کو یوں لگا جیسے اچانک ہی اُس کے اندر کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

اُس نے پہلے تو زمین پر دوڑا تو ہو کر اپنی شہید بہن کے ماتھے کو چوما اور اُس پر چادر ڈال

دی پھر وہ اچانک تن کر کھڑا ہو گیا۔

”بے غیر تو — بزدلو! تم جانتے ہو کس کے گھر میں کھڑے ہو۔ یہ اُس گاؤں کا قلعہ

ہے۔ تمہاری نسلوں کو یہاں پناہ ملتی رہی ہے۔ آج تمہارے جیتے جی اس گھر کی غیرت پر حملہ

ہوا ہے۔ حملہ آور تھو خاں کی بہو کو اٹھانے آئے تھے — لیکن تم نے کچھ نہ کیا — کسی نے

تھو خاں کے گھر کی بئر نہ لی — جس نے تمہاری درجنوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کئے آج اُس کی

زنت کو پلوال کے سردار لوٹنے آگئے تھے — لیکن کوئی بات نہیں۔ ابھی تھو خاں کا بیٹا زندہ

ہے — وہ ایک ایک کو چن کر مارے گا — یاد رکھنا یہاں بڑی تباہی آئے گی —

میں خاں تم سب کو غارت کر کے رکھ دے گا — تم نے.....“

اُسے چکر آگیا۔

لیکن —

اچانک ہی نبرد ار غلام احمد نے اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔  
نذر محمد — ہوش کر۔ خدا کی قسم ہمیں علم نہیں تھا کہ سردار اتنا گر سکتے ہیں۔  
”پر سے ہٹ جانے دارا۔ میں جاؤں گی۔ میرے بیٹے جائیں گے۔ آج ہی ابھی،  
میں یہ قرض اُتاروں گی۔“

یہ سیکسنہ بی بی تھی۔

گاؤں کی بھینٹارن جس کی دو بیٹیوں کو نتھوٹوں نے اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھایا تھا۔  
”یار محمد۔ غلام بی بی تم کہاں ہو۔“

سیکسنہ بی بی نے مجمعے میں اپنے بیٹے کو لاکارا۔

دو کڑیل فوجوان مجمع کو پیرتے سامنے آگئے۔

”یار محمد، غلام بی بی، سرداروں نے تمہاری ماں کو قتل کیا ہے۔ یہ وہی ہے جس  
نے اپنے ہاتھوں سے تمہاری بہنوں کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا تھا۔ جاؤ میں نہیں  
حکم دیتی ہوں سردار مرید کو قتل کر دو۔ اُسے کتے کی موت مار ڈالو۔ جاؤ ورنہ میں نہیں  
دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی۔ جاؤ۔“

سیکسنہ بی بی پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار اصراری کی لاش سے لپٹ  
کر گاؤں والوں کی بزدلی کو گالیاں دے رہی تھی۔

”نہیں سیکسنہ بہن۔ ابھی نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اس گاؤں  
کا نبرد ار ہوں یہ قرض میرے سر پر بٹھا ہے۔ میں ہی اسے اُتاروں گا۔ یوسف  
اکبر، صدیق گھوڑیاں تیار کر دو۔ ابھی وار نکلے گی۔ پلوال والوں کو بتا دینا کہ نتھوٹوں کی  
غیرت نہیں مری وہ اکیلا مرے۔ جاؤ بندوقین نکالو۔ جاؤ۔“

نبرد ار غلام احمد نے اپنے بیٹیوں کو لاکارا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی پلوال کی طرف شمشیر نگر کے پندرہ بیس جوان بندوقین اور چھپان  
اٹھائے لاکارے مارتے اُڑے چلے جا رہے تھے۔

پلوال

شمشیر نگر سے اٹھی آندھی نے ایک مرتبہ تو پلوال کو ہلا کر رکھ دیا۔ !  
نبرد ار کے تینوں لڑکے لاکارے مارتے ہوئے رانقلیں تانے سرداروں کی حویلی کے  
ہر کھڑے ہو کر بہت دیر تک انہیں گالیاں دیتے رہے۔

لیکن —

یہاں کوئی ہوتا تو باہر آتا۔

یہ صرف بدعاش ہی نہیں سیاست دانوں کی بھی حویلی تھی اور یہ وہ سیاسی غنڈے  
نے جو کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے اُس کے نتائج و عواقب کی تیاری پہلے سے کر لیا  
تے تھے۔ سرداروں نے حینف قان کو قتل کرنے کے لئے فضل شاہ کے تعاون سے سادا  
نور ضرور بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں غیرت پر حملے کی خبر سن کر وہ تلملاتا ہوا اپنے  
باہر نکلے گا اور پہلے سے گھات میں لگے فضل شاہ اور سردار اُسے مار ڈالیں گے۔

لیکن —

انہوں نے اس مفروضے کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ شمشیر نگر کے باسیوں کے دلوں  
نتھوٹوں نے تیس سال تک بلا شرکت عنبر سے حکومت کی ہے عین ممکن تھا کہ اس کے  
جان مند شمشیر نگر کے باسیوں کی غیرت کے لیے یہ حرکت تازیانے کا کام کرنی اور وہ جوش  
ان اندھے ہو کر اپنی بزدلی کو ایک طرف رکھ کر کوئی بھی جذباتی قدم اٹھالیں۔ !  
ان نام نہاد شرقا کے نزدیک غنڈہ گردی کا بہترین اصول بھی تھا کہ اپنے جرم کا کوئی  
بانشان باقی نہ رہنے دیا جائے جس کی مدد سے انصاف کی عدالت میں انہیں مجرم ثابت

کیا جاسکے —

وہ جانتے تھے کہ اندھے قانون کو جرم کے ثبوت درکار ہوتے ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص اپنے دل کی گواہی یا واقعات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا کرتا —  
کسی کو ملزم نامزد کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لئے ثبوت بھی فراہم کرنے پڑتے اور اپنے جرم کا یہ مہذب دنیا کے وحشی کوئی نام و نشان نہیں چھوڑتے تھے۔  
جو لوگ نٹھو خاں کی غیرت پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ان میں سردار مرید اور فضل شاہ کے کارندے شامل تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ مرنے والا سردار مرید کا آدمی تھا اور اُس کی شناخت کر لی گئی تھی جبکہ سردار مرید اور اُس کا بھائی گزشتہ چالیس گھنٹے سے شہر میں موجود اپنی کامیابی میں قیام پذیر تھے۔

انہوں نے حملے کے وقت شہر میں اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ثبوت یہاں جمع کئے ہوئے تھے۔ جس رات یہ حملہ ہوا دونوں بھائی ایک اہم سرکاری کام میں موجود تھے۔ جہاں صوبے کی قریباً تمام اہم شخصیات کا اجتماع تھا۔ اس شہر کے تمام پولیس آفیسر اس بات کے گواہ تھے —

شمشیر نگر کے جیلے پہلے تو سرداروں کو گالیاں نکالتے رہے پھر انہوں نے ہوا فائرنگ شروع کر دی۔

ان کی دہشت نے پلوال کے مکینوں کو اپنے کمروں میں مقید کر دیا تھا۔ یوں بھائی نے اپنے گاؤں والوں کے ساتھ کوئی ایسے اچھے تعلقات قائم نہیں کئے تھے کہ کوئی آج بھر کائی آگ کا ایندھن بتا —

سویل کی اندر سے کوئی مزاحمت نہ مرنے پر سکینہ کے بیٹے برجییاں لہراتے ہوئے مردانے حصے میں جا گئے انہوں نے وہاں موجود چوکیداروں کو مار مار کر بھر کس نکال دیا تین چار کی ٹانگیں، بازو توڑ ڈالے۔ دو تین کے سر پھاڑ دیئے۔

لیکن —

گوہر مقصود کسی کے ہاتھ نہ لگا۔ سردار مرید نہیں تھا۔ اپنی روایات کا احترام کرتے؟

ہوں نے ”زمان خانے“ کا رخ نہیں کیا تھا۔

علی الصباح جب انہوں نے پلوال کی طرف پولیس کی جیب اور ٹرک کو بڑھتے دیکھا بادل نخواستہ گھوڑیاں بھگاتے ہوئے شمشیر نگر پہنچ گئے —

بڑی سردارنی بیگم نے ادھی رات ہی کو شہر والی کوٹھی میں فون کر کے اس ناگہانی آفت کا اطلاع کر دی تھی جہاں سے سرداروں نے خاص طور پر ایس ایس پی کی قیادت میں اپنی ذیلی کی حفاظت کے لئے پولیس فورس بھیجی تھی —

اس فورس کو شمشیر نگر کے پندرہ بیس مکینوں کے نام کی لسٹ خصوصی طور پر دی گئی تھی ان لوگوں کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا ہے۔

اور —

اس لسٹ میں سب سے پہلا نام نذر محمد کا تھا !

شمشیر نگر کا ہر وہ باسی جس سے ان لوگوں کو کسی بھی مزاحمت کی امید تھی اس کا اس لسٹ میں شامل تھا اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں بچا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ پلوال بکھر ہوا تھا اور سرداروں کے ملازمین زخمی ہوئے تھے۔

پولیس نے اس طرح شمشیر نگر پر دھاوا بولا تھا جیسے وہ دشمن ملک کا کوئی دیہات ہو ان دشمن فوجیں چھٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھروں کے اندر گھس کر مردوں کو زد و کوب کیا پولیس سے بچتیں اور بچتے بھی نہ بچ سکے۔ مردوں کو انہوں نے مار مار کر ادھوا کر دیا اور گھسٹتے

پولیس کے ٹرکوں تک لے آئے۔ انہوں نے گرفتار شدگان کے بازو انہی کے کپڑوں سے پٹے کی طرف باندھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پولیس کے جیلے انہیں گلوں کے بٹ مارتے ہوئے پولیس لائن تک لے آئے تھے جہاں اگلے روز سارا دن پولیس ٹانگس بچھڑیٹ کے سامنے پیش کئے بغیر ان سب کا ریمانڈ لے لیا گیا۔

اس سارے آپریشن کی نگرانی فضل شاہ خود کر رہا تھا —

اُس نے اسی روز ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں اپنے حلقہ انتخاب میں پڑنے والے بات پلوال کے ایک سیاسی اور سماجی خانوادے کے ساتھ ہونے والی غنڈہ گردی کی کھل کر

مذمت کرتے ہوئے لڑموں کو کھنکھراتے ہوئے پھینچنے بغیر چھین سے نہ بیٹھنے کا عہد کیا تھا۔  
اس سارے ہنگامے میں نتھو خاں کی بیوی کی موت کو بالکل فراموش کر دیا گیا۔  
اس گاؤں میں کوئی مائی کالا پچا ہی نہیں تھا جو تھانے تک جا کر اس وار وار کہتا  
ہی درج کروانے کی بحث کر لیتا۔

حاصلہ آور کی لاش پولیس والے اپنے ساتھ پوسٹ مارٹم کے بہانے لے گئے تھے گاؤں  
کے بچے کچھ بوڑھوں اور عورتوں نے منت سماجت کر کے نتھو خاں کی بیوہ اصغری کا مردہ  
خواب ہونے سے بچا لیا ورنہ تو پولیس والے اُس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے پر بھی تیار  
ہوئے تھے۔

اُسی روز دوپہر کے بعد پولیس والوں نے بھی ایک عورت کا بندوبست کیا جس نے اصغری  
لاشے کو غسل دیا گاؤں کے چند بوڑھوں نے اُس کا جنازہ اُٹھایا اور پولیس کے کڑے پہرے  
اُس کے خاندانہ نتھو خاں کے پہلو میں دفن دیا۔

اُس روز حینف خاں کی ماں کے قتل تھے جب وہ گاؤں کے باہر پہنچا۔ !!  
گاؤں سے باہر شام ڈھلے جب وہ کھیتوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھا اپنے کسی واقف  
کار کا انتظار کر رہا تھا تو اُسے بابا حیات اُس طرف آتا دکھائی دیا۔ مسجد کا خدمت گزار تھا  
اب مولوی صاحب کے لئے روٹی لے کر جا رہا تھا۔

بابا حیات نے جب اچانک حینف خاں کو اپنے سامنے پایا تو بے ساختہ اُس کے آگے  
بہستہ نکلے۔ کمزور اور بے بس بابا حیات نے جس پر نتھو خاں نے اپنی زندگی میں بے شمار اسی  
کئے تھے روتے ہوئے حینف خاں کو اُس کی غیر موجودگی میں بیتے والی قیامت کی کہانی سنا  
اور اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے التجا کی کہ وہ واپس لوٹ جائے کیونکہ اب حال  
وہ نہیں رہے یہاں قدم قدم پر اُس کی جان کو خطرہ ہے فضل شاہ اور سرداروں کے آدمی علاقہ  
میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اُسے پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی مار ڈالیں  
حینف خاں کو یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت سے نہر میں بچھا بھالا اُس کے

اتار دیا ہو۔

اُسے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی۔ !

اُس کے کانوں میں رات کا سارا سناٹا ڈرا آیا تھا اور آنکھوں کے سامنے موت کا سا  
پرا پھلتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک ہی اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔  
دہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔

بابا حیات کے جو صلہ دینے پر بالا آخر وہ منہل گیا۔ پھر اچانک ہی اُسے یوں محسوس  
ہوئے اُس کی کایا پلٹ رہی ہو۔

اُس کی رگوں میں تیرنے والے خون کی حدت اچانک ہی بڑھنے لگی تھی اور اب اُس کو  
بدن میں خون کے بجائے انگارے دوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں اور  
اُسے آگ برس رہی تھی۔

”بابا حیات تو جا۔ کسی سے میری آمد کا ذکر نہ کرنا۔ صغرا کو آج رات ہی شہر میں پھینچا  
کے گھر پہنچا دینا۔ لیکن کسی بات کی گاؤں والوں کو خبر نہ ہونے دینا۔ میں زندگی بھر تمہارا  
سان نہیں بھولوں گا۔ زندگی رہی تو اس احسان کا بدلہ ضرور دوں گا۔“  
اُس نے پانچ نوٹ بابا حیات کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔  
بابا حیات تڑپ کر رہ گیا۔

قدرت نے اگر زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے نتھو خاں کے کسی احسان کا معمولی سا شکر یہ ادا  
کا موقع بھی دیا تو بے چارہ اتنا مجبور تھا کہ شہر تک صغرا کا کرایہ بھی نہیں خرچ کر سکتا تھا  
بے بہت ٹال ٹال کی۔  
لیکن۔

حینف خاں نے زبردستی نوٹ اُس کی قمیص کی جیب میں ڈال کر اُسے اس ہدایت کے  
تذکرہ کر دیا کہ خود کو تار مل رکھے۔

رہ جاتا تھا کہ بابا حیات جان پر کھیل کر بھی اُس فرض سے کوتاہی نہیں برتے گا۔ اُسے

ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔

آج بہت عرصے بعد اس نے اپنے بدن میں وہی چیتے کی سی پھرتی محسوس کی جو کبھی وہ اپنے باپ کی معیت میں سرحد عبور کرتے ہوئے ریختر یا بی ایس ایف والوں کے گھیرے میں آنے کے بعد محسوس کیا کرتا تھا۔

بابا حیات اندھیرے کی چادر میں گم ہوا تو حنیف خاں بو جھل قدموں سے قبرستان کی طرف چل دیا۔

قبرستان پر موت کا سناٹا طامدی تھا۔

رات دیر لگے تک وہ اپنی ماں کی قبر سے لپٹ کر پشیمانی کے آنسو بہاتا رہا۔

صبح کا ذب کی روشنی پھوٹنے پر وہ چل دیا۔

اُس نے اندازہ کیا تھا کہ اب سرحد عبور کرنا اُس کے لئے شاید اتنا آسان نہ رہے کیونکہ

دونوں طرف صیاد اُس کے لیے جاں بچھائے بیٹھا تھا پھر آخر وہ اپنی لڑائی میں کب تک

کھینے سانس کے لڑکوں کو گھسٹتا رہے گا۔

یہ جنگ اب اُسے اکیلے لڑنی تھی۔

دشمن نے اس کے باپ کے بعد اُس کی ماں کو بھی مار ڈالا تھا۔ اب دنیا میں اُس

کے لئے زندہ رہنے کی کون سی ایسی خاص وجہ باقی رہ گئی تھی۔ ٹھیک ہے اُس کے باپ کی

مترتے دم تک خواہش تھی کہ وہ صغراں کو اپنی بہو بنا کر لے آئے۔ اُس کی ماں نے اپنی زندہ

ای میں صغراں کو بہو کا رتبہ دے دیا تھا۔

لیکن

وہ صغراں کی خاطر اپنے والدین کے قاتلوں کو زندہ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر

سکتا تھا؟

اس کی ماں کے قاتل کون تھے؟

اس سوال کا جواب اُسے فوراً تلاش کرنا تھا۔ محض ایک حملہ آور کا تعلق مردانہ

سے ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اس بات پر یقین کر لے۔

فضل شاہ جیسے ضحیت سے کسی بھی سازش کی توقع کی جا سکتی تھی۔

خدا جانے ایک لاش وہاں جان بوجھ کر نہ چھوڑ دی گئی ہو؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ پہلے

پارچ اُس نے دھوکے کی چال چلی ہو اور اُن کی دشمنی کا رُخ پلوال کی طرف ہی موڑنا

پاہتا ہو۔

لیکن

اب یہ مشکل نظر آتا تھا۔ سردار مرید یونین کو نسل کا چہرہ بین بن چکا تھا اور دونوں

پارٹیوں نے اپنے۔ مفادات پر مکمل اتفاق کرنے کے بعد ہی فضل شاہ کو اس عہدے تک

پہنایا تھا۔ گو کہ اس دوستی کی بنیاد منافقت تھی، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

یہ لوگ اپنے مفادات کے لئے کہاں تک گر سکتے تھے اس کا اندازہ حنیف خاں سے

زادہ اور کون لگا سکتا تھا جس نے فضل شاہ کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔

بابا حیات نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کے ٹوبہ دیل کے چاروں ملازمین بھی غائب

ہیں اور عین ممکن تھا کہ انہیں اغوا کر لیا گیا ہو۔

لیکن

حنیف خاں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور اب اپنی سوچ کی تصدیق کے لئے ہی اُس

نے جلا پور کا رُخ کیا تھا۔ جہاں اُس کے باپ کا پرانا ملازم منشی رہتا تھا۔ منشی نے ساری

زندگی اُن کے ہاں گزار دی تھی اور حنیف خاں کو اُمید تھی کہ اگر کچھ بچائی وہ جان سکتا ہے تو

منشی ہی اُس کا مضبوط ذریعہ ہوگا۔

جلال پور میں وہ کبھی گھوڑی پر بیٹھ کر اپنے باپ کے ساتھ آتا تو سارا گاؤں اس

کے استقبال کے لئے کھڑا ہو جاتا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں رات کے

اندھیرے میں منشی کے گھر داخل ہوا تھا۔

گاؤں کے ایک کونے میں واقع منشی کے گھر کا دروازہ اُس نے کھٹکھٹایا اور دروازہ

کھٹکھٹانے پر اُسے سامنے اُس کی بیٹی کی شکل دکھائی دی۔ گو کہ حنیف خاں کا حلیہ خاصا بدلا ہوا

تھا لیکن رُقیہ نے اُسے پہچان لیا۔

اُس نے سہم کر حنیف خاں کو سلام کیا۔ جس نے اندر داخل ہونے پر دروازے کو کھنڈی کر بند کر دیا تھا۔

”منشی کہاں ہے؟“

اُس نے رقیہ سے اس انداز میں دریافت کیا کہ سہمی ہوئی لڑکی کے منہ سے بے نیاز

نکل گیا۔

”اندر ہی ہے؟“

”چلو میرے ساتھ۔ اپنی ماں کو بھی بلا لاؤ۔ اور ہاں کسی کو میری آمد کی خبر نہ دینا سچھی گئی ہوتی ہے۔“

اُس نے رقیہ کو دیے دے نہیں دھکی آمیز لہجے میں کہا۔

”ماں بھی اندر موجود ہے۔“

رقیہ نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”آجا بیٹا۔ ہمیں تیرا ہی انتظار تھا۔“

اُسے اپنی پشت سے منشی کی بوڑھی بیوی کی آواز سنائی دی۔

حنیف خاں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو منشی کی بیوی نے لالیٹن کی بوڑھادی منشی ایک چارپائی پر اس طرح لیٹا تھا کہ اُس کے لئے اپنے جسم کو جنبش دینا بھی نا ہو رہا تھا پھر بھی کراہتے ہوئے اُٹھا اور سر ہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا منشی کو؟“

حنیف خاں نے اُس کی بیوی سے پوچھا۔

جواب میں بوڑھی عورت سسکیاں لے کر رونے لگی۔ حنیف خاں کے حوصلہ لانے

اُس نے بتایا کہ تین روز قبل فضل شاہ کے آدمی اُسے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ لوگ منشی کی مدرسے صغراں کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن منشی نے اُن کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور ان کے ہر لاپرواہ کو ٹھکرا دیا جس کا نتیجہ اُس کے سامنے ہے۔

منشی کی بیوی ہی کی زبانی اُسے علم ہوا کہ تینوں ملازموں پر انہوں نے بہت ستم ڈھائے

اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو برغمال بنا کر اُن سے وعدہ لیا گیا وہ حملہ آوروں کے خلاف

راجت نہیں کریں گے۔ منشی کی زبانی ہی اُسے علم ہوا کہ سردار مرید اور فضل شاہ کے غنڈوں

نے مل کر یہ کارروائی کی ہے وہ لوگ صغراں کو برغمال بنا کر حنیف خاں کو سامنے لانا چاہتے

تھے تاکہ اُسے پولیس کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی مار ڈالیں۔

رات گئے تک منشی کی بیوی اور بیٹی اُس کی ماں کے سوگ میں روتی رہیں۔ انہوں

نے حنیف خاں کی بہت منت سماجت کی کہ وہ یہاں کچھ روز کے لئے رک جائے کیونکہ اس

بلاتے میں قدم قدم پر اُسے جان کا خطرہ ہے۔

لیکن

حنیف خاں نے منشی کی بیوی کو کچھ پیسے دے کر رات کے دوسرے پہر ہی وہاں سے

گت لے لی۔

اُس کو اپنے دشمنوں کا علم ہو چکا تھا۔

اب اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا اپنے زور بازو پر کرنا تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ

بانگ فضل شاہ اور سردار مرید کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارے گا۔ ایک پل کے لئے بھی

ان کی نیند نہیں سو سکے گا۔!!

وہ اپنے دشمنوں کو تربیت یافتہ جرنیلوں کی طرح ”سر پرائز“ دینا چاہتا تھا۔ اُس

دشمنوں کو ابھی گمان بھی نہیں تھا کہ حنیف خاں اس علاقے میں موجود ہے۔ انہوں

حنیف خاں کے ہر ممکن ٹھکانے پر اپنا جال پھیلا رکھا تھا۔ حنیف خاں کے لئے کچھ

سے کام ہی موقع تھا۔

اُسے یاد تھا کہ کبھی کبھی جب ”بی ایس ایف“ کو اُن کی آمد کی خبر ہوتی تو وہ ساری سرحد پر

گمان کے لگا دیئے کرتے تھے لیکن تھو خاں ان حالات میں سرحدی پوسٹ کے پہلو سے

بُڑھ کر لیا کرتا تھا۔

وہ حنیف خاں سے کہا کرتا تھا کہ دشمن کو کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرے گا کہ جن کیلئے

اس نے چپے چپے پر مجال بچھا رکھا ہے وہ دشمن اُس کے گھر میں ہی چھپا ہوا ہے۔ یوں ہی حملہ آور جب میدان میں پھیل جائیں اور وہ دشمن کو بھی خود سے کمزور سمجھتے ہوں تو اپنے گھر کی طرف اُن کا دھیان نہیں جایا کرتا — !!

وہ سردار مرید کو اُس کی سوجیلی میں گھس کر قتل کرنا چاہتا تھا — وہ اُن لوگوں پر ناپ کرنا چاہتا تھا کہ تمھو خاں کا بیٹا اُن کی توقعات سے بڑھ کر بہادر اور غیرت مند ہے اور ضرور اور کی حالت میں بھی وہ اپنے سر چڑھنے والا کوئی بھی فرض بدمسود چکانے کی ہمت رکھتا ہے۔

شیرخان کے علاقے سے خریدنا ہوا ولایتی ریو اور اورگو کیوں کا پٹہ اس نے اپنے پڑوں کے نیچے محفوظ کیا ہوا تھا۔ جس طرح اُس نے اپنی ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھا کر اپنا حلیہ بگاڑا ہوا تھا اُسے دیکھ کر یہی گمان گزرتا تھا کہ وہ اس علاقے کے کسی گاؤں کا کوئی کئی کئی ہوگا۔ اپنے دشمنوں کو مطمئن رکھنے کے لئے اُس نے وہ سارا دن پلوال کے کھیتوں میں بسر کیا۔

شام ہونے پر پلوال کی طرف آنے والی سڑک سے گزرتی کاروں سے اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اُس کی ماں کے قتل کے بعد وہ سوڈی ”جشن فوج“ منانے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی دانست میں ہر قابل ذکر شمشیر نگار کے باسی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند دیا تھا اور ان لوگوں کی تو کوئی ضمانت کروانے والا بھی نہیں تھا۔

سردار مرید نے حال ہی میں یونین کونسل کی چیئر مین بنیالی تھی — انہوں نے اپنے پرانے وفادار عالم داد کی بھی سیاست کی کالی ناتک کے حضور چڑھا کر یہ رتبہ حاصل کیا تھا۔ اس علاقے میں اس سے زیادہ آمدنی والا کوئی سیٹ نہیں تھا اور فضل شاہ کے ساتھ سرداروں کا فنی فنی کا معاہدہ ہوا تھا۔

لیکن —

سردار مرید نے ایسا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاکھی بھی نہ لٹے۔ اُسے اگر اب کوئی خطرہ سیاسی طور پر تھا تو وہ تھا عالم داد —

عالم داد جسے اُن لوگوں نے ریاست شاہ کے قتل کے الزام میں جیل میں قید کر دیا تھا۔ سرداروں کا دیر نیر فنی تھا اُس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ سردار رشید اس جیسے

سے ساتھ بھی کچھ کو گزرے گا۔ فضل شاہ نے جہاں بادل خواستہ سرداروں سے یونین کونسل کی ”ڈیل“ کی تھی وہاں اُس نے مستقبل کے ممکنہ خطرے، عالم داد سے بھی نجات حاصل کر لی تھی اُسے سرداروں میں اگر کسی سے سیاسی طور پر کوئی خطرہ تھا تو وہ عالم داد تھا۔

عالم داد اب سردار مرید کے لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔

اُس کی ملاقات کو جیل جانے والوں کی تعداد میں اُسے دن اضافہ ہو رہا تھا جس کا مطلب مناف ظاہر تھا کہ عالم داد کے ہمدردوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو سردار مرید کے لئے کوئی نیک نگوں نہیں تھا۔

عالم داد جیل میں بیٹھ کر سیاست کر رہا تھا۔

اُس نے اپنے تین چار ایسے جاں نثار ساتھی پیدا کر لیے تھے جنہوں نے اُس کے نا جائزہ دھندے کو فنی فنی کے لالچ میں سنبھال لیا تھا اور اُس کی ہدایات کے مطابق سرداروں کے خلاف بھی سیاسی طور پر سرگرم عمل تھے۔ عالم داد نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ اپنا کوئی ایسا پڑا شہر گروپ کھڑا کر لے جس کی مدد سے وہ سرداروں کو ایک طرف کر کے فضل شاہ سے معاملہ طے کر لے اور جیل کی چار دیواری سے باہر آجائے۔ بصورت دیگر تو یہ لوگ اُسے چھانسی پڑانگے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

سردار مرید نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی ہدایت پر ہفتے میں کم از کم دو دن اپنے گاؤں میں گزارنے شروع کر دیے تھے تاکہ عالم داد کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکے —

آج بھی وہ ”سب اچھا“ کی خبر ملنے پر گاؤں آیا تھا —

فضل شاہ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ خود پلوال میں بیٹھ کر حنیف خاں کے خلاف اپریشن کی نگرانی کرے اور جتنی جلدی ممکن ہو اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرے۔

سردار مرید نے یونین کونسل کی ممبری سنبھالتے ہی اپنی نئی داشتہ الماس بیگم کو ”بیوی“ بنالیا تھا اور آج اُس کی خواہش پر اُسے اپنے گاؤں لے کر آیا تھا جبکہ پہلی باقا عدہ بیوی اپنی سونگ کی آمد کی خبر پا کر اپنے سسرال جا چکی تھی۔



تم نے کیا سمجھ لیا تھا کہ شمشیر نگر میں صرت کئی تکین ہی رہتے ہیں۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ابھی میں زندہ ہوں۔ تم نے میری ماں کو مار ڈالا — حنیف خاں کی ماں کو —“

”م میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم تو یہاں رہتے ہی نہیں — یہ فضل شاہ کی چال ہے۔ حنیف خاں اس نے پہلے بھی ایسے کیا تھا۔ تم جلتے ہو تمہارے باپ نے معاہدہ کیا تھا۔“

”جو اس مت کرو۔“

حنیف خاں نے اس کی بات غصے سے کاٹ دی۔

”تم تو مرنے والے ہو سردار مرید لیکن مرنے سے پہلے ایک بات سننے جاؤ کہ فضل شاہ بھی زندہ نہیں بنچے گا۔ میں تم لوگوں کو چن چن کر مار ڈالوں گا۔ تم جانتے ہو میں کس باپ کا تم ہوں۔ تم نے خود موت سے دوستی کی ہے۔ اب مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ سردار مرید تم نے میری غیرت کو لڈکا رہے۔ میں تمہاری ساری نسل ختم کر دوں گا۔“

اس کا خون کھول رہا تھا۔

اپنی ماں کے قاتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس کے لئے خود پر قابو پانا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

”دیکھو حنیف خاں — تم اس وقت غصے میں ہو تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں تو اپنے سگے بھائی سے بھی علیحدہ ہونے والا ہوں کیونکہ اس نے میری مرضی کے خلاف فضل شاہ سے معاہدہ کیا ہے۔“

سردار مرید جس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر جس کا رنگ لہو ہوا تھا۔ اس کی منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

”چلو — میں تم دونوں کو ہمیشہ کیلئے الگ کر دیتا ہوں۔“

اس نے ریو الوور کو فائرنگ پوزیشن میں کرتے ہوئے اس کی طرف سیدھا کیا۔

”دیکھو تم بچ کر نہیں جا سکو گے۔ میرے مسلح آدمی ہر طرف موجود ہیں۔“

حنیف خاں — حنیف خاں —

رات کا پہلا پہر بیت رہا تھا۔

سردار مرید کو اس کی نوبیا ہیٹنے اپنے ہاتھ سے جام تیار کر کے دیا تھا اور اب وہ اس کے زانوں پر سر رکھے خود کو راجا اندر محسوس کر رہا تھا۔

اس کے شہوانی جذبات فقط عروج کو چھوڑ رہے تھے۔

اس درمیان اس نے الماس بیگم کو ہر ممکن طریقے سے ایک ہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مستقبل کا چیف منسٹر ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی سیاست کا آغاز ہی بڑے بھرپور انداز

میں کیا تھا اور یونین کونسل کی چیئر مین شپ پہلے ہی مرحلے پر ہاتھ آجانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ بے حد عقل مند ذہین شخص ہے جس کے لئے ایک ایک کر کے کامیابیوں کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ الماس بیگم نے بھی خود کو ابھی سے صوبے کی خاتون اول سمجھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا دماغ بھی آسمانی پتنگوڑا جھولنے لگا تھا۔

خدا جلنے وہ نقاب پوش آسمان سے نازل ہوا تھا، یازمین پھاڑ کر برآمد ہوا۔ انہوں نے تو کھڑکی کا نشیہ ٹوٹتے دیکھا جس کے ساتھ ہی ایک ہاتھ اندر آیا اس نے بجا کی سہی پھرتی سے اندر کی کنڈی کھولی اس کے ساتھ ہی نقاب پوش اندر کود گیا۔

”کہہ کون ہو تم۔“

اس پر چو نکہ سب سے پہلے الماس بیگم ہی کی نظر پڑی تھی۔ اس لئے اس نے یہ سوال

دریافت کیا۔

”یہ حرام خور مجھے جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟“

نقاب پوش نے اپنے منہ پر لپیٹا کپڑا اٹھا دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریو الوور کپڑا

تھا۔

اس اثناء میں سردار مرید بھی اس اچانک آفت سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”تم — حنیف خاں لگ لگ کیا بات ہے تم.....“

اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

”شاید ابھی تک تمہارا نشہ نہیں اترتا سردار مرید ورنہ تم جان جاتے کہ کیا بات ہے

سردار مرید نے بزدلوں کی طرح ہکلاتے ہوئے الماس بیگم سے لپٹنا چاہا۔

لیکن —

حینف خاں نے آگے بڑھ کر اس کی کمر میں زوردار لات رسید کی اور وہ بلند ہر دوپٹے سے جا لگا۔

الماس بیگم پہلے طوالت زادی اور بعد میں کچھ اور تھی۔ اُسے سردار مرید جیسے دہنوں

گدھے ساری زندگی مل سکتے تھے۔

لیکن —

زندگی ایک مرتبہ چلی گئی تو دوبارہ نہیں مل سکتی تھی۔

”بھائی صاحب تم میرا کوئی گناہ نہیں۔ مجھے تو اس کے غنڈے زبردستی اٹھا کر لے

آئے ہیں۔ مولا حسین کا واسطہ مجھے کچھ نہ کہیے۔“

اُس نے گلگیا تے ہوئے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہاتھ باندھے۔

سردار مرید نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اُس کی بات کے مسئلے سے سردار

مرید کا دماغ ہی خراب ہو گیا ہو۔

”اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی رہو۔ اب تمہارے منہ

سے آواز بھی نکلی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی جاؤ گی۔“

حینف خاں نے اُسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

سردار مرید نے اُٹھ کر کھڑے ہونا چاہا۔

لیکن —

حینف خاں کے ریو الوور نے شعلہ اگلا۔ اُس نے سردار مرید کے سر کو نشانہ بنایا

تھا۔ پہلی گولی نے ہی اُسے ڈھیر کر دیا۔ محض اپنی تسلی کے لئے اس نے سارا ریو الوور دار

مرید پر خالی کر دیا اور اُس کی کھڑکی کے راستے باہر پھلانگ گیا۔

سردار مرید کے ”مسج آرمیوں“ کے اُس کی خوابگاہ پر پہنچنے تک حینف خاں اُس کی

گھوڑی سمیت حویلی سے باہر جا چکا تھا۔

الماس بیگم نے سب سے پہلے اپنے زیورات اور سردار مرید کی جیب سے بٹوہ نکال

راپنے پرس میں ڈالا تھا جس کے بعد اُس نے بین ڈالنے شروع کئے۔

”کون تھا۔ کون تھا؟“

کسی نے چنجیتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میرا سہاگ اُجڑ گیا۔ مجھے کیا علم تھا کہ اُن کا یہاں آنا ہی

مجھے تباہ کر دے گا۔ ہائے ہم یہاں کیوں آئے۔ مجھے کیا علم سردار صاحب نے شاید

یہاں کہا تھا۔ حینف خاں اُس ٹھوڑی کا نام تھا۔“

اُس نے سُٹے بہاتے ہوئے کہا۔

حینف خاں — نتھو خاں کا بیٹا۔ سردار مرید کو حینف نے قتل کر دیا۔“

سردار دل کی حویلی کے ہر مکین کی زبان پر یہی رٹ لگی ہوئی تھی۔

چند منٹ کے اندر پلو ال کے درو دیوار اس خبر سے گوج اُٹھے۔!

واہ شیر کے بچے۔ واقعی تو نے نتھو خاں کا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا۔“

عالم داد کے بوڑھے باپ — صاحب داد نے بے ساختہ اُسے دل ہی دل میں

اردی۔

روٹی اور مین کرتی ہوئی عورتوں نے شہر میں موجود سردار رشید کو اس اندھناک سانچے

ناخبر بذریر ٹیلی فون کر دی تھی جس نے فوراً یہ خبر فضل شاہ تک پہنچا دی تھی۔

”خس کم جہاں باک“

فضل شاہ نے ٹیلی فون بند ہوتے ہی بڑبڑاتے ہوئے کہا — کو بیٹا تم کو چڑھتی۔“

وہ بڑی سنگاری سے زیر لب مسکرا دیا۔

جہاں یہ خبر اُس کے لئے بطور سیاستدان ایک اچھی خبر نہ تھی۔ وہیں خوف کی لہر اس

لاریڈھ کی ہڈی میں بھی سرایت کر گئی۔

حینف خاں سے کچھ بھی ممکن تھا۔

ان حالات میں بھی جس شخص نے سردار مرید کی حویلی میں گھس کر اُسے قتل کر دیا تھا

وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کے لئے فضل شاہ کا قتل بھی کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

اس کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔ وہ حنیف خان کو خفیہ طور پر بلانے کا پیغام دینے جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ حنیف خان سے سردار رشید کا قتل کروانے کے بعد اسے خود گولی مروادے گا۔

حنیف خان کو پیغام کس طرح بھیجا جائے؟

یہی تھا وہ اہم سوال جس کا جواب اسے تلاش کرنا تھا۔ یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ حنیف خان کے نزدیکی لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں تسلیم کرے گا کہ وہ کبھی ان سے ملنے آیا ہے خواہ انہیں کچھ بھی لالچ دیا جائے۔

پھر کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

وہ بے چینی سے ٹھٹھاتا ہوا سوچ رہا تھا۔ بالآخر ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی۔ لیکن

اس تجویز پر اسے عمل بڑی احتیاط سے کرنا تھا۔ اگر سرداروں کو معمولی شک بھی گزر جاتا کہ وہ ان کے خلاف سازش کر رہا ہے تو اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے بھی وہ اس کو مار ڈالتے، کیونکہ سردار مرید کی موت ان کے لئے کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ آئی چیمبر مینی دو بارہ نکل گئی تھی۔

اس نے اپنی خواہش بگاہ میں عمر دین کو طلب کیا تھا جسے اس کے معتد خصوصی کی حیثیت حاصل تھی اور شاید عمر دین ہی وہ واحد انسان تھا جسے اس بات کا بھی علم تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی موت حنیف خان کے ہاتھوں نہیں بلکہ فضل شاہ کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔

فضل شاہ نے اسے اعتماد میں لے کر سارا منصوبہ سمجھا دیا۔

گوکہ عمر دین کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

لیکن

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ قدرت نے ایک ہی وقت میں کتنے جانوروں کی خصلت اس شخص

نا پیدا کر دی ہے اور اس درندے کو انسان کا روپ دے کر انسانوں کے ریورٹ میں چھوڑ دیا

؟

”شاہ جی یہ کام تو سمجھیں ہو گیا۔ آپ آج ہی نذر محمد کا کیس انکوائری افسر چوہدری نظامت بڑا دیں اور باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دیں۔“

عمر دین بھی شیطان کا چھیلا ہی تو تھا۔

”ٹھیک ہے شاباش۔ یہ بات تو میرے دماغ میں آئی ہی نہیں۔ یہ تو اپنے گھر کا اطمینان نا۔“

فضل شاہ نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں جی میری ایک اور تجویز بھی ہے۔ یونین کونسل کی گدی سرداروں کے پاس ہی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ بات بہت ضروری ہے کہ ان کا اعتماد بحال رکھا جائے۔ آپ اس مطلب سمجھ گئے ہیں نا۔“

عمر دین نے اگلا پتہ بھی پھینکا۔

”عمر دین تم یا راجھے بھلے یا سدا ان ہو گئے ہو یا

فضل شاہ نے بھیا نک قہقہہ لگایا۔

”شاہ جی سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہے۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟

اس نے چیمبر مینی کے انداز میں دانت نکالے۔

دونوں شیطان دیر گئے تک منصوبہ بندیاں کرتے رہے۔

نذر محمد نے کبھی قتل و غارت گری میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ بڑے دھیے مزاج کا

انسان پسند انسان تھا۔

لیکن

جب اسے تھکنے کیحوالات میں یہ خبر ملی کہ حنیف خان نے اپنی ماں کی قبر کی مٹی لٹکنے سے پہلے اس کا حساب بے باق کر دیا ہے تو اس کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔

”واہ شیرواہ — تو واقعی تھو خاں کا بیٹا ہے — ٹھنڈ پڑ گئی کیلجے میں —  
حوالدار تیرے منہ میں لکھی شکر“ اُس نے خبر دینے والے حوالدار کو جو اُس کے نزدیکی گاؤں کا  
لیکن اور تھو خاں کا بہت احسان مند بھی تھا کہا۔

نذر محمد جانتا تھا کہ دلیری میں حنیف خاں کی کوئی مثال اس علاقے میں نہیں ہے۔  
بد معاشی سے یہ لوگ اُسے زیر نہیں کر سکتے تھے۔ لے دے کر ان کے پاس صرف سیارت  
منافقت اور مکاری تھی۔ وہ جانتا تھا اس خبر کو سن کر فضل شاہ کو جان کے لالے پڑ گئے ہوں  
گے اور وہ اب خاموشی سے نہیں بیٹھے گا کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔  
اُس روز جب عمر دین اُسے ملنے آیا تو نذر محمد کا ماتھا ٹکا۔

وہ دیکھو نذر محمد مجھے تم سے بافضل شاہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں تو تھو خاں کے  
سارے خاندان کی عزت کرتا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔ حنیف خاں اس خاندان  
کا واحد چشم و چراغ ہے۔ اگر خدا نخواستہ اُسے کچھ ہو گیا تو تھو خاں کی سنتاں  
ہی ختم ہو جائے گی۔ میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اس سے تمہاری بھی جان چھوٹی ہے۔  
اور معاملہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں فضل شاہ کو منالوں کا حالانکہ اُس کا بھائی قتل ہو  
ہے لیکن تمہاری خاطر میں اُسے کسی نہ کسی طرح راضی کروں گا۔ بس تم کسی کو اس بات کا  
نہ ہونے دینا کہ فضل شاہ نے تمہاری رہائی کے لئے کام کیا ہے۔ اس کے عوض تم حنیف خاں  
کو باند کر دو۔ کہ وہ شاہ صاحب کی طرف متہ نہ کرے۔ جہاں تک سرداروں کا تعلق ہے تو یہ  
فیصلہ تمہارے اور ان کے درمیان ہے اس میں فضل شاہ نہیں آئے گا۔ نذر محمد نے  
دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تم کیا سمجھتے ہو کہ ایک وقت میں حنیف خاں مفروضہ کر دو گے  
سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس ہمت سے فائدہ اٹھاؤ نذر محمد اس طرح حنیف خاں  
سرداروں کو بھی مات کر دے گا اور ہاں یہ بات دماغ سے نکال دینا کہ وہ پولیس سے ساری  
زندگی بچا رہے گا۔ اگر فضل شاہ سے دوستی ہو گئی تو میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ حنیف  
خان کو بری کروا کے ہی دکھا دوں گا۔“

نذر محمد جانتا تھا کہ اس ”پیشکش“ کے پس پردہ خطرناک سازش ہے؟  
فضل شاہ ایک تیر سے دو شکار کرنے جا رہا تھا۔ جہاں وہ ایک طرف حنیف خاں کے

پیلے اپنے دیرینہ دشمنی اور مشکل کے ممکنہ خطرے سردار رشید کو مر دا سکتا تھا وہاں حنیف خاں  
بھی اس طرح چکر دے کر دھوکے سے مار سکتا تھا۔  
لیکن —

اُسے فی الوقت عمر دین کی ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کوئی چارہ دکھائی نہیں دے  
پاتا تھا۔ اگر وہ فضل شاہ کی طرف سے ہونے والی یہ پیشکش ٹھکرا دیتا تو شمشیر نگر میں کوئی اُس  
ابن کا چال سیواں کر دینے کی جرات بھی نہ کر سکتا۔  
اس پر قاتلانہ حملے کا پرچہ ہوا تھا اور فضل شاہ اگر چاہتا تو ایسی ایسی دفعات اُس پر  
لوادیتا کہ پھر ساری زندگی وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزار دیتا۔

حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے اُس نے عمر دین کی ہاں میں ہاں ملانا ہی مناسب  
بانا۔

لیکن —  
وہ گر کر صلح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضل شاہ کو خود پر شک کرنے  
کا موقع دے۔

یہ بات وہ بھی سمجھتا تھا کہ عمر دین جو بظاہر اس کا ہم در دین کر کھڑا ہے دراصل فضل شاہ  
ادنی سانو کر ہے اور اُسے نذر محمد یا حنیف خاں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تجویز اُس کی  
ہیں بلکہ فضل شاہ کی تھی! —

”عمر دین تم ہماری برادری کو جانتے ہو۔ ہم لوگ کٹ تو سکتے ہیں۔ جھک نہیں سکتے۔  
حنیف خاں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہے۔ میرا اُس  
بے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو میں اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ وہ  
نذر شاہ سے علاقہ نہ رکھے۔ جہاں تک سرداروں کا تعلق ہے تو وہ شاید میری بات  
ماننے اور اس بات کی تم فکر نہ کرنا ہمارے درمیان اس معاہدے کی ہوا بھی کسی کو نہیں  
پتا۔“

لیکن یہ خیال ذہن سے نکال دینا کہ کوئی حنیف خاں کو چکر دے سکتا ہے۔ وہ بھی

تھو خاں کا بیٹا ہے۔“

اُس نے بالآخر عمر دین کو مطمئن کر دیا۔

”بس نذر محمد تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ اس مسئلے میں تیری عزت اور جہاں روزوں داؤ پر لگے ہیں اگر تمہاری رہائی کے بعد حنیف خاں کی طرف سے فضل شاہ پر کوئی حملہ ہوا تو وہ مجھے برباد کر کے رکھ دے گا۔“

عمر دین نے بظاہر خود کو مطمئن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

نذر محمد کو تیسرے دن رہائی مل گئی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق اُس کی ضمانت کے لئے نمبردار کی طرف سے درخواست دی

گئی اور وہ ضمانت پر رہا ہو گیا۔

ایس ایچ او چوہدری نظامت نے کیس خود تیار کرنا تھا۔ اُس نے تفتیشی رپورٹ میں

نذر محمد کو بے گناہ قرار دے دیا۔

نذر محمد گاؤں آیا تو سیدھا بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔

## نہلے پہ درہلا

صغرا نے بابا حیات کی بات پر صا د کیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ ابھی اس گاؤں میں اُس کے خاوند کے دفن دار موجود ہیں جن میں سے

بات بھی تھا۔ جس نے راتوں رات صغرا کو شہر میں دلی محمد کے گھر پہنچا دیا تھا۔

دلی محمد کی شہر میں معمولی سی دکان تھی۔ وہ بھی آج ہی اصغری کے کفن سے فارغ

پنے گھر پہنچا تھا جب صغرا کو بابا حیات وہاں چھوڑ گیا۔ دلی محمد تھا تو رشتے میں حنیف

کا پھوپھا۔

لیکن

اُس نے کبھی تھو خاں کو اُس کے کڑو توں کی وجہ سے پسند نہیں کیا تھا۔

وہ بڑا محتاط اور سیدھا سادھا آدمی تھا جس کی زندگی کا مقصد ڈر ڈر کر صبح سے شام

کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گاؤں سے اُس کی دلچسپی اس حد تک ہی تھی کہ تھو خاں اُس کا سالا

در اُس کی بیوی کبھی کبھی اپنے بھائی سے ملنے چلی جایا کرتی تھی یا پھر تھو خاں کی بیوی تھی

ایں ساری زندگی گاؤں کی کوئی نہ کوئی سوغات بھیجتی رہی۔

دلی محمد جانتا تھا کہ صغرا کے یہاں تک پہنچنے کے پیچھے کتنی ہی کہانی ہے۔!

وہ خود ڈرا اور سہما ہوا تھا کہ کہیں پولیس کا عذاب اس پر بھی نہ آجائے۔ اُس نے یہ

کہا ہا کہ صغرا کو اپنے گھر سے نکال دے۔

لیکن

اُس کا دل یہی چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو صغرا جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔

وہ سرداروں اور فضل شاہ سے متعلق کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں تھا اور جانتا تھا کہ صفراں ہی ان کے ہاتھ میں تریب کا ایسا پتہ ہے جب چاہیں پھینک کر حنیف خاں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔

شمیر نگر میں جن لوگوں نے نتھو خاں کے گھر پر حملہ کیا تھا وہ اس کی بیوی کو قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ صفراں کو اغوا کرنے آئے تھے تاکہ اسے اپنے پاس برعمال بنا کر حنیف خاں کو اپنے جال میں پھنسنے پر مجبور کر دیں۔

عین ممکن تھا اب وہ لوگ صفراں کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جاتے! بابا حیات تو اُسے چھوڑ کر انہیں قدموں پر واپس لوٹ گیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں میں کسی کو بھی اُس پر شک گذرے۔

دلی محمد نے بادل نحو اسٹہ صفراں کو سینے سے لگا کر پیار کیا تھا جبکہ اُس کی بیوی تو پر مٹی جا رہی تھی۔

جس خوف کا سامنا دلی محمد کو تھا۔ اُس تلخ حقیقت کو حنیف خاں نے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا اُس کا پھوپھا ایک کمزور اور غریب آدمی ہے اور اپنے دشمنوں سے اُسے ہر کمینگی کی توقع تھی۔ اُن لوگوں کو جب علم ہوا ہو گا کہ صفراں غائب ہے تو انہوں نے پاگل کتوں کی طرح اُس کا تعاقب شروع کر دیا ہو گا۔

اس سے پہلے کہ یہ خونخوار کتے صفراں تک پہنچتے وہ راتوں رات اپنے پھوپھا کا ہاں پہنچ گیا پہلے تو اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دلی محمد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کا دل دھاک سے رہ گیا۔

لیکن —

جب اُسے علم ہوا کہ حنیف خاں راتوں رات اُسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا تو اُس کے دل کو اطمینان ہوا۔

”پھوپھا گھبرانا نہیں۔ بس ایک کام تم کو دو۔ اس وقت نکاح خواں کا بندہ اور ہمارا نکاح پڑھا دو۔ کم از کم میرے ماں باپ کی روجوں کو یہ سکون تو مل جائے گا“

حنیف خاں نے کہا۔

دلی محمد نے پس و پیش کرنا چاہا واقعی یہ معاملہ اس کے بس سے باہر تھا۔

لیکن —

اُس کی بیوی اڑے آگئی۔

وہ نتھو خاں کی بہن تھی —

حنیف خاں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ دلی محمد کے ہاتھ میں تھما کر تو اُسے خاصا بہادر کر دیا تھا پھر بھی احتیاط اُسی کی پھوپھی دونوں کو راتوں رات شہر کے دوسرے حصے میں اپنے شادی شدہ بیٹے کے گھر لے گئی جس نے حنیف خاں کی طرف سے ملنے والے نوٹوں والہ کی مدد کے سہارے یہ معاملہ بھی نمٹا دیا۔

دونوں کا نکاح باقاعدہ پڑھا گیا۔

اپنی پھوپھی کے اصرار پر اُس نے سہاگ رات اُس کے بیٹے کے گھر میں منائی اور گھر پر اپنی بیوی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

اُس نے کسی کو بھی ممکنہ ٹھکانے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

اس مرحلے پر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

دوسرے شہر میں جب وہ گھر پہنچا تو نذیر اُس کا بے چینی سے منتظر تھا۔

”اتنے دن کہاں لگا دیئے۔ یہ کون ہے؟“

اُس نے چھٹے ہی دو سوال پوچھ ڈالے۔

حنیف خاں کے لئے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ وہ اس گھر میں اس وقت اکیلا ہے۔

”اس کو لانے میں اتنے دن لگ گئے۔ یہ تیری بھابھی ہے صفراں —“

اُس نے اپنی بیوی کا تعارف کروایا۔

نذیر نے مہربانی سے اداکاری سے صفراں کے لئے نیک تمنائوں کا اظہار کیا اور فوراً ایلر جا کر اُن کے کھانے پینے کے لئے بہت سی چیزیں لے آیا۔ اُس نے شام تک صفراں کی ضرورت کا بھر پور نامہ اٹھا کر اُسے اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ وہ انتہائی وفادار اور مہربان

انسان ہے۔

مہی تھا وہ پہلا تاثر جو صفراں نے اُس سے متعلق قائم کیا۔

رات کو جب حنیف خاں اور نذیر ادا دوسرے کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے اور صفراں کے لئے ہانڈی روٹی تیار کر رہی تھی تو حنیف خاں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

”سزلیاں کہاں گئی؟“

”جہاں اُسے جانا تھا!“

نذیر نے فی البدیہہ جواب دیا۔

”میں سمجھا نہیں — تم کیا کہہ رہے ہو؟“

حنیف خاں کو واقعی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں یہی سوچا تھا کہ سزا نذیر مچھی نے اُس کی ناراضگی ختم کرنے کے لیے لڑکی کو ماں باپ کے پاس بھیج دیا ہے۔

”یار! میں سمجھنے والی کیا بات ہے؟ جو عورتیں اپنے یاروں کے لئے ماں باپ

عزت پر لٹ مار کر آجائیں وہ کہا جاتی ہیں — وہ کوئی گھریلو سنگھڑ عورت تو تھی نہیں

بد معاش عورت تھی۔ میں نے اپنا موج میلہ کر کے اُسے آگے روانہ کر دیا۔ اپنے حصے

پیسے وصول کر لئے۔ آخر تمہارے بعد گھر کا خرچ بھی تو چلانا تھا۔ پانی کی موٹر لگانا تھی

تنگے میں تو سارا دن پانی آتا نہیں۔ یوں بھی وہ میری کوئی منکوحہ تو تھی نہیں۔ نہ ہی

زندگی ایسی عورتوں کو کوئی پلے سے باندھ کر رکھتا ہے —“

اُس نے دھکی چھپی رکھے بغیر ساری بات کہہ دی۔

ایک لمحے کے لئے تو حنیف خاں کا دل بھی چاہا کہ اس کا گلہ دبا کر بھی قصہ ختم کر

لیکن —

حالات نے آج اُسے پہلی ہر تیر ایسی بے غیرتی پر مجبور کیا کہ وہ مسکرا کر چپ ہو رہا

دیکھو یار حنیف۔ میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ میں نے کبھی تمہارے دھندے

اعراض نہیں کیا تم میرے پر نہ کرنا۔ میرے خیال سے اس طرح ہم دونوں کا گوارا ہو سکتا

ہے —“

اُس نے حوصلہ پا کر انگلی بات بھی کہہ دی۔

حنیف خاں نے اُس روز ایک فیصلہ بہر حال کر لیا تھا کہ اُسے جلد از جلد نذیر سے

بھی جان چھڑانی چاہیے۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اُس نے صفراں کی ذمہ داری

ہاں بوجھ اپنے کندھوں پر ڈالا تھا خواہ مخواہ خود کو بزدل سا محسوس کرنے لگا تھا۔

یوں بھی ابھی اُسے کچھ اور حساب بے باق کرنے تھے۔

اس نے صفراں کو بھی نذیر سے متعلق کوئی ہدایت دینا اس لیے مناسب نہ جانا کہ اُس

طرح خواہ مخواہ اُس کے شک میں مبتلا ہونے کا خطرہ موجود رہتا۔ فی الوقت اُس کے پاس صفراں

کو چھپائے رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ پندرہ بیس روز اسی طرح گذر گئے۔

ساری زندگی نہ محنت مزدوری اس نے کی تھی نہ ہی نذیر سے — دونوں جھپٹ پھپٹ

ایک کھاتے رہے۔

”حنیفے۔ ہمارے پاس کوئی قاروں کا خزانہ نہیں ہے۔ ہم دونوں مفرو اور اشتہاد یوں کی

زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی زندگی میں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت رہتی ہے۔ خدا معلوم کس جگہ سے

کب ہمیں بھاگ کر کہاں پناہ لینی پڑے۔ میری بات مانو تو تمہارے لیے ایک شاندار دھندہ ہے

میرے پاس“؛

اس روز جب نذیر نے کہا تو واقعی اُسے احساس ہوا کہ وہ تو اب اپنی صفراں میں ہی

زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔

”کیا“؟

اُس نے بے یقینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

”آجکل تو یہ سالے سکولوں کالجوں کے کونڈے سڑکوں پر سیس اور پٹرول پمپ لوٹ

لے رہے ہیں تو ہم کیا یہ بھی نہیں کر سکتے۔“

نذیر نے اُنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس کے لئے مقامی حالات سے واقف ہونا ضروری ہے نذیر سے — ہر کام

کے کچھ اصول ہوتے ہیں“

اُس نے نیم دلی سے کہا۔

”یار ایک تو مجھے سمجھ نہیں آتی۔ عورتوں کا دھندہ تم مجھے کرنے نہیں دیتے۔ چوری چھکاری تم نہیں کرنا چاہتے تو پھر کرو گے کیا؟ تو تم یار ایسے شریف بن رہے ہو جیسے ساری زندگی مجھ میں اذان دیتے ہوئے یہاں آگئے ہو۔ آخر اپنے باپ کے ساتھ مل کر تم نے چوری ہی کی ہے۔ کیا ہوا سرحد کے اس پار یا اس پار۔ اب میں تمہاری مرضی کا کام کہاں سے لاؤں۔ تم حالات کو سمجھ نہیں رہے ہمارے پاس اگر نوٹ نہ رہے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شادی نے ہمیں بزدل بنا دیا ہے“

نذیر نے اس کی آخری بات تازیا نے کا کام کر گئی۔

حنیف خاں پھر گیا۔

اُس نے واقعی حنیف خاں کو بہت بڑا طعنہ دے کر اُس کی غیرت جگا دی تھی۔

”نذیر نے خبردار کبھی میری مردانگی پر حملہ نہ کرنا۔ کیا چاہتے ہو تم بتاؤ میں کرنے کو

تیار ہوں“

حنیف خاں نے غصے اور اعتماد سے کہا۔

”یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔ میں نے یہاں تین چار مہینے رہ کر جھک نہیں ماری اور ارد گرد کی ساری خبر کھتا ہوں۔ یہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک پٹرول پمپ پر نظر ہے میری۔ وہاں سے شام کو پٹرول پمپ کا منشی رقم کا تھیلے لے کر موٹر سائیکل پر شہر میں اپنے مالک کو جس کے اور بھی کاروبار ہیں شام تک کی آمدنی پہنچانے آیا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم آسانی سے اُسے قابو کر لیں گے۔ تیس چالیس ہزار سے کم کیا ہو گا اُس کے پاس۔“

نذیر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“

اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اگلے روز سپر ہر کو دونوں ایک لاری پر بیٹھ کر اس جگہ کی طرف چل دیئے جس کی نشاندہی نذیر نے کی تھی۔

نذیر نے اُسے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اُس نے واقعی تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد منصوبہ بنایا تھا۔ یہاں سے ایک چھوٹی سڑک شہر کو جاتی تھی اور پٹرول پمپ مضافاتی علاقے میں قائم تھا نذیر نے اُسے بتایا تھا کہ وہ کسی جگہ منشی کو ریس بانڈھ کر روک سکتے ہیں۔ جہاں سے اس کی مشکیں کس کر آئے ہیں پھینک کر وہ اس کی موٹر سائیکل کے ذریعے بھاگ سکتے ہیں۔ حنیف خاں نے اُس کے منصوبے کا بڑی تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اُس میں کامیابی کے خاصے امکانات ہیں۔

حنیف خاں کے لئے گو اس نوعیت کی ڈکیتی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

لیکن

وہ بہت بااعتماد تھا۔

نذیر موچی نے پہلے سے ہی تمام ممکنہ خطرات پر نظر رکھی تھی۔ دونوں موٹر سائیکل آسانی سے چلا سکتے تھے۔ انہیں بس یہاں سے تھوڑے فاصلے تک ہی جانا تھا جس کے بعد وہ دوسرے راستے سے شہر واپس پہنچ جائے۔!

پٹرول پمپ کے منشی نے اپنی دانست میں شہر جانے کے لیے یہ بڑا محفوظ شارٹ کٹ تلاش کیا تھا۔ یہ راستہ فاریسٹ کالونی سے گزر کر جاتا اور معمول کے راستے سے آدھا گنا کم تھا۔ آج بھی وہ معمول کے مطابق سارے دن کی جمع پونجی ایک کنوس کے تھیلے میں رکھے۔ آنے والے مصائب سے بے نیاز معمول کے مطابق موٹر سائیکل پر جا رہا تھا جب فاریسٹ کالونی سے بشکل ایک فلائنگ پہلے والے موٹر پر اچانک اُسے دو درختوں کے درمیان ایک تسی بندھی نظر آتی جس پر سرخ رنگ کے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی بندھے تھے۔

اس کا بظاہر مطلب یہی تھا کہ فاریسٹ کالونی میں کوئی کام ہو رہا ہے اور اُن لوگوں نے احتیاط راستہ بند کر رکھا ہے۔

شام کا ملگیا اندھیرا سیاہی میں ڈھلنے لگا تھا جب منشی نے موٹر سائیکل روکی اور چاہا کہ



اُتر کر آگے کی صورت حال کا جائزہ لے یا پھر واپس لوٹ کر دوسرے راستے سے شہر جائے۔  
ابھی اُس کی موٹر سائیکل بمشکل بند ہی ہوئی تھی جب اچانک ہی موٹے سے تیز دوا  
ایک درخت کی عقب سے دو نقاب پوش برآمد ہوئے جن میں سے ایک نے اُس کی طرف  
پستول تان رکھا تھا

”خبردار — اپنی جگہ سے نہ ہلنا“

حنیف خاں کی ایک ہی دھمکی سے منشی کی گھگی بندھ گئی۔

”لگ لگ کیا بات ہے۔ تم تم کون ہو؟“

اس نے ہکلاتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”چپ۔ خبردار جو آواز نکالی۔ منہ دوسری طرف کرو“

اس مرتبہ حنیف خاں نے اُسے زور سے ڈانٹا تھا کہ بے چارہ دھان پان سامنی  
ھل کر رہ گیا۔ بے اختیار چابی والے کھلونے کی طرح اُس کی گردن دوسری طرف گھوم گئی۔

حنیف خاں نے پھرتی سے اُس کی کمریلات رسید کی تو منشی اوندھے منہ زمین پوس ہو  
ہو گیا۔ اُس سے پہلے کہ اُس کے منہ سے چیخ نکلے۔ نذیر نے اُس کی گردن پر گھٹنا ٹکادیا اور اُس  
کے کندھے پر دوسرے بڑے سے کپڑے سے اُس کا منہ باندھ دیا۔

اسی اثناء میں وہاں بندھی رستی سے حنیف خاں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں بھی باندھ  
یئے۔ منشی نے جس کی خوف کے مارے پہلے ہی زبان گنگ ہو چکی تھی چپ چاپ اپنے ساتھ یہ  
برداشت کر لیا اور حنیف خاں نے اُسے کندھے پر بوری کی طرح اٹھا کر سڑک کے کنارے  
ختوں کے پیچھے رکھ دیا۔

اس دوران نذیر اموٹر سائیکل سٹارٹ کر چکا تھا۔ تھیلہ حنیف خاں نے قابو کر لیا اور موٹر  
سائیکل کو وہ نہر کی پٹری کے کنارے بھگانے لگا۔ قریباً ڈیڑھ میل دور جا کر اُس نے موٹر سائیکل  
پر میں پھینک دی اور دونوں پیدل ہی فارسیٹ کالونی کی طرف چل دیئے۔

انہوں نے کالونی کے باہر کا ایک لمبا چکر کاٹا اور پہلے سے طے شدہ دو مختلف راستوں  
سے شہر کے ریلوے اسٹیشن تک دو مختلف بسوں کے ذریعے پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ ایک

مانگے پر بیٹھ کر اپنے محلے سے نزدیکی علاقے میں اُتر گئے اور وہاں سے پیدل اپنے گھر گئے۔

”کیوں حنیف خاں کیسا رہا کارویار“

نذیر نے استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”واہ نذیرے — یار تو نے تو کہا ہی کر دیا“

حنیف خاں نے اسے تو صہنی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے حنیفے — آگے آگے دیکھنا — بس میرے مشوروں پر

عمل کرتے رہو۔ دونوں میں کر ڈر پتی بنا دوں گا پھر اس شہر کی کوئی بڑی سی کوٹھی خرید کر اپنا نام بدل  
کر ساری زندگی نوابوں کی طرح ٹھاٹھ پاٹ سے گزارنا —“

نذیرے کی گردن کچھ زیادہ ہی پھول گئی تھی۔

آٹھ دس روز تک انہوں نے جی بھر کے عیاشی کی۔ اس درمیان حنیف خاں اپنی نوبیا ہٹا  
کو دوسرے بڑے شہر میں ”ہنی مون“ منانے لے گیا اور نذیرے نے گھر پر ہی ایک فاسٹے سے  
رنگ دریاں منانی شروع کر دیں۔

یہ غریب اور سفید پوش لوگوں کا علاقہ تھا۔

قریباً تمام لوگ اس علاقے میں دوسرے شہروں سے آکر قیام پذیر ہوئے تھے پہلے پہل وہ  
یہاں صرف مزدوری کے لیے آئے تھے پھر اپنا گھر بار بھی یہیں منتقل کر لے۔

یہ لوگ صبح سے شام تک کاروبار حیات میں اس قدر الجھ جاتے کہ انہیں ایک دوسرے  
کے متعلق کچھ علم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں بھی ابھی اس محلے میں لوگوں نے ایک دوسرے سے  
بے تکلف ہونا شروع نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ یہاں کون آتا ہے؟ اور کون جاتا ہے؟

اگر کسی نے نوٹس بھی لیا تو بھی سمجھا ہو گا کہ یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں  
کراچی آئے آج انہیں آٹھ واں دن تھا جب اچانک ہی صفراں نے اُس سے پوچھا۔

”کچھ گاؤں کی بھی خبر ہے — خدا جانے میرے باپ پر کیا گز رہی ہو گی“

حنیف خاں نے گاؤں کو بھلایا تو نہیں تھا۔

اس کی تو ایک ایک سانس وہیں اٹھی تھی۔

فی الوقت اگر اس نے شیشہ نگر کو نظر انداز کیا ہوا تھا تو صرف اس لئے کہ سردار مرید کے قتل

کے بعد اٹھنے والے طوفان کی گرد کچھ بیٹھ جائے تو وہ اگلا لمحہ عمل اختیار کرے۔  
لیکن —

اُسے اچانک ہی خیال آیا کہ واقعی اس کے مامے نذر محمد کی زندگی تو ان لوگوں نے جہنم بنا دی ہوگی۔ اُسے سب سے پہلے اپنے ماموں کی فکر کرنی تھی۔ جس کے ذریعے وہ گاؤں میں انہیں جائیداد فروخت کر سکتا تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ فضل شاہ کچھ دنوں بعد ہی اس کی جائیداد ہی بچ کر ضبط کر دیتا۔ ابھی تک کم از کم وہ اس صدمے سے محفوظ تھا۔  
”ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے کہ مامے کی خبر لینا ہی چاہیے“

اور —

اگلے ہی روز وہ اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔

صغرا کو نذیرے کے ساتھ گھر پر چھوڑ کر وہ ایک مرتبہ پھر اکیلا ہی شمشیر نگر کی طرف جا رہا تھا۔ اس مرتبہ پھر وہ اپنے گاؤں میں چوروں کی طرح داخل ہوا تھا۔  
اُس نے گاؤں کے باہر ہی بڑے معصومانہ انداز سے یہ خبر حاصل کر لی تھی کہ نذر محمد نے اپنے بڑے گاؤں کو لے گیا ہے اور ضمانت بھی نمبر دار احمدی نے کر دینی تھی۔  
پہلے تو اُسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو گیا؟ سرداروں اور فضل شاہ کی موجودگی میں تو نذر محمد کی ضمانت کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ پھر اس کے دل نے گواہی دی کہ یقیناً یہ بھی دشمنی کی کوئی چال ہی ہوگی۔

اپنے گھر پہنچ کر اُس کے اس شبے کی تصدیق بھی ہوگئی۔

نذر محمد نے اُسے گلے لگاتے ہی بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا تھا۔ حنیف خاں نے اُسے تسلی دے کر خاموش کر دیا تو نذر محمد نے نارمل ہونے کے بعد تمام واقعات اُسے سنا دیے۔  
”حنیف خاں تم جو بات کہنے والے ہو میرے دماغ میں بھی یہی بات ہے۔ مجھے یہی یہی شک ہے کہ اس کے پیچھے فضل شاہ کی کوئی شرارت ضرور ہوگی۔ لیکن اس مرتبہ ہم اُس کے ساتھ سیاست کریں گے۔ مامے نے خود کو سمجھ کیا رکھا ہے۔“

نذر محمد نے اُس کے تبصرے سے پہلے ہی اُس کے دل کی بات کہہ دی۔

”ہم اُس کے ساتھ کیا سیاست کر سکتے ہیں ماما“

حنیف خاں نے بددلی سے کہا۔

”ہے ایک بات۔ ہمیں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر تمہاری جائیداد کا مسئلہ نمٹا لینا چاہیے“

نذر محمد نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

واقعی اُس کے لئے یہ بڑا جان لیوا مسئلہ تھا۔

دونوں ماموں بھلنے کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ جس کے تحت حنیف خاں نے اپنی زمین کا مختار نامہ اپنے ماموں کو مکمل اختیارات کے ساتھ منتقل کر دیا تھا۔ اس طرح اُس کے دل پر پڑا بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔

ماموں نذر محمد کی چار جوان بیٹیاں ابھی بچپن والی تھیں اور ان کا ذریعہ آمدن ان کی تھوڑی سی زمین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تنخواہیں زندہ ہوتا تو وہ خود اُس کی ساری بیٹیاں بیاہ دیتا۔  
لیکن —

اب حالات کا دھارا ان سب کو مخالف سمت بہ رہا تھا۔

حنیف خاں کے لئے نذر محمد نے مامے کا غمناک چوری چھپے تیار کر دیا۔ رکھے تھے۔ جن پر اُس نے پرانی تاریخوں میں حنیف خاں کے دستخط کروا لیے اب وہ اپنے اگلے مشن کا ایک مرحلہ مکمل کر چکا تھا۔

فی الوقت اُسے یہ سارا کام فضل شاہ کو دھوکے میں رکھ کر ہی کرنا تھا۔

اور —

اُس نے ایسا ہی کیا۔

اُس رات شمشیر نگر میں صبح ہونے تک نمبر دار احمدی کے گھر نذر محمد اور حنیف خاں کی بیٹھک چلتی رہی۔ جائیداد خریدنے کے لیے احمدی تیار ہو گیا۔  
تینوں نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ جائیداد کی احمدی نمبر دار کے نام منتقلی تک وہ

اس بات کا کسی کو کانوں کان ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔

اس مرتبہ جب صبح کاذب کی روشنی پھوٹنے سے پہلے حنیف خاں نے اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر اپنے گاڈوں کو اوداع کہا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔  
وہ بڑی حسرت بھری نظروں سے اپنے آباؤ اجداد کی اس حویلی کو آخری لمحے تک دیکھتا رہا جس میں کبھی ننھو خاں علاقے کے سردار کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔

اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اس تلخ حقیقت کا شدت سے ادراک ہوا کہ وہ سیرت میں ٹانگ اڑانے سے وہ چور ہی بنا رہتا تو بہتر تھا۔ یہ سارا عتاب اس پر گندی سیاست میں داخل ہونے کے بعد ہی نازل ہوا تھا۔  
اسے اس لفظ سے بھی گھین آنے لگی تھی۔

اس کا بس چلتا تو اپنے علاقے کے سارے سیاستدانوں کو جو غریب اور ان پڑھ عوام کو اپنی ہوس اقتدار کی ڈگڈگی پر بندر کا ناخ چماتے رہے تھے قطار میں کھڑے کر کے گولی مارتا۔

لیکن —

وہ بے بس تھا۔

یوں بھی یہ بو ذی حسرت الارض کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کو ختم کرنا اب کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

بھینگی آنکھوں اور بوجھل دل کے ساتھ اس نے اپنے گاڈوں کو اوداع کہا تھا اور

اپنے ماموں نذر محمد سے کہا تھا کہ وہ جائیداد سے حاصل ہونے والی تمام رقم لے کر اپنے غافلانہ سمیت یہاں سے نکل جائے اور کسی بڑے شہر میں آباد ہو کر زندگی کے باقی دن آرام سے بسر کر لے۔!!

اس نے اپنے باپ کی تربیت کے پیش نظر اپنے ماموں کو بھی اپنے ایڈریس سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کبھی وہ پولیس کی گرفت میں آجاتا اور حنیف خاں کو لینے کے دینے پڑ جاتے البتہ اس نے نذر محمد سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ ولی محمد سے رابطہ رکھے اور وہ اس کے ذریعے ان سے ان ملے گا۔

نذر محمد نے اس کی بڑی منت سماجت کی تھی کہ اس زندگی پر لعنت یہ بھیج کر وہ بھی ان کے ساتھ ہی آجائے اور باقی زندگی گمنامی میں گزار دے۔

لیکن —

اس بات کا علم حنیف خاں کو اچھی طرح تھا کہ یہ اس کے لیے ممکن نہیں رہے گا یوں بھی اسے اپنی فطری جبلت پر کنٹرول حاصل نہیں رہا تھا۔ وہ جانتا تھا جب تک فضل شاہ کو کیفر کردار تک نہ پہنچائے ایک لمحے کے لئے بھی ٹمکھ کا سانس اُسے نہیں آئے گا۔  
اس کے باپ کی روح تب تک بے چین رہے گی —

حنیف خاں کی روانگی کے اگلے ہی روز نذر محمد چوری چھپے عمر دین سے جا ملا۔ اس نے عمر دین کو بتا دیا کہ کل حنیف خاں اُسے ملنے آیا تھا اور اُس نے فضل شاہ کی پیشکش مان لیا ہے۔

”کہاں ہے وہ آج کل؟“

عمر دین نے بے چینی سے پوچھا۔ بظاہر اُس نے یہ سوال اس طرح کیا تھا جیسے اُس کا راز خیر خواہ ہو۔

”عمر دین — تم جانتے ہو وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ میں نے درجنوں مرتبہ کہہ کر یہ یاد لراں کا ایڈریس پوچھنا چاہا لیکن اُس نے سختی سے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں اب دوبارہ یہ سوال نہ کروں — تم نہیں جانتے عمر دین میری بیٹی بھی اُس کے پاس ہے خدا جانے وہ کس حال میں ہے؟ کہاں ہے؟ ہمیں تو خود اس کی کوئی خبر دینے والا نہیں رہا۔

نذر محمد نے اُس سے بھی زیادہ ہوشیاری دکھائی اور مظلومیت کی تصویر بن گیا۔

”نذر محمد — میرا مطلب تھا کہ آخر وہ ہمارے جگڑی یار کا بیٹا ہے۔ اس وقت فضل شاہ بڑے عہدے پر فائز ہے میں اس صلح کے بدلے فضل شاہ کے ذریعے اُس کی رہائی کی کوشش کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ سردار شید کا صفایا کر دے تو فضل شاہ اُس کی مکمل حمایت کرے گا اور اُس کی رہائی کے لئے بھی سہولت کی بازی لگا دے گا — تم میرا مطلب سمجھتے ہو ناں — دیکھو بھائی ہم ایک ہی برادری کے ہیں۔ ہمارے درمیان کون سا پردہ ہے۔

اس کے علاوہ حنیف خاں کی جان بچی نظر نہیں آتی — تم یہی سوچو آخر کب تک وہ نذر کی زندگی گزارے گا۔ پھر تمہاری بیٹی یعنی اُس کی بیوی بھی ساتھ ہے۔ اُسے کہاں کہاں لیے پھرے گا۔ اکیلا مرد تو کوئی بات نہیں — عورت ذات کا ساتھ اس زمانے میں ذرا مشکل ہی سے گزارا ہوتا ہے — میری بات سمجھ گئے ناں —  
 عمر دین نے اپنی دانست میں اُسے بے وقوف بنالیا تھا۔

اور —

نذر محمد نے بھی تاثر دیا جیسے وہ اُس کے بچے میں آگیا ہے۔  
 ہاں بھائی عمر دین تمہاری بات تو بالکل صحیح ہے۔ میں اُسے ضرور اس بات کا قائل کروں گا بلکہ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح اُس کو فضل شاہ سے ملاقات کے لیے بھی تیار کر لوں۔ اور مجھے امید ہے وہ میری بات مان جائے گا۔“  
 اس نے عمر دین کی تسلی کروادی —

”نذر محمد تو ایک مرتبہ حنیف خاں کو تیار کر لے۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنا۔ میں اُسے کر کے صلح نہیں کرنے دوں گا — برابری کی بنیاد پر بات ہوگی۔ آخر ہم بھی ذات برادری والے لوگ ہیں اور حنیف خاں کوئی معمولی آدمی نہیں۔ تھو خاں کا بیٹا ہے — تھو خاں کا بیٹا“  
 عمر دین نے بڑے جوش سے کہا۔

نذر محمد دل میں اُس کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا کہ اپنی دانست میں عمر دین نے اُسے گرا بنا لیا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ ایک مرتبہ اگر فضل شاہ اور حنیف خاں کا آمناسامنا ہو گیا تو حنیف خاں کو دینا کی کوئی طاقت اُس کے ہاتھ سے نہیں چلا سکے گی۔  
 فضل شاہ بڑا مکار بد معاش تھا۔

اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ لڑائی سے تو حنیف خاں کو نہ پر نہیں کر سکے گا۔ اس لیے اُس نے مکاری کا یہ حال پھیلایا تھا۔ ایک مرتبہ اگر یہ لڑائی اس حال میں اُلجھ جاتا تو پھر کبھی

سے باہر نہ نکل سکتا —

نذر محمد کو علم تھا کہ اگر وہ کبھی حنیف خاں کو دل سے بھی اس صلح کے لئے تیار کر لیتا تو بھی شاہ اُسے دھوکے سے مار دیتا۔

اُس نے عمر دین سے وعدہ کیا تھا کہ جس روز بھی اب حنیف خاں ملنے آیا وہ ہر ممکن شکر سے گا کہ اس کی ملاقات عمر دین سے ہو جائے۔

اس نے عمر دین کے اعتماد کے خباہتے میں اتنی ہوا بھیر دی تھی کہ عمر دین نے اس ملاقات کے ہی روز فضل شاہ کو شہر جا کر مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔

”شاہ جی — بس چند دنوں کی بات ہے آپ کے راستے کے دونوں کانٹے صاف میں گئے — سردار رشید تو حنیف خاں کے ہاتھوں مارا جائے گا اور حنیف خاں کا دم، آپ کے ہاتھوں ہو جائے گا“

اپنی بات کے اختتام پر اُس نے فائنہ قبضہ لگایا تھا۔

لیکن —

فضل شاہ کا جواب اس کی توقعات کے مطابق نہیں تھا

اُس کے ہونٹوں پر جیھی مسکراہٹ ضرور آئی تھی لیکن اس نے بر ملا کہا تھا  
 ”عمر دین تمہارے منہ میں گھی شکر، لیکن تم بتنا اس کام کو آسان سمجھ رہے ہو یہ اتنا آسان ہے — وہ تم خوردہ سانپ ہے — بڑے حساب اور دانائی سے قابو کرنا پڑے گا“  
 اسید بادشاہ آپ کو اس سے متعلق کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہو گئی ہے — خیر! ہاتھ لگن لایا۔ بس آپ ایک آدھ مہینے ہی میں دیکھ لیجئے —“

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

عمر دین — تم اس کام کے لئے دو مہینے لے لو — میں دو مہینے تک یونین کونسل زمین کی سیٹ تمہارے لئے رکولے رکھتا ہوں — اگر تم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تو

ان سے تمہارے لئے کم از کم انعام یہی ہو گا —“

فضل شاہ نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا —“

فضل شاہ کی آخری بات نے عمر دین کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اسی بڑی پیشکش —

اُس نے تو زندگی میں کبھی اتنے بڑے انعام کا تصور نہیں کیا تھا

اُس کے لئے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینک کاٹوٹا — اپنے گھر کی طرف واپس لوٹے ہوئے  
اُس کا دماغ تمام راستے آسمان پر پرواز کرتا آیا تھا۔ اُس نے تصور میں خود کو یونین کونسل  
پریزیڈنٹ سمجھ کر جانے لگتے اہم فیصلے بھی کر لئے تھے۔

اب اُسے ہر صورت یہ کام کرنا تھا۔ جس کے لئے فروری تھا کہ وہ نذر محمد کو زیاد  
سے زیادہ خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن —

اس مرحلے پر بھی اُس نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا اُس نے سوچا کہ کوئی ایسی حرکت ہرگز  
نہیں کرے گا جو نذر محمد کی ناراضگی کا باعث بن سکے۔

اپنے گاؤں پہنچ کر اُس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اگلے روز نذر محمد کو دیکھ  
گئی کے دو کتے اور ایک ”بجر سوتی“ بھینس روانہ کر دی تھی۔

یہ اُس کی طرف سے اظہار خیر سگالی تھا۔

نذر محمد عام حالات میں شاید ان تحالف پر تھوکتا بھی گوارا نہ کرتا، لیکن اندریں حالات  
اُس نے بادلِ نحواستہ بڑی خوش دلی سے یہ تحالف شکر یہ کے ساتھ قبول کر لئے تھے

اُسے اب جو کچھ بھی کرنا تھا اپنی خاندانی روایات کے برعکس بڑی سگاری اور ہوشیار

سے فضل شاہ اور اس کے حواریوں کو دھوکے میں رکھ کر کرنا تھا۔

اگر انہیں ذرا سا بھی شک گذر جاتا تو وہ لوگ اُس کو زندہ درگور کر دیتے۔ نذر محمد نے

دوسری طرف سرداروں کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

سرداروں نے اس کی ضمانت پر رہائی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا تھا بلکہ اس

بات کا سراخ لگانے کے لئے کوشاں تھے کہ کس نے اُس کی مدد کی ہے؟ اور اس ضمانت کے

پس پردہ کون سا خفیہ ہاتھ کار فرما ہے۔

لیکن —

فضل شاہ کے دست راست عمر دین نے بھی کسی امرکافی خطرے کو نظر انداز نہیں

تھا۔!

سرداروں کو تھانے کے اے ایس آئی کے ذریعے جو خفیہ رپورٹ ملی تھی اُس کی مطابق

پھر کی رہائی میں بنیادی کردار حنیف خاں کی طرف سے بڑے اہم تھا نذر محمد کو دئے جانے والے  
لاکھ روپوں کی رشوت نے ادا کیا تھا۔

یہ تھا نذر محمد کوئی ایسا نیک نام نہیں تھا جس سے متعلق سرداروں کو کوئی غلط فہمی ہوتی یہ  
تو وہ بخوبی جانتے تھے کہ دو تین ڈاکے مار کر پانچ دس لاکھ اکٹھے کر لینا حنیف خاں کیلئے

بہت مشکل کام نہیں ہے۔ عین ممکن ہے یہ کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پایا ہو۔

اس بات کا تو انہیں گمان بھی نہ گذر سکا کہ اُن تک جو انتہائی خفیہ رپورٹ پہنچی ہے  
ہاں محرم بھی عمر دین ہے۔

یہ عمر دین ہی تھا جس نے سرداروں کو مطمئن کرنے کے لئے اس تھانے میں اُن کے اعتماد  
لے ایک سب اسپیکر کی مٹھی گرم کر کے اُس کی زبانی سرداروں تک یہ ”اہم رپورٹ“

ٹی تھی۔

اب سرداروں کا سارا زور اس بات پر لگا تھا کہ نذر محمد سے حنیف خاں کب رابطہ کرتا  
؟

بس ایک صورت تھی اُن کے نزدیک سردار مرید کے قتل کا بدلہ لینے کی۔ انہوں نے

راست میں بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور نزدیک دُور کے دیہاتوں کے کئی بد معاشوں سے  
اُڑکے انہیں اپنی مدد پر آمادہ کیا تھا۔

سرداروں کی طرف سے حنیف خاں کے سر کی قیمت دو لاکھ روپے مقرر کی جا چکی تھی۔

لانے ہر بد معاش کو یہ پیشکش کر دی تھی کہ زندہ یا مردہ — کسی بھی صورت میں حنیف خاں

ہاں تک پہنچانے والے کو وہ دو لاکھ روپے ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔ سرداروں کو

تھی کہ حنیف خاں کا ان میں سے کسی ایک سے تو کوئی تعلق یا رابطہ ہوگا۔

فی الوقت فضل شاہ سب سے بڑا قرض بن کر اُس کے کندھوں پر سوار تھا۔ اُسے اس سے لے کچھ نہیں سوچتا تھا۔

نذر محمد نے گاؤں میں یہی تاثر بنا رکھا تھا کہ اُس کا بھانجا حینت خاں اپنے ماں باپ دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے جگہ جگہ فضل شاہ اور سرداروں کے خلاف نفرت ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ڈنکے کی پوٹ اپنے گاؤں میں رہے گا۔ کسی مائی کے لال کی جرات نہیں کہ اُس کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اُس کے کہنے پر عرمدین نے اس درمیان میں کو بھی دو تین مرتبہ مختلف اوقات میں اُس کے پاس بھیجا تھا تا کہ سرداروں کو یہ غلط رہے کہ فضل شاہ اُس کی طرف سے ڈھیلا نہیں پڑا اور کسی اور کو اس ضمن میں کچھ اور سچنے بھی متوقع نہ دیا جائے

اس درمیان وہ کئی مرتبہ احمد دین نبردار کے ساتھ شہر گیا تھا۔

لیکن —

کسی نے کبھی انہیں اکٹھے جاتے یا واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔!

دہ الگ الگ جاتے اور الگ الگ لوٹ آتے۔

اس درمیان نذر محمد کی کوشش تو یہی ہوتی کہ گاؤں میں کسی کو اس بات کا پتہ نہ چل سکے کہ گاؤں سے باہر کسی کام سے گیا ہے۔

لیکن —

کبھی ایسا ہو بھی جاتا اور کوئی ذات برادری کا۔ اُسے ملنے کے لئے اگر گھر آ بھی جاتا تو اس کے گھر والی عموماً نزدیک کسی گاؤں میں کسی کام کے لئے جانے کا بہانہ کر دیتی۔ یا پھر میں ڈاکٹر سے دوائی لینے کا بہانہ تو اُس کے پاس ہمیشہ سے موجود رہا تھا۔ نذر محمد نے در خاص یہ احتیاط برتی تھی کہ اپنی بیٹیوں کو بھی اس بات کی ہوا نہیں لگنے دی تھی کہ وہ گھر رہے؟

یہ بات تو وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ننھو خاں کے بیٹے کا زندگی گزارنے کا پتہ ہے۔ وہ چور کا بیٹا تھا۔

ایسے چور کا بیٹا جس نے ساری زندگی سرحد کے پار چوری کی تھی اور کبھی بھارتی بکو فورسز کے قابو نہیں آیا تھا۔

ننھو خاں کے سر کی قیمت بھارتی علاقے میں مقرر تھی۔

اُس نے اپنے بیٹے کو اس دھندے پر لگاتے وقت ایک ہی نصیحت کی تھی کہ چور ساتھ نہیں ہوتا اُس نے متعدد مرتبہ حینت خاں سے کہا تھا۔

”بیٹا — ہمیشہ چوری اکیلے کرنا — اکیلے آدمی کے بچ نکلنے کے چانسز صد فی صد ہوتے ہیں لیکن ساتھ کسی کیساتھ کبھی بھی پچاس فیصد سے زیادہ نہیں رہتے۔“

اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے دھندے کا ایک ہی اصول بتایا تھا کہ کامیاب رہنے کے لئے اُسے سب سے بہتر اصول یہی ہے کہ وہ کبھی کسی پر اعتبار نہ کرے — اور زندگی میں جو قدم اٹھائے اپنے زور بازو پر اٹھائے —

حینت خاں اب تک پولیس فضل شاہ اور سرداروں کے چنگل سے اس لئے بچا ہوا:

نہ اپنے باپ کی اس نصیحت کو حرجان بنا لیا تھا —

وہ تو اس وقت کو پھیتا رہا تھا جب اُس نے اپنے باپ کی دوسری اہم نصیحت کو نظر

رکنے نہراں بانی جیسی حرافتہ کے پاس اپنا جسم اور دل گروی رکھ دیا تھا —

کبھی کبھی جب وہ نہراں کا تصور کرتا تو اس کا خون کھول اُٹھتا — اس کا جا

ران ماں بیٹی کو ایسا سبق سکھائے کہ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بن جا

لیکن —

اُسے ابھی وقت اور موقع کا انتظار تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے مجازیر

ہتا تھا۔

اُسے ایک ایک کر کے زندگی کے سارے قرض چکانے تھے۔

لیکن —

جب کبھی اُس نے بیوی سے اُس کی پراسرار سرگرمیوں کے متعلق کچھ جاننا چاہا تو نذر محمد نے اُس سے بھی کہا کہ وہ فی الحال خاموشی سے اچھے وقت کا انتظار کرے۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے صیغہ خاں کی مدد اور مشورے سے اُن سب کی پہری کے لئے کر رہا ہے۔

اس درمیان اُس نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے گھر میں موجود تمام کپڑے لیتے گئے اور چھوٹی چھوٹی قیمتی چیزیں بھی شہر میں دلی محمد کے گھر منتقل کر دی تھیں۔ اُس نے عمر دین کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

ہر دوسرے تیسرے دن وہ عمر دین کے ڈیرے پر کسی نہ کسی بہانے پہنچ جاتا۔ اُس کی کوشش تھی کہ بجائے اُس کے کہ عمر دین اُس کے گاؤں آکر اُس کی خیریت دریافت کرے وہ خود بھی اُس کی تسلی کروا آتا۔

صیغہ خاں نے اُسے مشورہ دیا کہ سرکاری کام میں کبھی اپنا ہاتھ نہ کھینچے اور جہاں دس روپے سے کام بنتا ہو وہاں بیس دے کر منولے۔ اُس نے نذر محمد سے کہہ تھا کہ انہیں یہ سارا کام ہنگامی بنیادوں پر کرنا ہے۔ اگر کسی بھی مرحلے پر دشمنوں کو خبر ہو گئی تو اُس کے لئے لاپتہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

دس ہندہ روز تک یہی دھندہ چلتا رہا۔

احمد دین نذر محمد کو سرکار دربار کی ساری ہیرا پھریاں سمجھتا تھا۔ اُس نے بھی یہ ساری جائیداد اپنے ہونے ہی خریدی تھی اور اسے اپنے نام منتقل کر دینے کے لیے ہر جائیداد راجا جازہ خروہ آزا مکہ بالا خربیس روز کی جان توڑ محنت کے بعد یہ معرکہ کر لیا تھا۔

نذر محمد نے اُس سے شہر ہی میں رقم وصول کی تھی اور شہر ہی کے ایک بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھول کر رقم وہاں جمع بھی کر دادی تھی۔

یہ کوئی چھوٹا سا شہر تو تھا نہیں کہ یہاں ہر کسی کو اُس کی آمد کی خبر ہو۔

اُسی روز احمد دین نذر محمد کی مدد ہی سے اُس نے ایک پراپرٹی ڈیلر کی مدد سے ایک گھنٹانہ علاقے میں مکان کرائے پر حاصل کر لیا۔

پہلے روز دلی محمد کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو اپنے ساتھ شہر لے گئی۔ گاؤں والوں کو یہی علم تھا کہ دلی محمد کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے اور اُس کی بیوی نذر محمد کی بیٹیوں کو کام کاج کے لئے ہی لے گئی ہے۔

دوسرے روز نذر محمد کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو دربار سلام کروانے کے لئے شہر لے آئی۔ اُس کی روانگی کے قریباً ایک گھنٹے بعد ہی نذر محمد بھی گاؤں سے باہر آ گیا۔ اُس رات نذر محمد احمد دین کے بیٹوں نے تنخواہ خاں کی زمین پر پہل چلا دیئے اور راتوں رات نذر محمد اور تنخواہ خاں کی حویلی میں منتقل ہو گئے۔

صبح گاؤں والوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ نذر محمد نے ساری جائیداد اُن کے پاس فروخت کر دی ہے۔

یہ خبر گاؤں سے نکلی اور اردگرد کے دیہاتوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔! عمر دین کو جب اُس کے ایک کارندے نے آکر بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا ہاتھ ہو گیا ہے؟ تو اُسے کہنے والے کی بات پر یقین نہ آیا۔

وہ فوراً اپنی گھوڑی پر سوار شمشیر نگر نذر محمد کی خیریت دریافت کرنے کے بہانے پہنچ گیا۔ جہاں پہنچ کر اُس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

غصے اور بے بسی سے اُس کا خون کھول اُٹھا۔

اُس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔

نذر محمد نے کتنی معصومیت سے اسے اُلو بنالیا تھا اُس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر کر لکھ دیا تھا اب وہ کم از کم ساری زندگی فضل شاہ کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا کیونکہ اُس نے فضل شاہ کو نذر محمد کی طرف سے مکمل بے بنیاد کر دیا تھا۔

عین ممکن تھا کہ فضل شاہ اگر یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تو اُسے یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔

نذر محمد احمد دین کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اِس کی وجہ شمشیر نگر میں ایک ہی برادری کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ جنہوں نے اب احمد دین نذر محمد کو تنخواہ خاں کا متبادل جان کر قبول کر لیا تھا۔

## درندے

نزیرے نے ساری زندگی حرام کمایا اور حرام ہی کھایا تھا۔! جانے اس کی کون سی چال سیدھی پڑ گئی تھی کہ حنیف خاں نے اسے اپنے لیے ناگزیر جانا شروع کر دیا تھا اور نذیرا اسی صورتحال کا مکمل فائدہ اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سونے کی ایسی چڑیا پھر کبھی اس کے قابو نہیں آئے گی اور اس کی مدد سے راتوں رات وہ سیٹھ بن جانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ جس کا میانی اور صفائی سے حنیف خاں نے پہلی واردات کی تھی اس کے بعد سے تو اُسے کچھ زیادہ ہی یقین ہو چلا تھا کہ تقدیر نے اس کے ہاتھ میں ترپ کا پتہ دے دیا ہے۔

اس نے حنیف خاں کی غیر موجودگی میں صغرا کا اعتماد بہ طور حاصل کر لیا تھا۔ اُس نے یوں نوکروں کی طرح جی جان سے دن رات اُس کی خدمت کی تھی کہ بے چاری صغرا اُسے دُنیا میں اپنے خاوند کا سب سے بڑا ہمدرد خیال کرنے لگی تھی۔

حنیف خاں کی آمد کے پندرہ بیس روز بعد ہی اُس نے دوسری واردات بھی کر دی

دی —

اس مرتبہ نذیرے نے شہر کی ایک مضافاتی آبادی میں ایک ستار کی دکان پر نقتب لگوائی تھی۔ وہاں سے انہیں توفیق کے مطابق سونا اور روپیہ مل گیا تھا۔ یہاں ہی حنیف خاں نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور ایک مرحلہ پر جب علاقے کا چوکیدار اُن کے آڑے آنے لگا تو اُسے باندھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا جس کے بعد وہ بڑی آسانی سے یہاں سے بھی نکل آئے تھے۔

حنیف خاں نے اس مرتبہ اس کی توفقات کے برعکس اُسے آدھا مال سوئپ دیا تھا اور اُس نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی حنیف خاں کو لاطلم رکھ کر نزدیکی شہر میں اپنا جو بیک اکاؤنٹ کھولا ہوا تھا۔ اُس میں ساری رقم جمع کر دادی۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں بدل رہے تھے —

صغرا کی شادی کو ۸ ماہ مہینہ ہونے کو آیا تھا اور وہ اب کسی بھی لمحے ماں بننے

والی تھی —

حنیف خاں جانتا تھا کہ صغرا کے بچے کی اہمیت کیا ہے؟ یہ اس کی نسل کو قائم رکھنے کی ایک آخری کوشش ہوگی اگر اُسے خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو وہ جیتے جی مرجاتا۔ یہ بچہ اس کی نسل کا تسلسل برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ صغرا کو اس حالت میں زیادہ سے زیادہ سکون ملنا چاہیے۔

اس کے ذہن پر اب یہ خوف سوار رہنے لگا تھا کہ اُس کا خاوند ایک مفرد قاتل ہے جس کو کسی بھی لمحے پولیس گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔

اُس درمیان دو تین مرتبہ اُس نے دوسرے شہر میں اپنے ماموں نذر محمد سے بھی رابطہ کیا تھا جس نے فضل شاہ اور سرداروں کے خوف سے اب تک چار مکان تبدیل کر لیے تھے۔!

ایک روز بالآخر اُس نے فیصلہ کن انداز میں صغرا کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

”کہاں؟“

اُس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”تمہارے والدین کے گھر“

حنیف خاں بولا۔

”لیکن — یہ کیسے ممکن ہے وہ تو خود۔۔۔“

”دیکھو صغرا اس وقت ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ یہاں کوئی

تھاری تیمارداری نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ تصور بھی بڑا جان لیوا ہے کہ خدا نخواستہ تمہیں کچھ



ہو نہ جاتے۔“

اُس نے صفراں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ چاچے کے پیچھے فضل شاہ ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ حنیف خاں کہیں میرا اُن کے پاس جانا اُن پر کوئی عذاب نہ لے آئے۔ وہاں میری چار بہنیں بیابنے والی بیٹی ہیں۔“

صفراں نے اُسے تلخ حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے بہتر سوچنے سمجھنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے صفراں۔ یوں بھی میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا ایسے گھر میں جنم لے جہاں دو مجرم پہلے ہی سے موجود ہوں۔ کم از کم میں اپنا منحوس سایہ اُس پر نہیں پڑنے دوں گا خواہ مجھے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔“

اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“

شاید صفراں کو بھی بات سمجھ آگئی تھی۔

حنیف خاں نے نذیر سے کہ ہزار مرتبہ پوچھنے پر بھی اُسے دل کی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حنیف خاں کا ماموں رہنما کہاں ہے۔ بس اتنی خبر تھی کہ اس کے خاندان نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ یوں بھی نذیر سے کہ لیے ان باتوں کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ انہوں نے اب قدر سے بڑا مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ جس کے ایک کمرے میں جس کا دروازہ باہر لگی میں کھلتا تھا نذیر سے کا ڈیرہ لگا ہوا تھا۔

حنیف خاں چونکہ اُس کی مکاروں سے آگاہ تھا اس لیے اس نے کبھی اپنی موجودگی میں اُسے صفراں سے زیادہ قریب ہونے کی مصلحت نہیں دی تھی۔ صفراں اُس کے لیے اہلستہ تینوں وقت کا کھانا باقاعدگی سے پہنچا دیتی تھی کبھی کبھی سرراہے کوئی بات دونوں کے درمیان ہو جاتی۔

حنیف خاں کی شدید خواہش تھی کہ نذیرا الگ سے گھر لے کر رہے۔

لیکن

اس پر بھی وہ خدا کا شکر ادا کرتا کہ ابھی نذیر سے جیسے کہیں شخص کی آنکھوں میں اتنی حیا تو موجود ہے۔

نذر محمد کے گھر اس کی بیٹی کی آمد نے سب کے جذبات میں پہل چا دی تھی۔ لمبے عرصے بعد وہ اپنی بیٹی سے مل رہا تھا۔ اُس کی بیوی تو بیٹی کی بلائیں لیتی نہیں تھکتی تھی جس نے اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں خود کو تاج دیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ایک مفرد کے ساتھ زندگی بسر کرنا صفراں کے لیے کتنا اذیت ناک ہو گا؟

لیکن

جتنے احسانات اُن پر نتھو خاں کے خاندان کے تھے اس کے بعد یہ کوئی بڑی قیمت

نہیں تھی جو انہیں ادا کرنی پڑی۔

صفراں کو حنیف خاں کے کہنے پر انہوں نے شہر کی ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کو دکھانا شروع کیا تھا۔ پندرہ سولہ روز بعد اُس نے حنیف خاں کی غیر موجودگی میں بچے کو جنم دیا تو بے ساختہ نذر محمد کی آنکھیں بھرا آئیں۔

اب اُسے کم از کم یہ اُمید تو پیدا ہو چلی تھی کہ نتھو خاں کا نام تو دُنیا پر ابھی زندہ رہ جائے گا۔

یہ اولاد کی نرطپ تھی یا خون کی کشش جو اگلے ہی روز حنیف خاں کو کھینچ کر یہاں لے آئی۔!

اُس نے جب یہ سنا کہ اللہ نے اس کے گھر بیٹا پیدا کیا ہے تو اُسے اپنا وجود ہلکا ہو کر ہوا میں تیرتا محسوس ہونے لگا۔

عابد خان اُس نے بچے کا نام رکھا تھا اور دل ہی دل میں خود سے عہد کیا تھا کہ اپنی جہانمہ زندگی کا سایہ بھی کبھی اس پر نہیں پڑنے دے گا۔

”ماما نذر محمد میں نے اپنی زندگی کے سارے اثاثے تیرے نام کر دیئے ہیں۔ تو نے

آج تک متعدد مرتبہ مجھے پیسے لوٹانے کی کوشش کی ہے۔ بس یہ سمجھ لینا کہ میری جائداد سے حاصل ہونے والی ساری دولت میرے بیٹے اور میری بیوی کی ہے۔ اگر تم مجھ پر کوئی احسان کر سکتے ہو تو وہ یہی ہے کہ میرے بچے کی پرورش ایسے کرنا جیسے ننھو خاں کے پوتے کی ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک اور شہر میں تمہارے لیے مکان دیکھ لیا ہے۔ وہ مکان خرید لو۔ مکان کے نیچے موجود مارکیٹ سے تھیں ماہانہ اتنی آمدن ہوتی رہے گی جن میں تمہارا خرچ آسانی سے چلتا رہے۔ پھوپھا ولی محمد کو میں نے راضی کر لیا ہے وہ تمہاری دونوں بیٹیاں اپنے دونوں بیٹوں سے بیاہ دے گا۔ میں باقی دونوں کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ انہیں بھی ایسے ہی رخصت کروں گا جیسے میرا باپ اگر زندہ ہوتا تو رخصت کرتا۔ اما۔ میری زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ مجھے ایک پل قرار نہیں آتا۔ اب تک مجھے ایک ہی خوف ڈستا رہتا تھا کہ میں مر گیا تو میرے باپ کا نام لینے والا کون اس دُنیا میں رہ جائے گا۔ اب میں اس نکرے سے آزاد ہو گیا ہوں۔ میں فضل شاہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اُس نے میرے باپ دادا کی نگری مجھ سے چھڑا دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شمشیر نگر کی تاریخ میں کبھی میرا نام بُرزدوں میں لکھا جائے۔ اما! میں تمہارے سر پر ایک بڑا بوجھ ڈال رہا ہوں صغراں اور عابد کو اب تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔ جب تک کہ میری قسمت کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔

اُس نے نذر محمد کو اعتماد میں لے کر کہا۔

نذر محمد کے جذبات بہت عجیب ہو رہے تھے۔

وہ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ اب وہی اس خاندان کا بڑا بزرگ ہے۔

لیکن

حنیف خان نے باپ کی موت کے بعد سے جس طرح انہیں سنبھالا تھا اس کے بعد

سے اُسے اپنا نذ حنیف کے سامنے چھوٹا دکھاتی دینے لگا تھا۔

دیر تک وہ فضائل میں گھورتا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ حنیف خاں وہی کرے گا جو اُس نے کہا ہے۔ پھر بھی اس کا دل چاہتا

تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ اس نے چاہا کہ حنیف خان کو سمجھائے کہ اب دُنیا اور حالات وہ نہیں رہے ہیں حنیف خان نے اس کی بات نہ مانی۔

ایک مرتبہ پھر نذر محمد کے کندھوں پر بڑا بوجھ آن پڑا تھا۔

اس کو بادل نخواستہ ہی سے ذمہ داری نبھانی تھی۔

وہ تو اس کا اپنا خون تھا۔ اگر کسی غیر نے بھی اُس کے ساتھ یہ احسان کیا ہوتا تو وہ مزدور اس کے کام آتا۔ حنیف خاں نے تو اس کے دل و دماغ سے ایک ایک کر کے سارے بوجھ ہی اتار دیتے تھے۔

اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھنے کے بعد وہ صغراں سے مل کر واپس لوٹ آیا۔

واپس لوٹتے ہوئے گو کہ وہ بڑا سوگوار تھا۔

لیکن

خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُس کے دل و دماغ پر پڑا منوں بوجھ

اُتر گیا ہو۔

نذیرے کو جب اُس نے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی تو اس نے یوں بے اختیار

اُسے مبارکباد دی تھی جیسے واقعی اُسے بہت خوشی ہوتی ہو۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا حنیف خان جو اُسے گھر چھوڑ آئے۔ حالات کسی دقت بھی

کوئی غلط رخ اختیار کر سکتے تھے۔“

اُس نے حنیف خاں کے فیصلے کو سراہتے ہوئے کہا۔

”ہاں نذیرے یار میں نے سوچا آخر میرے گناہوں کی سزا میری بیوی اور بچے

کو کیوں ملے؟“

حنیف خاں نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس مرتبہ بڑا شاندار شکار تارنا ہے حنیف خاں۔ دیکھو گے تو عیش عیش کر

اُٹھو گے۔“

نذیرے نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔  
”کون سا؟“

حنیف خاں نے پوچھا اور وہ اُسے تفصیلات بتانے لگا۔ اس مرتبہ اس نے حنیف خاں کے لیے شرکی ماڈرن آبادی کا ایک مکان تلاش کیا تھا۔

اس مکان کا مالک ایک بڑا سرکاری افسر تھا جس نے اپنے ہاں حرام کی دولت کے انبار جمع کر رکھے تھے۔

”جس گھر میں ہم جائیں گے یہ اس کی دوسری بیوی ہے جس کا کسی کو شاید اس نے ابھی تک علم نہیں ہونے دیا۔ دن میں وہ اکیلی یا پھر گھر پر کام کرنے والی آیا ہی ہوتے ہیں۔ ہم دوپہر کے بعد سلام کرنے چلے جائیں گے“

نذیرے نے اُسے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

”ابھی دو تین روز ٹھہر جاؤ۔ اتنی جلدی کیا ہے“

حنیف خاں نے بظاہر بے دلی سے کہا۔

”بارکل کس نے دیکھی ہے۔ وہ پرسوں دورے پر دوسرے شہر جا رہا ہے۔ میں نے

بڑی مشکل سے ساری معلومات جمع کی ہیں“

نذیرے نے اُسے بتایا۔

”یا نذیرے بات کو سمجھا کر۔ ابھی میں اپنے بچے کو اکیلا چھوڑ کر آیا ہوں۔ میرا

ذہن . . .“

”اچھا تو یوں کہو تاں کہ شادی کر کے تم بزدل ہو گئے ہو“

نذیرے نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اُس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

”نذیرے . . .“

غضب سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آگئی تھیں۔ ایک مرتبہ تو نذیرا بھی دہل کر رہ گیا۔

”خبردار۔ آج کے بعد مجھے یہ طعنہ نہ دینا۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں“

”یار۔ تم تو خواہ مخواہ بڑا منگ گئے“

نذیرے کی جان میں جان آتی تو اُس نے بے شرموں کی طرح دانت نکالتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔

”زبان کو لگام دے کر رکھا کر۔ تم جانتے ہو میں اس لمحے میں بات سننا پسند نہیں کرتا“

اُس کا غصہ ابھی تک نہیں اُترتا تھا۔

نذیرے نے منت سماجت کر کے اُسے نارمل کر لیا۔

لیکن

اسی روز نذیرے کو احساس ہو گیا کہ ابھی تک حنیف خاں نے اُسے اپنا محتاج سمجھنا شروع نہیں کیا۔

پانچویں روز وہ نئی واردات پر جا رہے تھے۔

اس مرتبہ بھی سارا پلان حنیف خاں نے ہی تیار کیا تھا۔ اُس نے ماہر فوجیوں کی طرح

پہلے دن میں گھوم کر اس علاقے کی طرف آنے جانے والے تمام راستوں کا جائزہ لیا اور

اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے کر گھرا گیا تھا۔!

دوپہر کے بعد وہ لوگ کوٹھی کے دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجا رہے تھے۔ دروازہ

گھر کے بیرون کھولا جس کے کپڑوں نے اس کی شناخت کر دادی تھی۔ حنیف خاں نے اپنا

تعارف ٹیلی فون کے لائن میں کی حیثیت سے کر دایا اور بتایا کہ وہ لوگ چونکہ مین بکس میں

تبدیلی کر رہے ہیں اس لیے ٹیلی فون کی تار ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔

بیرے نے لا پرواہی سے کندھے اُچکاتے ہوئے پہلے دروازہ کھولا پھر بند

کر کے کندھی لگا دی۔

دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر وہ برآمدے تک آ گیا۔

برآمدے کے نزدیک پہنچ کر حنیف خاں نے اچانک ہی ایک ہاتھ مضبوطی سے اُس

کے منہ پر رکھا اور دوسرے سے اُسے قابو کر لیا۔

اس درمیان اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نذیرے نے کپکپاتے ہاتھوں

سے اپنے تھیلے میں پہلے سے موجود ٹیپ رول نکالا اور اُس کے مُتہ پر باندھنا شروع کر دیا۔ اب اس کے منہ سے آواز نکلنے کے چانسز بالکل ختم ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی اتنا خوف زدہ اور گھبرا یا ہوا دکھاتی دے رہا تھا کہ نذیر سے کوہر آن اس کے بے ہوش ہونے کا دھڑکا لگا رہا —

دوسرے تھیلے سے حنیف خاں نے ایک چھوٹی سی رستی نکال کر اُس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اُسے برآمدے سے ملحقہ کمرے میں پھینک کر باہر سے دروازے کو کُڑھی لگا دی۔

اب وہ دبے قدموں سے سامنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جو شاید اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں نے اسی اثنا میں اپنے چہروں کو پہلے سے موجود ماسک کے ذریعے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ وہ کسی انگریزی فلم کے ڈاکو نظر آرہے تھے۔ اس کمرے میں درمیانی عمر کی ایک خوبصورت خاتون ٹی دی پر کسی فحش فلم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب اچانک ہی یہ فیماقت اُس کے سر پر ٹوٹ پڑی۔

اپنی طرف حنیف خاں کو پستول تانے دیکھ کر اُس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی، لیکن اُس کی آواز ٹی دی سے برآمد ہونے والی چیخوں سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔

”دیکھو خاتون ہماری تمھارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تعاون کر دو گی تو تمھاری جان اور عزت بچ جاتے گی ورنہ مال تو جائے گا ہی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی“

حنیف خاں نے اس کی طرف پستول لہراتے ہوئے مقامی زبان میں کہا۔

اُس نے نذیر سے کوہر آن کی سے پہلے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنی زبانیں کھولے گا۔ اس طرح ممکن ہے اُن کے لب دلچے سے اُن کے علاقے کی نشاندہی ہو جائے۔ البتہ حنیف خاں کو مقامی زبان میں اچھی طرح بات کرنا آتی تھی۔

”تو تم کیا چاہتے ہو؟“

خاتون نے خوف زدہ لہجے میں ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”تجوری کی چابی اور تمھاری خاموشی“

حنیف خاں نے مختصر بات کی۔

خاتون نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی اس کی دکان نہیں آتے گا تو اس نے دوسرے کمرے میں موجود اپنے پرس سے چابی نکال کر اس کی ہت بڑھادی۔

حنیف خاں نے چابی پکڑنے کے بجائے اس کو تجوری کھولنے کا حکم دیا۔ اس درمیان اُن نے پستول خاتون کی طرف اسی طرح سیدھا کیے رکھا۔

صاف دکھاتی دے رہا تھا کہ اگر اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ مائی اقدام سے دریغ نہیں کرے گا۔

خاتون نے لرزتے ہاتھوں سے تجوری کا دروازہ کھول دیا۔

حنیف خاں نے اُسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور نذیر سے جس کی آنکھیں تجوری میں موجود اے جواہرات کے زیورات اور کرنسی نوٹوں کو دیکھ کر بیٹھی جا رہی تھیں لرزتے ہاتھوں ، اپنا تھیلہ بھرتا شروع کر دیا۔

چند منٹ کے بعد ہی اُن کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔

حنیف خاں نے بڑی چھرتی سے ٹیلی فون کا کرڈیل کھینچ کر توڑ دیا اور خاتون کو گھر کے درمیں بند کر کے اُسے باہر سے کُڑھی لگا کر بند کر دیا۔

انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گھر میں کسی کی آمد تک ان دونوں کے یہاں سے نکلنے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ اس گھر کے ہسائے میں آباد مکینوں کے پاس اپنے ہمایوں چیخ و پکار پر کان دھرنے کے لیے بھی دقت نہیں تھا۔

گھر سے باہر وہ اس طرح نکلے جیسے اسی گھر کے مکین ہوں۔

انہوں نے یہاں سے تین چار گلیوں تک پیدل سفر طے کیا تھا۔ جس کے بعد مختلف ریاں بدلتے ہوئے وہ شام کو دیر گئے اپنے گھر پہنچے تھے۔

اس مرتبہ ان کے ہاتھ گلے والے زیورات اور نقدی لاکھوں کی مالیت کے تھے۔

بڑا کامیاب ڈاکو تھا۔

حنیف خاں نے نہ چاہتے کے باوجود نذیرے کو کئی مرتبہ دل ہی دل میں داد دے چکا تھا اور اُس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب کم از کم دو تین مہینے وہ خاموشی سے گزار سکتے ہیں۔ ”یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا حنیف خاں — ابھی فکر کی کیا ضرورت ہے!“ نذیرے نے مُرے کی طرح گمرون بھلاتے ہوئے کہا۔

فضل شاہ کی حالت زخم خورہ سانپ سے زیادہ خطرناک تھی۔

حنیف خاں نے اُسے مکاری اور منافقت کے میدان میں بھی شرمات دے دی تھی۔ حالانکہ وہ خود کو اس میدان کا پُرانا کھلاڑی سمجھتا تھا اور آج تک کم از کم اس میدان میں اُس نے مار نہیں کھاتی تھی۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ عمر دین کو زمین میں گاڑ کر اس پر کتے چھوڑ دے۔

لیکن —

یہ اس کی سیاسی مصیبتیں اور مجبوریاں تھیں جنہوں نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے اُسے اس علاقے کے بہمانوں اور رستہ گزروں کی زیادہ سے زیادہ دوستی درکار تھی اور عمر دین کا شمار علاقے کے بگنے بچنے رستہ گزروں میں ہوتا تھا۔

فضل شاہ کو وہ رہ کر ایک ہی بچھتا دے نے آیا تھا کہ اُس نے حنیف خاں کی جائداد بچی سرکار ضبط کیوں نہ کر وادی۔ اپنی دانست میں اس نے یہ قدم اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ حنیف خاں کے ساتھ ملے کا دروازہ کھلا رکھے۔

یہ بات تو وہ بھی جانتا تھا کہ ریاست شاہ کا قائل حنیف خاں نہیں، وہ خود ہے اور حنیف خاں نے بظاہر اس کا کچھ نہیں بگاڑا جبکہ فضل شاہ نے اس کے باپ اور مال دونوں کو قتل کر دیا ہے۔

لیکن —

اُس کے نزدیک دوستی یا دشمنی کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ اپنی فطرت میں شیطان تھا جو بدی کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا تھا۔ اب حنیف خاں

نے اس کے ساتھ جو ہاتھ کیا تھا اور جس طرح اُسے دھوکے میں رکھ کر اس سے اونٹے پونے راموں پر اپنی جائداد فروخت کر دی تھی۔ اس کے بعد سے تو اس کے لیے حنیف خاں کو زندہ چھوڑنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہا تھا،

لیکن —

حنیف خاں سے بھی پہلے وہ ایک اور حساب چکانا چاہتا تھا۔

اور —

یہ تھا نذر محمد —

نذر محمد ہی دراصل اس کہانی کا مرکزی کردار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حنیف خاں میں اتنی عقل فہم نہیں کہ وہ ایسی کوئی چال چلتا۔ وہ نختہ خاں کا بیٹا اور دو جمع دوچار کرنے والا سیدھا مادا بدمعاش تھا۔ جو کبھی نہ کبھی اُس کے حال میں ضرور پھینس جاتا۔

اب اس کے انتقام کی آگ تب ہی ٹھنڈی ہوتی جب وہ نذر محمد کو کوئی گسری چوٹ لگاتا۔ فضل شاہ کے شیطانی اور اذیت پسند داغ نے اس کو یہی راہ سمجھائی تھی کہ وہ نذر محمد کو قتل کرنے کے بجائے اس کو ایسا روگ لگا دے جس کے بعد سازی زندگی وہ زندہ درگور ہو کر رہ جائے۔ اس کے نزدیک نذر محمد کے قتل سے اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا۔

”عمر دین مجھے باتوں اور دھاتوں کے بجائے عملی انسان پسند ہیں — تم نے زیادہ ہوشیاری دکھا کر میرے حال میں پھینسی پھلی کو نکال دیا ہے۔ اس کے ازالے کی ایک ہی صورت ہے عمر دین مجھے نذر محمد جیسے بوڑھے اور بے ضرر شخص سے کچھ نہیں لینا — وہ اپنی طبی عمر جی چکا — کتنے دن اور جی لے گا۔ دو سال، پانچ سال بس، اس سے زیادہ وہ کیا بچے گا۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اب وہ جتنے عرصے بھی زندہ رہے اُسے یہ احساس ہوتا رہے کہ اُس نے فضل شاہ کو دھوکہ دے کر ناقابل تلافی گناہ کیا ہے۔ اب وہ جب تک جیے اپنی زندگی پر لعنت بھیجتا رہے — عمر دین اس کی لڑکی اٹھلاؤ۔ میں شیشہ بگر کے باہوں کے سامنے اُس کی لڑکی کو تنکا پختوں گا۔ بس اس سے کم کسی صورت میں تم مجھے مطمئن نہیں کر سکتے — ہماری ہتھاری دوستی کے برقرار رہنے کی بس یہی ایک شرط ہے —

اور ہاں اس مرتبہ نام نہ ہو تو مجھے اپنا منہ دکھانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے منہ کالا کر جاؤ۔  
سمجھ گئے ناں میری بات۔“

اُس نے اپنے سامنے سر جھکاتے عمر دین سے دو ٹوک لہجے میں کہہ دیا۔

”شاہ جی — پہلے بات تھی کچھ اور — ٹھیک ہے میری چال سیدھی نہیں پڑی  
اور وہ بوڑھا ہمیں چکر دے گیا۔ لیکن، اب وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ میں اُسے زمین کی  
ساتوں تہ سے نکال لاؤں گا۔ میرے بندے شہر میں اس کے رشتہ دار ولی محمد کے گھر کی  
نگرانی کر رہے ہیں۔ اُن کے ذریعے ہم لوگ نذر محمد کے گھر تک پہنچ سکتے ہیں۔ جس روز  
اُس کا گھر دیکھ لیا۔ سمجھ لیجئے آپ کی خواہش پوری ہوگئی —“

عمر دین نے بڑی سفاکی سے دانت نکلے۔

”عمر دین میں تم سے پھر یہی بات کہوں گا کہ فضل شاہ کو باتوں سے نہیں عمل سے ہی خوش

کیا جا سکتا ہے۔ میری بات سمجھ گئے ناں“ —

فضل شاہ کی سنجیدگی برقرار رہی۔

”بالکل سمجھ گیا شاہ جی — بالکل سمجھ گیا“

عمر دین نے ہر نقوں کی طرح گردن ہلاتی۔

اُس نے بظاہر تو اس کام کو بہت آسان سمجھا تھا۔

شہر کے بڑے بڑے بد معاشوں سے اُس کے ذاتی تعلقات تھے وہ جب بھی انہیں اشارہ

کرتا۔ نذر محمد کی کسی بھی بیٹی کو اٹھا کر اُس کے ڈیرے پر پہنچا دیتے۔

لیکن —

گزشتہ چار پانچ ماہ سے دلی محمد کے گھر کی مسلسل نگرانی کر دانے کے باوجود اُسے ابھی تک

نذر محمد کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ دوسری طرف فضل شاہ کی ناراضگی میں روز بروز اضافہ ہوتا

چلا جا رہا تھا۔ اس درمیان اس کے آدمیوں نے دو مرتبہ نذر محمد کے مکان تک رسائی حاصل

کی تھی۔

یہ الگ بات کہ دونوں مرتبہ انہیں یہی علم ہوا کہ نذر محمد نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔

اب عمر دین کے شیطانی دماغ نے اُس کے ٹھکانے کا پتہ لگانے کے لیے انتہائی اقدام کا

بھلہ کر لیا تھا۔ جن کے لیے اُس نے ایک بے ضمیمہ پولیس سب انسپکٹر کی خدمات بھی حاصل کر لی

تھیں، شوکت تام کا یہ سب انسپکٹر اُس کا دیرینہ ساتھی تھا اور عمر دین کی کوششوں سے ہی اُسے

ب ”لائن حاضری“ کے طویل عذاب سے نجات ملی تھی اور اس نے حال ہی میں اسی تھکانے

ن شوکت کی تعیناتی کر دائی تھی جس کی حدود میں دلی محمد کا گھر آتا تھا۔

اس روز دلی محمد اپنے کام سے واپس لوٹا ہی تھا جب دروازے پر دستک سنائی دی۔

اُس نے خود دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کو دیکھ کر اُس کے قدموں تلے سے زمین ہی نکل

ا

”دلی محمد تمہارا نام ہے اوتے“ —

انسپکٹر شوکت نے جس کے تین سپاہی بھی موجود تھے بڑی بدتمیزی سے دریافت کیا۔

”ہاں جی، — میں ہی ہوں دلی محمد۔ کیا بات ہے؟“

اس نے خوف زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ابھی تجھے بتاتے ہیں کام کیا ہے۔ بد معاشوں اور قاتلوں کی پشت پناہی کرتے

وز پوچھتے ہو کیا بات ہے۔ اوتے تم چیز کیا ہو اوتے — دو چہتر تم نہیں کھا سکتے

تمہارا دماغ ایسا درست کروں گا کہ زندگی بھر یاد کر دو گے۔“

انسپکٹر شوکت نے اس سے پولیس والوں کے انداز میں غنڈہ گردی کی۔

”دروازہ کھول اوتے۔“

ایک سپاہی نے اُسے گالی دے کر کہا۔

اور —

بے چارے دلی محمد نے دروازہ ان موذیوں کے لیے کھول دیا

انسپکٹر شوکت اور اس کے ساتھی اندر گھس آئے۔

”کہاں چھپا رکھا ہے اوتے تو نے حنیفہ کو۔“

انسپیکٹر شوکت نے اُسے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا جناب۔ میرا ان لوگوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے تو ساری زندگی گاڈن کی شکل نہیں دیکھی۔ میں تو۔۔۔“

”چُپ کر اوتے — کیا باب بک لگا دی ہے۔ جو سوال چوہدری صاحب نے کیا ہے صرف اس کا جواب دو — ماما مشردا —“

اس سپاہی نے دلی محمد کو اس طرح ڈانٹا کہ بے چارہ سہم کر رہ گیا۔

”لیکن جناب مجھے کیا علم کہ حنیفا یہاں ہے۔ میں نے تو آج تک اُس کی شکل نہیں دیکھی“

دلی محمد نے اپنی صفائی پیش کی۔

”اچھا — اوتے بشرے اسے — دکھا شکل —“

انسپیکٹر شوکت نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

اچانک ہی دلی محمد کو یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ جلتے گا۔ ایک سپاہی نے اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے کر اس طرح جھٹکا دے کر زمین پر پھینکا تھا کہ وہ سیدھا دیوار سے ٹکراتا ہوا انسپیکٹر کے قدموں میں جا گرا جس نے اس کی کمر میں اتنے زور سے ٹھوکر ماری کہ اسے اپنی پسلی ٹوٹنے کا احساس ہوا۔

بے اختیار اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں —

چیختے چلاتے دلی محمد کو بالوں سے پکڑ کر اُس سپاہی نے کھڑا کیا اور اُس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ چڑ دیا۔

دلی محمد کی چیخ دیکر پر اس کی بیوی اور بچے بیٹھک میں گھس آئے۔ اپنے خاوند اور باپ کی یہ حالت دیکھ کر انھوں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا —

پولیس والوں نے انھیں گالیاں دے کر کمرے سے نکال دیا اور دلی محمد کو ماتے پٹیتے تھانے میں لے آئے۔ قریباً نیم بے ہوش دلی محمد کو انھوں نے کورے کے ڈرم کی طرح اٹھا کر حوالات میں پھینک دیا۔

دلی محمد جب کچھ دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو بے اختیار اس کے دل سے حنیفا خاں کے لیے گالیاں اور بد دعائیں نکلنے لگیں جس کی وجہ سے زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اس نوعیت کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا —

اس نے تو اس خوف سے کہ نتھو خاں کی وجہ سے کہیں پولیس والے اس کے گھر کا دروازہ نہ دیکھ لیں ساری زندگی شمشیر نگر کا رخ نہیں کیا تھا۔

لیکن —

اس کی زندگی بھر کی محنت آج اکارت ہو چکی تھی۔

جسمانی تکلیف سے زیادہ بے عزتی کا احساس اُس کے لیے جان لیوا ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آج اچانک چار پانچ ماہ بعد پولیس نے اس کے گھر پر کیوں دھاوا بول دیا —!

پولیس نے حالانکہ اپنی دانست میں اس کو کچھ زیادہ ہاتھ نہیں دکھائے تھے، لیکن بے چارے ڈھلتی عمر کے دلی محمد کو اپنی ہڈیاں دُور سے چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ابھی اُسے ہوش آنے چند منٹ ہی گزرے تھے جب سفید کپڑوں میں ملبوس ایک اہلتی عمر کا حوالدار اس کے دروازے کی سلاخوں کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا حال ہے دلی محمد — مجھے نہیں پہچانا —“

اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں بھائی جی — آپ کون ہیں؟“

دلی محمد نے ہاتے ہاتے کرتے ہوتے پوچھا۔

”خیر — جانے دو۔ پھر تمہیں بتا دوں گا لیکن تم یہاں کیسے آگئے؟“

اُس نے دوبارہ مٹکاری سے کہا۔

”بھائی جی خدا رسول کی قسم مجھے کچھ علم نہیں کہ حنیفا کہاں ہے — میں نے تو اس دُزی کی شکل کبھی ڈھنگ سے نہیں دیکھی۔“

دلی محمد نے جان چھڑانے کے لہجے میں کہا۔

”دیکھو دلی محمد — میں تمہارا ہمدرد ہوں — یہ لوگ تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔ پولیس والے مفرد کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے رشتہ داروں کی جان عذاب میں لے آتے ہیں۔ تم خواجواہ مارے جاؤ گے۔ عقل سے کام لو۔“

اُس نے ہمدردانہ لہجے میں بڑی رازداری سے کہا۔

”لیکن میں کیا کروں —

اُس نے بے چارگی سے پوچھا۔

”ایک تجویز ہے میرے پاس — جس سے تمہاری جان چھٹ جاتے گی۔“

”کیا؟“

دلی محمد کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

”دیکھو تمہیں اس سے کیا لینا دینا۔ اُس نے کون سا جائیداد بیچ کر نہیں حصہ دیا ہے۔

جس کو اُس نے دولت دی ہے اس کا عذاب بھی وہی بھگتے۔ تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے

اس جنجال میں پھیننے کی — تم ان لوگوں کو نذر محمد کا اڈر میں دے دو۔ وہ کچھ دے دلا کر

ان کا متہ بند کر دے گا۔ تمہارے پاس کیا ہے دینے کے لیے۔ تم ان کا متہ بند نہیں کر سکتے۔“

حوالدار نے دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

بات تو وہ صبح کہ رہا تھا —

دلی محمد کے دل نے کہا۔ آخر اُسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ عذاب اپنی جان پر ڈالے۔

اُس کی بیٹیاں جوان ہیں۔ کہیں پولیس والے انہیں بھی لے آتے تو...؟

اس سے آگے اس کی سوچیں بجمد ہونے لگیں۔

اس کے گمراہ دماغ نے کہا کہ اس کو ملا بھی کیا ہے۔ ساری رقم تو واقعی نذر محمد لے گیا۔

وہی اب اس مصیبت کو بھی بھگتے۔ یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ اس کے پاس تو پولیس کا منہ بند

کرنے کے لیے رقم موجود تھی —

اس کے پاس دینے کے لیے کیا تھا؟

جو حقوڑا بہت حنیف خاں نے دیا تھا اس سے بیٹی بیاہ دی۔

لیکن —

اُسے نذر محمد کے گھر کا علم کہاں تھا؟

شاید اس لیے نذر محمد نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ اُسے علم ہو گا کہ کبھی دلی محمد پر یہ

وقت بھی آسکتا ہے۔ کبھی کتنا ہوشیار نکلا — مجھے مروانے کے لیے قربانی کا بکرا بنا دیا

اور خود ٹھٹھا کی زندگی بسر کر رہا ہے —

اُسے یاد آ گیا کہ نذر محمد نے اُسے تین چار روز بعد ملنے آنا تھا۔ یہی ایک صورت تھی

جس سے وہ اس کی نشاندہی کر سکتا تھا جس سے اس کی جان چھوٹ جاتی —

”نذر محمد نے تین چار دن بعد مجھے ملنے آنا ہے۔ میں اُسے گرفتار کروادوں گا لیکن

خدا کے لیے مجھے کچھ نہ کہو — میں بے قصور ہوں۔“

اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے — میں انسپکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

اور —

اس کے ہمدرد حوالدار نے انسپکٹر صاحب سے بات کر لی۔ معاملہ دونوں کے

درمیان یہ بٹھرا کہ جیسے ہی نذر محمد اس کے گھر آیا وہ کسی بہانے وہاں سے باہر آ کر پولیس کو

مطلع کر دے گا اور فی الوقت اُسے اپنی جان چھڑانے کے لیے پانچ ہزار روپے پولیس کو

خرچ پانی کے لیے دینے پڑیں گے۔

دلی محمد کے بیٹے نے رات کو پانچ ہزار روپے دے کر اپنے باپ کی جان چھڑائی جس

سے ڈھنگ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اپنے گھر پہنچ کر دلی محمد دو دن تک اپنے جسم کو ٹکھور دی اور جی بھر کے حنیف خاں

کی ساری نسل کو گالیاں دیں جس کی وجہ سے اُسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی

سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آج کے بعد اُس نے اپنے بچپلوں سے ملاقات کرنے کی

بھی کوشش کی تو وہ اُسے اُن کے گھر میں بیچ دے گا۔

بے چاری سم کر چپ ہو رہی۔



واقعی اس کا شوہر یہ کچھ کہنے میں حق بجانب تھا۔  
تیسرے روز جب دلی محمد چلنے کے لائق ہو گیا تو نذر محمد بھی اس کے ہاں کسی کام سے آگیا، اس درمیان اس نے سختی سے اپنے گھر والوں کو تنبیہ کر دی تھی کہ وہ نذر محمد سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں۔

نذر محمد سے سلام دعا کر کے وہ بازار سے اُس کے لیے بوتل لینے کے ہمارے باہر گیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے گھر سے مشکل ایک فلائنگ کی دُوری پر واقع تھانے میں جا پہنچا۔  
انسپکٹر شوکت کسی کام سے باہر نکل رہا تھا جب دونوں کا آنا سامنا ہوا۔  
”تم جاؤ۔۔۔ خبردار اُسے علم نہ ہونے دینا“۔

اُس نے دلی محمد سے کہا جس کا سانس بڑی طرح پھولا ہوا تھا۔  
دلی محمد نے اُس کی نصیحت پر عمل کیا اور جب وہ گھر پہنچا تو نذر محمد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ تھانے سے ہو کر آ رہا ہے۔

دلی محمد نے حفظِ ماتقدم کے لیے اُسے بتا دیا کہ اُن کے ساتھ کیا گزری ہے۔ اس نے بتایا کہ پولیس کو دس ہزار روپیہ دے کر اور جوتے کھا کر اپنی جان چھڑاتی ہے۔  
نذر محمد یہ بات سُن کر قدرے گھبرا گیا۔ اُس نے جیسے تیسے بوتل زہر مار کی اور فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرے خیال سے مجھے چلنا چاہیے۔۔۔ بھائی دلی محمد ہماری وجہ سے جو زیادتی تھانے ساتھ ہوئی اُس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا لیکن میں کوشش کروں گا کہ اب بھینس پولیس تنگ نہ کرے۔۔۔ لیکن تم بھی یہ بات سمجھتے ہو کہ ناخن سے گوشت الگ نہیں کیا جا سکتا بہر حال تمہاری ننھو خاں سے رشتہ داری ہے اور پولیس کو تو موقع چاہیے کسی کو تنگ کرنے کا۔  
اچھا خدا حافظ“۔

دلی محمد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باہر گیا۔!!

اُس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

اس وقت انسپکٹر شوکت اور اس کے تین سپاہی سفید کپڑوں میں اس کا تعاقب کر رہے تھے اُن کے پاس دو موٹر سائیکلیں تھیں جب کہ انسپکٹر شوکت خود ایک کار میں بیٹھا تھا۔ نذر محمد کو اگر معمولی سا شک بھی ہوتا تو وہ ہوشیار ہو جاتا۔  
یہاں سے اُن کے گھر کا فاصلہ پانچ میل سے کم نہیں تھا۔ اُس نے یہ فاصلہ پیدل اور بس کے ذریعے طے کیا تھا۔

لیکن —

اپنے گھر پہنچے نہ کہ اُسے علم ہی نہ ہو سکا کہ بلاؤں نے صفراں کا گھر دیکھ لیا ہے۔  
انسپکٹر شوکت قانونی طور پر تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن اس نے اپنے پُرانے یارِ عمر دین کا حق نمک ادا کیا تھا۔ اس کو یہی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ عمر دین کے لیے نذر محمد کے گھر کا پتہ لگائے۔

اور —

اُس نے بیر شیطانی کارنامہ انجام دے دیا تھا۔

عمر دین اُس وقت اپنے دیرینہ بدعاش ساتھی شیری کے ساتھ اُس کے اڈے پر موجود تھا جب اُسے انسپکٹر شوکت کی طرف سے خوش خبری سنائی گئی۔

عمر دین کے دانت بے اختیار باہر نکل آئے۔ بالآخر اُسے اپنے شیطانی منصوبے کا میاب ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے شوکت کا دل و جان سے شکریہ ادا کرتے ہوئے مستقبل میں اُس کا احسان مند رہنے کا وعدہ کیا اور شیری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اُس علاقے کی طرف چل دیا جس کی نشاندہی کی گئی تھی۔

انہوں نے نذر محمد کے مکان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور عمر دین اُسے اس کی ڈیوٹی سمجھا کر واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا تھا جہاں سے اس نے شیری کے ہاتھوں نذر محمد کی کسی بھی بیٹی کو وصول کر کے فضل شاہ تک پہنچانا تھا جس نے اس سے آگے شیطانی منصوبے پر عمل پیرا ہونا تھا۔!

”پولیس کی پرواہ نہ کرنا۔۔۔ شاہ صاحب کے ہوتے ہوتے کسی کی جرأت نہیں کہ تمہاری

طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لے۔ — شیری خاں یہ کام بہر صورت ہونا چاہیے۔  
عمر دین نے اُسے نوٹوں کا ایک بندل تھماتے ہوئے کہا۔

”یاد عمرے تو ہمارا پیرانا سنگی ہے۔ زندگی میں آج تک تیرا کون سا کام ہم نے نہیں کیا۔  
ادتے یہ تو بالکل معمولی سا کام ہے بھاتی میرے۔ — تو بے فکر ہو جا اور آج رات کو لڑکی  
وصول کر لینا۔ ادتے تو کے تو سارے خاندان کو باندھ کر لے آؤں ایک لڑکی کی کیا بات  
ہے۔“

شراب کے نشے میں دھت شیری بد معاش نے لڑکھڑائی آواز میں کہا۔  
”نہیں شیرمی جتنا کام کہا گیا ہے۔ اتنا ہی کرنا۔ — تو فضل شاہ کے غصے کو نہیں جانتا  
عمر دین نے اُسے قدرے اُدبھی آواز سے کہا تو شیری نے چومک کر اُس کی طرف دیکھا۔  
لیکن —

شیری کے تیور بھانپ کر وہ بے شرموں کی طرح ہنس دیا۔

نذر محمد نے گھر پہنچ کر سگھ کا سانس لیا۔ —

اب اُسے جلد از جلد اس شہر سے نکل جانے کی فکر دامنیگر ہونے لگی تھی۔ حنیف محمد  
نے اُسے بتایا تھا کہ ایک اور شہر میں اُس نے دوسرا مکان ان کے لیے خرید لیا ہے اور  
اس مکان کو فروخت کرنے کے لیے نذر محمد نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے بات بھی کر رکھی تھی۔  
اُسے اب تک دو تین بڑی اچھی پیشکشیں بھی ہوتی تھیں۔

لیکن —

کچھ زیادہ کی امید پر اس نے یہ معاملہ لٹکاتے رکھا۔ جو دلی محمد نے بتایا کہ پولیس اس  
کے دروازے تک پہنچ گئی ہے تو اُس کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ —

گو کہ اُس نے اپنی دو بیٹیاں دلی محمد کے گھر بیاہ رکھی تھیں۔ اس کے باوجود وہ یہ  
بات جانتا تھا کہ جب کبھی دلی محمد پر کوئی دباؤ آیا وہ فوراً ہتھیار ڈال دے گا کیونکہ وہ شروع  
ہی سے بالکل انگ مزاج کا آدمی تھا جس نے یہی کوشش کی تھی کہ اُس کی زندگی صاف ستھری

اور آرام سے گزرے۔ —

اس کی دونوں بیابیاں بیٹیاں دلی محمد کے بیٹوں کے ساتھ دوسرے شہروں میں رہتی  
تھیں جہاں وہ اپنی نوکریوں کے لیے قیام پذیر تھے اور یہ بیٹے بھی دلی محمد سے الگ رہتے تھے۔  
لیکن —

بہر حال وہ اس کا سدھی تھا اور رشتہ بھی اتنا نازک۔ اس نے بھی مناسب جانا کہ  
فی الوقت اس سے کنارہ کشی اختیار کر لے اور لگے تین چار ماہ تک خاموشی سے صورتحال  
کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے دلی محمد کسی امتحان سے گزرے۔ —!!  
شام ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے گھر سے اچانک ہی اس ارادے سے باہر نکلا کہ  
پراپرٹی ڈیلر کے پاس جا کر اس پیشکش کے لیے ہاں کر دے اور درمیانی کپڑے۔

ابھی اس نے دروازے سے قدم ہی باہر رکھا تھا جب اچانک اس کو دوبارہ اندر  
آنا پڑا۔ دروازے کے باہر تین بٹے کٹے بد معاشوں نے دیوار سی بنا رکھی تھی۔ —

ان تینوں میں سے وہ صرف عمر دین کے بھائی نیاز کو پہچانتا تھا۔ باقی دو شاید مقامی  
بد معاش تھے۔

”نذر محمد تم کیا سمجھتے تھے کہ عمر دین اور فضل شاہ کو بے وقوف بنا دو گے۔ ارے ہم  
تو تمہیں قبر سے باہر نکال لائیں گے۔ اب دیکھنا تمہارا کیا حشر ہوتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے نیاز نے اس کی کمر پراتنی زور سے لات ماری۔ نذر محمد منہ کے بل  
پرے جا کر اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہو کر کوئی بیچ و پکار کرے اُن میں سے ایک بد معاش نے  
اس کی گردن اس طرح دبوچ لی تھی کہ اُس کے لیے اپنے جسم کو حرکت دینا اور منہ سے آواز نکالنا  
بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

اس پوزیشن میں وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے۔

جس کمرے میں وہ آئے تھے وہاں اس وقت نذر محمد کی بیوی اور اس کی چھوٹی بیٹی  
زیب موجود تھی۔ حنیف خاں کی بیٹی صغرا اپنی دوسری بہن کے ساتھ بازار کچھ سودا سلف

خریدنے لگی ہوتی تھی۔!

تینوں بد معاشوں نے چند منٹ کے اندر اندر دونوں بوڑھوں کو باندھ کر ایک طرف پھینک دیا اور اپنی مداخلت میں ہاتھ پاؤں مارتی نذر محمد کی بیٹی زینب کو مرغی کی طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھایا۔

”نیاز۔۔۔ بے غیرت کینے انسان تجھ میں ہمت ہے تو مجھے گولی مار۔۔۔ اس بے چاری کا کیا گناہ۔

”نہیں نذرے میں تجھے گولی نہیں ماروں گا۔ تیرے جرم کی سزا یہی ہے کہ تو زندہ رہ کر ساری زندگی اپنی بیٹی کی تباہی پر آنسو بہاتا رہے۔ کل تجھے علم ہو جائے گا کہ شمشیر نگر کے باسیوں کی آنکھوں کے سامنے تیری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔“

نیاز نے اس کی بیٹی کے ساتھ ایک انتہائی غلیظ حرکت کرتے ہوئے کہا۔  
رسیوں سے جکڑے دونوں میاں بیوی تڑپ اُٹھے۔ انھوں نے ظالموں کی بہت منت سماجت کی لیکن ان درندوں کے دلوں میں انسانیت کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔ انھوں نے روتی بلکتی اس کی بیٹی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے باہر لے آئے۔

”نیازے۔۔۔ حنیف خاں تیری نسل کو برباد کر دے گا۔۔۔ تیرا نشٹ کر دے گا۔ اگر وہ زندہ رہا تو تجھے کتے کی موت مار ڈالے گا۔“

نیاز نے نذر محمد کی آخری آواز بھی سنی تھی۔

وہ تھکے لگانا باہر آ گیا۔

نذر محمد اور اس کی بیوی چیختے چلاتے اب بے ہوش ہو چکے تھے۔!!

بد معاشوں نے زینب کو پہلے سے باہر کھڑی اپنی جیب میں پھینکا اور محلے داروں کی آنکھوں کے سامنے لٹکارے مارتے اور ہوا میں گولیاں چلاتے اسے اغوا کر کے لے گئے۔! مکان کے باہر سینکڑوں لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔

لیکن۔۔۔

ان میں سے کسی نے مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ لوگ حملہ آواروں کو پہچانتے تھے۔

یہ شیدی بد معاش کے آدمی تھے۔

اور۔۔۔

ان میں سے کسی کے خلاف زبان کھولنا اپنی موت کو دعوت دینے والی بات ہوتی۔ ابھی اس محلے میں کوئی ایسا غیرت مند نہیں پیدا ہوا تھا جو کسی کی بہن بیٹی کی غیرت کے لیے

اپنی جان پر کھیل جاتا۔

یہ تو تماشا بین تھے۔

ان کا کام تماشا دیکھنا اور اس سے حظ اُٹھانا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا جب یہ خود حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں تماشا بین جاتے۔

لیکن۔۔۔

اُن کی کوشش بھی ہوتی تھی کہ دوسرے کا بھلے گھر جل جائے اُن کی ذات پر آج نہ آئے۔ اس مجمع میں سے کسی مرد نے یہ ہمت ہی نہ کی کہ مکان کے اندر جا کر ایک نظر اس کے مکینوں کی حالت کا جائزہ ہی لے لیتا۔

انھوں نے تو پولیس کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔!

جب اُن میں سے ایک سوشل ورکر قسم کے بزرگ نے اُن کی سوتی غیرت کو جگانا چاہا تو وہ اپنے اپنے کان لپیٹ کر چل دیتے۔

دونوں نیم بے ہوش بوڑھوں کو رسیوں سے نجات معزناں اور اس کی بہن نے دلائی۔ جو ابھی ابھی بازار سے واپس لوٹی تھیں۔!!

اپنے والدین کی یہ حالت دیکھ کر اُن کے لیے خود پرتخا بول پانا مشکل ہو گیا تھا۔

لیکن۔۔۔

حنیف خاں کی بیوی معزناں جو ذہنی طور پر کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے شاید پہلے ہی سے تیار رہتی تھی نے اپنے ادا سان خطا نہ ہونے دیتے اور اپنے والدین ہی کو

نہیں بلکہ اپنی بہن کو بھی سنبھالے رکھا۔!!

رات ڈھلے تک نذر محمد کے ادا سن بحال ہوتے تو وہ بادلِ نخواستہ پولیس ٹیش کی طرف چل دیا۔ جہاں پہلے تو کسی نے اس کی بات سنے ہی سے انکار کر دیا۔ جب اُس نے رورو کر آسمان سر پر اٹھایا تو ایک اے ایس آئی نے اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ بھرا اُسے دھکے دے کر تھانے سے باہر نکال دیا۔

اس پر دیوانگی طاری ہو رہی تھی۔ اپنے گھر کا راستہ بھی اُسے ڈھنگ سے یاد نہیں آ رہا تھا۔

صبح ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے گھر اس حالت میں پہنچا کہ اس کا ذہنی توازن بھی تہریکا بگڑ چکا تھا۔ گھر والوں کو اب اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

زینب نے اپنے ادا سن خطا ہونے تک مزاحمت کی تھی۔

وہ زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر ان غنڈوں سے ٹکرائی تھی۔ اس کی پیدائش کاؤن میں ہوئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ عورت کی عزت ہی دراصل اُس کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ عزت گئی تو پھر زندگی بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے مردوں کے بھائی کو پہچان لیا تھا۔

وہ جان گئی تھی کہ اس حرام کاری کے پیچھے فضل شاہ کا ہاتھ ہے۔ شاید وہ اس کے باپ کی سرکشی کا انتقام اُسے بے آبرو کر کے لینا چاہتا تھا۔

اپنی خاندانی روایات کو سمجھتے ہوئے اُس نے یہ توجان لیا تھا کہ اب گھر زندہ جانے کا راستہ بھی اس پر بند ہو چکا تھا کہ جو لوگ اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں ان کی حیثیت فضل شاہ کی حویلی کے کتوں سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ لوگ اُسے فضل شاہ تک بہر صورت پہنچا دیں گے۔

اور

فضل شاہ نے اس سے بہن کا رشتہ قائم کرنے کے لیے اُسے اغوا نہیں کیا تھا۔!

اس کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی بچا تھا اور وہ تھا موت۔!

اُسے مرنا تھا۔

یہی ایک صورت اس کی نجات کو ممکن تھی اور کسی بھی صورت میں وہ کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہ ہوتی۔ اس نے بے ہوش ہونے تک ان غنڈوں کے ساتھ ہمارے مردوں کی طرح مزاحمت کی تھی۔!

یہ لوگ کتنے بااثر تھے۔

یہ کون تھے؟

کہاں سے آئے تھے؟

ان کا فضل شاہ سے کیا رشتہ تھا؟

اُسے ان سوالات میں سے کسی کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

اُسے تو بے ہوش ہونے سے پہلے شدت سے اپنی بے چارگی اور قانون کی بے بسی کا احساس ہوا تھا کیونکہ سارے راستے وہ مدد کے لیے چینی آئی تھی۔ بہت سے راہ گیروں نے اُس کی آوازیں بھی سنی تھیں۔

لیکن

کوئی اُس کی مدد کو نہیں آیا۔!

شاید یہ سب نامرد تھے۔

بے غیرت تھے۔

یا پھر مجرموں کے ساتھی تھے، کیونکہ قلم پر خاموش رہنے والا بھی ظالم کا ساتھی ہی ہوتا ہے۔!

نیا زادر مقامی غنڈے نے اُسے جیب کی پھلی سیٹ پر اپنے درمیان بٹھا کر بے بس کیا ہوا تھا جبکہ اگلی سیٹ پر ایک غنڈہ ڈراتیور کے ساتھ بیٹھا اُسے مزید تیز جیب چلانے کے لیے مسلسل اُکسار رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پستول پکڑ رکھا تھا۔ اور اسے سسل لہراتا آیا تھا۔

مزا حمت کرتی زینب کی گردن ایک طنز ڈھلک گئی تھی —  
دو دنوں غنڈوں نے اس پر قدرے سکھ کا سانس لیا کیونکہ انھیں زینب کو قابو کرنے کے  
لیے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ پھیری ہوئی شیرنی کی طرح اُن پر حملہ کرتی تھی۔ دونوں نے  
اب تک اس کے منہ پر اس قدر تھپڑ مار کر اُسے ٹھنڈا اور خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن —

خدا جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

خدا جانے اس کے وجود میں کوئی جتن حلول کر گیا تھا۔ وہ اُن کے قابو میں نہیں آ رہی تھی  
دونوں نے اُس کا ایک ایک بازو کپڑا رکھا تھا جبکہ زیادہ چھینے پر وہ اس کے منہ پر ہاتھ بھی رکھ  
دیتے تھے۔

اُس کے بے ہوش ہونے پر جب وہ نیاز کے کندھے سے لگ گئی تو دونوں نے اپنی  
گرفت بھی ڈھیلی کر دی تھی۔

اُن کی خواہش تھی کہ اب وہ ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے ہوش میں نہ آئے۔!!  
قریباً بیس منٹ کے بعد وہ شہر سے باہر آ گئے تھے۔ اب انھیں نزدیکی گاڑوں میں زینب  
کو پہلے سے طے شدہ پر درگرم کے مطابق پہنچانا تھا جہاں سے آگے یہ دوسرے جیشوں کی ڈھاری  
تھی کہ اُسے آگے لے جاتے! —

انھیں اب ریلوے لائن عبور کرنی تھی — جس کا پھاٹک اُن کی آمد سے پہلے ہی بند  
ہو چکا تھا اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

یہاں سے کوئی متبادل راستہ بھی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ نیاز نے ڈرامی طور سے کہا تھا کہ  
گاڑی کو آگے لے جاتے وہ بندوق کی نوک پر پھاٹک کھلوا کر جیب آگے لے جانے کا پر درگرم  
بنا چکے تھے —

جب وہ پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو گاڑی بھی کچھ دُور سے آتی دکھائی دے گئی جس پر  
انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

زینب کو گاڑی کے تیز دسل کی آواز عالم ہوش میں واپس لائی تھی! —

ابھی بمشکل اُس کے اوسان بحال ہوتے تھے جب اُس نے اپنے بدن میں بجلیاں تر پتی  
محسوس کیں۔ اُس نے آخری منظر یہی دیکھا کہ دونوں بدعاش گاڑی کی طرف متوجہ تھے جو ریلوے  
پھاٹک سے بمشکل بچا س گزرنے کے فاصلے پر تھی! —

زینب نے زخم خوردہ شیرنی کی طرح ہوا میں زقذ بھری اور اُن کی ڈھیلی ڈھالی گرفت سے  
آزاد ہو کر جیب سے باہر گر پڑی۔

اس سے پہلے کہ دونوں کو کچھ سمجھ آئے اُس نے ریلوے لائن کی طرف دوڑ لگا دی —  
دونوں اُسے گالیاں دیتے جیب سے باہر آتے تھے۔

لیکن —

اب خاصی دیر ہو چکی تھی —

زینب اور ریل کا انجن ایک ہی وقت میں ریلوے لائن کے درمیان پہنچے تھے —  
برق رفتار آگ اُگلنے انجن نے حیا اور ایمان کی اس دیوی کے جسم کو ہوا میں اُچھالا اور پرے  
پھینک دیا۔ فرشتہ اجل نے اس کی لاج یوں رکھی کہ زمین پر اُس کا بدن گرنے سے پہلے ہی  
اس کی رُوح قبض کر لی اور دوسرے ہی لمحے وہ خدا کے حضور پہنچ گئی۔ جہاں خوریں اس کے  
استقبالی کو دیدہ و دل فرس راہ کیے کھڑی تھیں! —

صورت حال نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ اُن میں سے کسی کو کچھ سوچنے کا موقعہ ہی  
نہ مل سکا۔

زینب کے اس انتہائی دلیرانہ اقدام نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئے! —  
انتی بہادر اور باکر دار لڑکی انہوں نے زندگی میں اس سے پہلے دیکھی کہاں تھی۔  
ریلوے پھاٹک کے دونوں طرف موجود لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے مُردہ جسم  
کے گرد دائرہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

شیدی کے آدمیوں نے یہ مہلت غنیمت جانی اور وہ جیب کو مختلف گاڑیوں سے ٹکراتے  
ہوئے فائرنگ کرتے دوبارہ شہر کی طرف واپس لوٹ گئے۔

اس مرتبہ حنیف خاں بالکل غیر ارادی طور پر نذر محمد سے ملنے آیا تھا۔! مکان کے سامنے قطعہ زمین پر جب اُس نے شامیانے اور دریاں بھی دکھیں تو ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی محسوس ہوئی۔

”خدا نہ کرے کہیں ماما نذر محمد۔“

اُس نے گھبراہٹ میں یہی رائے قائم کی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ کچھ بزرگ سے لوگ ان پر بیٹھے شاید قرآن خوانی کر رہے تھے۔ حنیف خاں کو دُور سے اُن میں سے ایک آشا چہرہ نظر آیا تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ نمبر دار احمد دین کا لڑکا فیروز تھا۔!

وہ ایک کونے میں بظاہر اجنبیوں کی طرح اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اب کسی طرح فیروز کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

اس امکان کو اُس نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ یہاں پولیس کے مخبر بھی ضرور موجود ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ پولیس نے اس علاقے ہی کو گھیرے میں لے رکھا ہو کیونکہ انھیں اس بات کی اُمید ضرور ہوگی کہ حنیف خاں یہاں آتے گا۔!

قریباً پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اس نے فیروز کو جوتی پہن کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ شاید وہ کسی کام سے اسی محلے کے بازار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑے فاصلے تک فیروز کا تعاقب کرنے کے بعد حنیف اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے تو اُس نے پشت سے اُسے مخاطب کر کے اپنی طرف متوجہ کیا۔!

حنیف خاں کو اپنے سامنے پاکر فیروز ایک لمحے کے لیے تو ٹھٹھک کر ہی رہ گیا۔ بے اختیار اُس نے اپنی بانہیں کھولیں اور فیروز کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔!

دونوں ایک دوسرے کو گرم جوشی سے بغل گھیرتے تھے۔

ابھی تک دونوں خاموش تھے۔

حنیف خاں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا نہ ہی فیروز نے اس سے کچھ دریافت کیا تھا۔

”یہ جگہ مناسب نہیں میرے ساتھ آجاؤ۔ کہیں ادر چلتے ہیں۔“

حنیف خاں نے اُسے کہا اور فیروز نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

فیروز کو اپنے ساتھ وہ یہاں سے کچھ دُور ایک باغ میں لے آیا تھا۔

یہ ایک تفریحی پارک تھا جس میں اس وقت کوئی خاص رش نہیں تھا۔ دونوں سر جھکاتے

ایک کونے میں جا بیٹھے۔

فیروز نے حنیف خاں کو بغیر لگی لپٹی رکھے ساری داستان سُنادی تھی، جب وہ اُسے

لوگوں کی زبانی سنی زینب کی کہانی سُن رہا تھا تو بے اختیار حنیف خاں کی آنکھیں بھرا آئیں۔!

”حنیف خاں۔۔۔ میں شروع ہی سے اس بات کا مخالف تھا کہ تم اپنی گاڑی کی

زمین فروخت کر دو۔ ارے ہم ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے کہ اپنے ایک بزرگ کے گھرانے کی حفاظت

نہ کر سکیں۔ اُس گاڑی کا کون سا ایسا گھر ہے جس پر تمہارے باپ کے احسانات نہیں ہیں۔

کس کی ہمت تھی جو اس طرح وہاں گھس کر نذر محمد پر حملہ آور ہوتا۔ تم نے اپنے گنہ گہریاں

بیٹوں کے سامنے لا کر پھینک دیا۔ ارے! یہ لوگ تو اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتے کسی کی

کیا کریں گے۔ حنیف خاں میرا باپ اور میرا سارا خاندان تمہارے ساتھ جینے مرنے کے لیے

تیار ہے۔ ابھی ہمک زمین کا باقاعدہ انتقال نہیں ہوا۔ اگر رقم واپس لوٹانے کے لیے تمہیں

ملت و درکار ہے تو میں وہ بھی لے دوں گا۔ لیکن خدا کے لیے اپنے گھر والوں کو اس جہنم

میں نہ رکھو۔ انہیں اپنے گھر میں واپس بھیج دو۔ یہ میری ہی نہیں ساری برادری کی خواہش

ہے۔ تمہارا بیٹا صرف تمہارا نہیں سارے شمشیر نگر کا بیٹا ہے۔ ہم سب اس کی حفاظت

کے لیے کٹ مریں گے۔ مجھے لگتا ہے یہ حکومت اگلے سات آٹھ مہینے کے بعد ٹوٹ جائے گی

اور نئے الیکشن ہوں گے۔ ایک مرتبہ جب فضل شاہ سرکاری عہدے دار نہ رہا تو ہم اس سے

بھی منٹ لیں گے۔ تم اس وقت پیش ہو جانا ہم بھی اپنی جان لڑا دیں گے۔ تمہیں پھانسی

نہیں چڑھنے دیں گے۔“

فیروز نے اُسے سمجھایا۔

اور۔۔۔

اس کی بات حنیف خاں کے ذہن میں بیٹھ گئی۔

واقعی اس نے جو فیصلہ اپنے خاندان کو سرداروں اور فضل شاہ سے بچانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اُن کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔

اس کے گاؤں کے لوگ مرتے مرجاتے لیکن اس طرح بے بسی سے زینیب کے اغوا کا تماشا نہ دیکھتے۔ یوں بھی ایسی ایک کوشش کر کے اس کے دشمنوں نے پہلے ہی اس کے گاؤں کے مکینوں کو آزما لیا تھا اور اندازہ کر لیا تھا کہ آزمائش آنے پر یہ لوگ کمزور پڑنے والے نہیں تھے!!

”فیروزیار۔ تم واقعی کسی کرموں والی کے جتنے ہو۔ میں ساری زندگی تمہارے احسانات نہیں اتار سکوں گا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ واقعی میں نے ان لوگوں کو شرم میں لاکر غلطی کی ہے۔ اب انہیں واپس ہی جانا چاہیے۔ میں مہلت نہیں مانگ رہا۔ تین لاکھ روپیہ بھتیس ایک ہفتے میں پہنچا دوں گا۔“

لیکن۔۔۔ ماں نے نذر محمد کی واپسی ایسے نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے قسم ہے میرے پیدا کرنے والی کی جب تک عمر دین کو یہ ”بھاجی“ واپس نہ موڑوں۔ مجھ پر زندگی حرام ہے۔“

اُس نے یہ کہتے ہوتے اٹھ کر کھڑے ہونا چاہا۔

لیکن۔۔۔

فیروز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے زبردستی دوبارہ بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

”تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہے ہو حنیف خاں۔ تم ہونٹھو خاں کے بیٹے۔ لیکن تمہارا واسطہ بڑے مکار غنڈوں سے آن پڑا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ان ہی کے ہتھیار سے

جنگ لڑی جاتے تو ہی بہتر ہے۔ اب کوئی قدم جذبات میں آکر نہ اٹھانا۔ تم اکیلے ہو۔

میں تمہاری بہادری پر شک نہیں کر رہا۔ لیکن دشمن کی فوج کے سامنے اکیلے کھڑے ہو جانے کو میں بہادری نہیں سمجھتا۔ جس آگ میں تم جل رہے ہو اس میں موراں والی کا کھڑا بھی جل رہا ہے جس کا مال عمر دین نے پکڑا کر اُسے تقیث بھی کٹوائی تھی اور اس کی بیوی کو بے عزت

کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب کھڑے کو ذرا ہوش آیا ہے۔ میں آج ہی اُس سے رابطہ

کرتا ہوں۔ تمہاری اور اس کی ملاقات کروانا ہوں۔ وہ بھی جوان آدمی ہے تمہاری بہت

قدر کرے گا۔ میرے تعلق والا ہے اور پھر دشمن کا دشمن ہمیشہ اپنا دوست ہوتا ہے۔ ایک

تو ایک ہی ہوتا ہے حنیف خاں جب دول جاتیں تو گیارہ بنتے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ

ہوں گا لیکن منہ ڈھانپ کر۔ زینب ہماری بھی بیٹی تھی۔ ہماری برادری کی عزت

تھی۔ ہمارا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ یا نہیں۔ تم اکیلے کیا سارے جہان سے لڑو گے۔“

اُس کے پاس فیروز کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا۔!

واقعی وہ اکیلا ساری دنیا سے نہیں ٹکرا سکتا تھا۔

اُسے بھی جوڑ توڑ سے کام لینا تھا۔

اور۔۔۔

نیر دار احمد دین نہ صرف اس کام میں مہارت رکھتا تھا، بلکہ اس کا دل و جان سے

ہمدرد بھی تھا۔

فیروز نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس وقت نذر محمد سے ملے بغیر ہی واپس

لوٹ جاتے کیونکہ اُسے بھی اس بات کا شک ہے کہ یہاں پولیس نے اس کی ممکنہ آمد کے

پیش نظر ناکے لگا رکھے ہیں۔ اُس کو تو نذر محمد کے گھر تعزیت کے لیے آنے والے ایک

دو آدمی بھی مشکوک دکھائی دیتے تھے۔!

فیروز نے اس کے ساتھ اگلے روز رات کو ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

اس ملاقات کے لیے اُس نے یہاں سے بیس میل دُورا اپنے ایک خاص آدمی کا

ایڈریس دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ یہاں بڑے اعتماد اور اطمینان سے آسکتا ہے۔

حنیف خاں بڑے بوجھل قدموں سے واپس لوٹا تھا۔

اُس نے اپنے گھر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی جمع پونجی سنبھالی تھی۔ وہ ایک لمحے کے

لیے بھی نیر دار احمد دین کا زیر بار رہنا نہیں چاہتا تھا۔

دوسرے روز وعدے کے مطابق وہ شام ڈھلنے تک فیروز کے بتائے ٹھکانے پر پہنچ

گیا۔ جہاں موراں والی کا نگرہ اور فیروز اس کے بے چینی سے منتظر تھے۔

نگرے نے اُس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا تھا۔!

اُس کی بیوی کو سارے گاؤں والوں کے سامنے گالیاں دی تھیں اور دھکیاں دے کر گیا تھا۔

عمر دین کا گھر اُس سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا —

وہ یہاں سے تیسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ نکرہ جب چاہتا اپنا حساب برابر کر دیتا۔

لیکن —

اُسے علم تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے وہ فضل شاہ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ اور ان حالات میں اُسے نکرہ کا فضل شاہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔

زخم خوردہ سانپ کی طرح وہ اپنی بے بسی پر تلملا کر رہ جاتا۔

لیکن —

عمر دین کا کچھ نہ بگاڑ پاتا۔

آج جب فیروز نے اُسے بتایا کہ تھوفاں کا مفرد بیٹا حنیف خان بھی عمر دین کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے تو اُسے اپنی دلی مراد لہرائی نظر آئی۔ ایسے جوان مرد کا ساتھ میسر آنے کا مطلب تھا کہ قدرت کو اُس کی بے بسی پر رحم آ گیا ہے۔ ورنہ اُسے تو اب اپنی مردانگی بھی مشکوک دکھائی دینے لگی تھی۔

دونوں عمر دین کے ڈسے ہوئے تھے۔

دونوں کی غیرت پر عمر دین نے فضل شاہ کے کندھوں پر چڑھ کر ضرب لگائی تھی۔ چونکہ حنیف خان کو فضل شاہ کے نزدیک رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے وہ کبھی اُس کے رعب

داب سے متاثر نہیں ہوا تھا وہ جانتا تھا فضل شاہ کی ساری بد معاشی مقامی تھانے اور مفرد بد معاشوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔ جس روز پولیس اور بد معاشوں کو یقین ہو گیا کہ کوئی اُس سے بھی ٹکراتا ہے۔ اُس روز وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے اور اُس دن فضل شاہ کی حیثیت نہریلے سانپ سے ایک کینچنے کی بن کر رہ جائے گی کیونکہ اُس کے نہر کے دانت نکل چکے ہوں گے — !!

جہاں تک سرداروں کا تعلق تھا — !

انہیں حنیف خان نے بڑا زبردست دھچکا لگایا تھا۔ سردار مرید، سردار رشید کا

## شیر کا پتھر

موراں والی کانگر اکھی عمر دین کا ساتھی تھا۔

لیکن —

اپنی فطرت کے عین مطابق وقت آنے پر عمر دین نے اُسے بھی ڈس لیا اور مقامی پوسٹ والوں کے ساتھ مل کر اُس کا مال پکڑو کر آدھا خود مضم کر لیا اور آدھا مال پکڑنے والوں کی بھینٹ پڑھا دیا — !

عمر دین نے اس پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ یار ماری کرتے ہوئے اُسے نفیث بھی کٹوا دی تھی۔ وہ تو شاید جیل جانے کے بعد نکرے کا گھر بار بھی بگوا دیتا، لیکن اس مرحلے پر شمشیر نکرے کے زبرداریوں کے لڑکے فیروز نے اُس کا ساتھ دیا اور نہ صرف اُس کے بیوی بچوں کو عمر دین کے عتاب سے محفوظ رکھا بلکہ تمام منظر مول لے کر اُسے جیل سے ضمانت پر بھی رہا کر دیا۔

نکرے کو بہت زبردست کاروباری دھچکا لگا تھا۔

اُس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ صرف ایک ”ساکھ“ ہی رہ گئی تھی لیکن پلے دو کوڑیاں نہ ہونے کے سبب یہ ساکھ بھی کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ سرحد پار کے سرنگروں کا اُس کے سر قاصا قرض پڑھ گیا تھا۔ ان حالات میں فیروز پھر اُس کے آڑے آیا اُس نے نکرے کے لیے ڈیڑھ دو لاکھ کا بندوبست کیا اور اُس کے سرحد پار سواری چھپے اپنے علاقے سے دو تین کامیاب چکر لگوائے تو نکرے کہیں اس قابل ہوا تھا کہ اپنی دنیا میں سر اٹھا کر چل سکے۔

اس درمیان اُس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش بار بار سر اٹھاتی اور اُسے تڑپا کر رکھ دیتی وہ اپنے ہاتھوں عمر دین کی تنکا بوٹی کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اُس کی غیر موجودگی میں



اکھوتا بھائی تھا جس کی موت کے بعد سردار رشید کے لئے کھل کر سامنے آنا بہت مشکل تھا کیونکہ اب اپنے کینے کا وہی سربراہ تھا اور باقی لوگ اس قابل نہیں تھے کہ اپنا دائرہ اختیار اس کی طرح گاؤں کی حدود سے باہر بھی پھیلاتے۔  
سردار مرید کو قتل کر کے حنیف خاں نے اُسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ فضل شاہ کی معاونت کے باوجود اُس کے لئے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

اور —

دوسری طرف سردار رشید یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اُس سے بڑا گدھا پلوال میں ابھی تک کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

اُس نے زندگی میں سب سے بڑی غلطی ریاست شاہ سے ہاتھ ملا کر کی تھی۔

اپنے بھائی کی جان سے تو ہاتھ دھونے ہی پڑے تھے جبکہ اُس کا دیرینہ اور مخلص ساتھی عالم دلا بھی فضل شاہ کی مکارانہ سیاست کی بھینٹ پڑ چکا تھا۔ نتھو خاں کے بیٹے سے دشمنی الگ مولی۔ ان حالات میں اگر عالم داد اُس کے ساتھ ہوتا تو بھی اُسے بڑا سہارا مل سکتا تھا۔

لیکن —

اب تو وہ بالکل تہی دست تھا۔

یونہی کونسل کی سیٹ اُس کے بھائی کی موت سے اُن کے ہاتھ سے نکل چکی تھی جس پر دوبارہ اُن کا قبضہ ہونا بالکل ناممکن سی بات تھی کیونکہ فضل شاہ نے اُس کے ساتھ سردار مرید کو چیر میں بنانے کا وعدہ کیا تھا اُس نے سرداروں کے سارے قائدان کی کفالت کا بیڑہ نہیں اٹھایا تھا۔

جس فضل شاہ کے بھانے میں اگر اُس نے عالم داد جیسے اپنے دیرینہ اور مخلص ساتھی کو اپنا جانی دشمن بنا لیا تھا۔ اُس پر سردار رشید کو اب اتنا اعتماد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ شہر میں اپنی نقل و حرکت ہی اُس کے علم میں لاتا۔

ایسے کیسے اور ریاکار شخص سے کیا اُمید تھی کہ وہ کہیں اُس کا ہی صفایا نہ کر دیتا۔ !  
سردار رشید کے پاس اس سوچ کے شواہد موجود تھے کہ ضرور فضل شاہ نے حنیف خاں

سے بھی اندر خانے کوئی معاملہ طے کر لیا ہو گا۔

اُس سے کسی بھی حرام کاری کی توقع کی جاسکتی تھی۔

اُس نے آج مدت کے بعد اپنی برادری کے لوگوں کو اکٹھا کیا تھا جنہوں نے اُسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فوراً فضل شاہ کے چنگل سے نکلے اور عالم داد کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ کرے۔

برادری والوں نے سردار مرید کی طرف سے فضل شاہ کے بھانے میں اگر حنیف خاں کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش اور اُس کے نتیجے میں ہونے والے نتھو خاں کی بیوی کے قتل کا ذمہ دار بھی سردار مرید کو ٹھہراتے ہوئے اُس کے اس فعل کی کھل کر مذمت کی تھی۔

انہوں نے کہا تھا کہ ایسا گھٹیا اقدام کر کے سرداروں نے پلوال کی عزت کو داغدار کرنے کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔

سردار رشید کے رضامند ہونے پر برادری کے بزرگوں کا ایک وفد عالم داد سے ملاقات کرنے جیل جا رہا تھا تاکہ دونوں کی صلح کروا کے اور اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا کر دوبارہ دونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جاسکے۔

یہ ساری کوششیں فضل شاہ کو لاعلم رکھ کر کی جا رہی تھیں کیونکہ انہیں بھی اب فضل شاہ کے ساتھ طاقت کی بجائے سیاست سے مقابلہ کرنا تھا۔

○

ٹانامالوئی کے لیکن شام ڈھلے اپنے گھروں کے آنگنوں میں بچھی چادریوں پر آرام کر رہے تھے۔ کھیتوں سے تنک کر لوٹنے والوں کے لئے اُن کی سونیاں کھانوں کے خوان سجا رہی تھیں اور بزرگ اپنے حقے تازہ کر رہے تھے جب گاؤں کی فضا گولیوں کی تڑ تڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ !

نبرد ارعدین کی جو ملی سے شور برآمد ہو رہا تھا۔ چار گھڑ سواروں نے عمر دین اور اُس کے بھائی نیاز کو بندوق کی نوک پر اُن کے محفوظ گھر سے نکالا اور اب اُن کو اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھیسٹے ہوئے گاؤں کے کونے میں موجود چارہ کاٹنے والے ٹوکے پر لے

”مجھے بھی پہچان لو۔۔۔ میں ننگرا ہوں۔۔۔ ننگرا۔۔۔ جس کی بیوی کو اس احسان فراموش ذلیل انسان نے بے عزت کیا۔ اس نے میرے اساتذوں کا بدلہ میری عزت پر حملے سے دیا۔۔۔ اب یہ اپنے انجام کو پہنچے گا۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔۔۔  
ٹانٹا نوالی کے خوفزدہ کلینوں کی آنکھوں کے سامنے اب رومن اکھاڑہ بجا ہوا تھا۔!!  
پہلے حنیف خاں نے اپنے گھوڑے کے ساتھ گھسٹتے تیزا کو جھٹکا دے کر اپنے قدموں میں گر آیا اور اس کے منہ پر زوردار ٹھوکر مار کر تھوک دیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں سے للکار کر کہا کہ اس نے اپنے جن ناپاک ہاتھوں سے میری بہن کی عزت سے کھیلنا چاہا تھا وہ اب کبھی اس کے بدن کا حصہ نہیں رہیں گے۔!

اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس نے نیاز کا ایک بازو چارہ کاٹنے والے ٹوکے میں دیا اور بے رحمی سے اس کا بازو چارے کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔

اس کے دوسرے بازو کے ساتھ بھی حنیف خاں نے یہی سلوک کیا اور ماہی بے آب کی طرح مڑپتے نیاز کو وہیں پھینک کر اس کے دونوں کٹے ہوئے بازو اٹھا کر اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتے تھیلے میں ڈال لئے۔

اس کے بعد عردین نمبردار کی باری تھی جس پر موت کے خوف نے دہشت طاری کر دی تھی اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کی روح فرشتہ اجل نے پہلے ہی سے قبض کر لی ہو۔!!

ننگرے اور حنیف نے مل کر اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر اُسے اندھا کر دیا تھا۔!!  
انہوں نے دونوں بھائیوں کو نشان عبرت بنا دیا تھا۔!  
ان میں سے ایک اندھا اور دوسرا دونوں ہاتھوں سے محتاج ہو چکا تھا۔ دونوں کو نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر وہ ہوائی فائرنگ کرتے فرار ہو گئے۔!!

جب تک پولیس یا فضل شاہ کے آدمی وہاں پہنچتے۔ حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے جا چکے تھے۔ پولیس کی آمد سے صرف یہ ہوا کہ دونوں مرنے سے بچ گئے۔ انہیں ہسپتال

آئے تھے۔!

فائرنگ کی آدائیں اس گاؤں کے کلینوں کے لئے کوئی اچھنے کی بات نہیں تھی۔

لیکن۔۔۔

یہاں فائرنگ رات کے اندھیرے میں اکثر سمگلروں اور ریخیز کے درمیان ہوا کرتی تھی گاؤں میں اگر کبھی گولی چلتی تو عردین نمبردار کے گھر والوں کی طرف سے ہی کسی پر پلائی جاتی تھی۔ عردین نے گزشتہ ڈیڑھ سال سے جس تیزی سے عروج حاصل کیا اور جس طرح سرکار در بائیں اس نے اپنی ساکھ بنا لی تھی اس کے بعد سے تو گاؤں کے اکثر لوگ اس سے کئی کترا کر گزرا کرتے تھے۔!!

آج جب انہوں نے اپنے کچے مرکالوں کی منڈیروں اور چھتوں سے شام کے بلنگے اندھیرے میں کچھ گھڑ سواروں کو ان کی درگت بناتے دیکھا تو وہ اسے مکانات عمل جان کر ہی سہم کر رہ گئے۔

وہ ٹانٹا نوالی کے لوگوں کو مجھے پہچان لو۔۔۔ میں شمشیر نگر کے نتھو خاں کا بیٹا حنیف خاں ہوں۔

اچانک ایک قہر برساتی آواز نے گاؤں والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

عردین اور اس کے بھائی نیاز نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ انہوں نے نتھو خاں کی ایک بیٹی کو اغوا کر کے بے آبرو کرنا چاہا۔ وہ تو مر گئی، لیکن ان موذیوں کو ہمارے سوا لے کر گئی۔ انہوں نے بچھ لیا ہو گا کہ نتھو خاں مر گیا ہے اور اس کا بیٹا پولیس اور فضل شاہ سے چھپتا پھرتا ہے۔ اب میدان خالی ہے۔ لیکن میں اس علاقے کے ایک ایک بچے کو آج یہ پیغام دے جاؤں گا کہ مرنے کے بعد بھی نتھو خاں کی روح اس علاقے پر ابھی صدیوں تک حکومت کرتی رہے گی۔ ٹانٹا نوالی کے باسیو! اپنے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو میں عبرت کا ایسا نمونہ بنا کر جاؤں گا کہ پھر کسی کو شمشیر نگر کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوگی۔

اس کی بات کے خاتمے پر دوسرے گھڑ سواروں میں سے ایک نے للکار کر کہا۔

پہنچا دیا گیا۔ فضل شاہ کے ٹیلی فونوں پر چہینے چلانے سے دوسرے دن صبح ہونے پر شہر سے آئی پولیس کی ریزرو فورس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر اپنی دانست میں بڑے جنگی پیمانے پر بلوموں کی گرفتاری کی کارروائی شروع کر دی تھی۔

حینت خان کا تو انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ البتہ شمشیر نگر کے قبرستان میں نتھو خاں کے پہلو میں بنی نذر محمد کی بیٹی کی قبر پر جس کی مٹی بھی ابھی پوری طرح نہیں خشک ہوئی تھی، پولیس کو نبرد ارعدین کے بھائی نیاز کے دونوں کے ٹھوٹے بازو مل گئے۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو زینب کی عزت کی طرف بڑھے تھے۔

اور —

جنہیں حینت خان نے تن سے الگ کر کے اُس کے قدموں میں لاکر ڈال دیا تھا !  
”واہ شیر دیا بچیا“

ایس اچھ اوچو ہدی حاکم علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اپنے سرکاری فرائض کے باوجود یہاں پہنچنے والے پولیس کے جوان دل ہی دل میں حینت خان کو جانے لگتی مرتبہ نذر عقیدت گزار چلے تھے۔ جس نے فضل شاہ جیسے موذی کی دشمنی مول لیتے ہوئے اور ضرور ہونے کے باوجود اپنی بے عزتی کا قرض تین روز بعد ہی چیکا دیا تھا۔

یہاں موجود اکثر پولیس والے اُس کے لئے اپنے دل میں بے پناہ احترام محسوس کر رہے تھے۔ کبھی وہ لوگ نتھو خاں کے متعلق بھی ایسے ہی جذبات رکھتے تھے۔

ننگرے کو پولیس نے شہر کے ایک تھانے سے برآمد کیا تھا۔ پولیس کے اپنے ریکارڈ کے مطابق وہ یہاں گزشتہ ۲۸ گھنٹے سے زیر حراست تھا۔ اُس پر شہر کے ایک سینما کے باہر دنگا فساد کرنے کا الزام تھا۔ پہلے دن پولیس نے اُس کی گرفتاری ڈالی تھی اور اگلے روز اُس کے خلاف پریچر درج کر کے اُسے جیو ڈیشیل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

یہ شمشیر نگر کے نبرد ارعدین کا کارنامہ تھا۔ !

باقی دونوں حملہ آوروں کی کوئی شناخت نہ کر سکا۔ جب مقامی ایس اچھ اوچو ہدی

حاکم علی جس نے حال ہی میں تھانے کا چارج سنبھالا تھا۔ ٹانامالوالی پہنچا تو یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کم ہو گئی کہ وہاں کا کوئی بھی مکین حملہ آوروں کی شناخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا!! حاکم علی اور فضل شاہ کے آدمیوں کے لاکھ سرپٹھنے اور دھمکیاں دینے کے باوجود کسی نے بھی اپنا بیان لکھوانے سے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً حاکم علی کو گناہ حملہ آوروں کے خلاف پریچر درج کرنا پڑا۔ اُس نے پولیس رپورٹ کے مطابق اس حملے میں حینت خاں کا ہاتھ ہونے کا شک جزو ظاہر کیا تھا۔

لیکن —

کوئی واقعی شہادت اُسے میسر نہیں آسکی تھی۔

پورے علاقے میں ایک مرتبہ پھر حینت خاں کی دمہنت پھیل گئی تھی —

کبھی اس طرح لوگ نتھو خاں کی کہانیاں اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے آج حینت خاں کا موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ نذر محمد نے یہ ساری کہانی اخبارات میں پڑھی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اس نوعیت کی کسی واردات پر خوشی ہوئی تھی۔

زینب کے اغوا اور بھرتل سے جو بوجھ سا اُس کے دل و دماغ پر اُن پڑا تھا وہ حینت خان نے ایک ہی پل میں اٹھا کر پرے رکھ دیا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ اب وہ بھی سمر اٹھا کر چل سکتا ہے۔ آٹھ دس روز بعد جب شمشیر نگر میں یہ خبر پہنچی کہ نذر محمد واپس آ گیا ہے اور حینت خان نے اپنی ساری جائیداد اُس کے نام منتقل کر دی ہے تو لوگ حیران رہ گئے۔

اب فضل شاہ کے پاس اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا کیونکہ حینت خان نے اپنی زمین جائیداد نبرد ارعدین کے ہاتھ فروخت کر دی تھی جس نے یہ جائیداد دوبارہ نذر محمد کو فروخت کی تھی۔ قانون میں جائیداد کے لین دین اور خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی ایسا کرنے والے پر کوئی گرفت ہو سکتی تھی۔ نذر محمد کی شمشیر نگر میں دوبارہ آمد فضل شاہ کے لیے نیک شگون نہیں تھا۔ دوسری طرف اُس نے سرداروں کے بدلتے ہوئے تیور بھی بھانپ لئے تھے۔ اُس کے گمراہ اور شیطانی ذہن نے اُسے سمجھایا کہ

جیسے یہ سب کچھ اُس کے خلاف کسی گہری سازش کا حصہ ہے اور اُسے یوں لگا جیسے حینف خان اور سرداروں کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ یہ بات تو اُسے جیل سے معلوم ہو چکی تھی کہ عالم داد سے سردار محمد رشید کی ملاقات کر دادی گئی ہے جس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں سادی برادری کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے عالم داد سے معافی مانگی تھی اور اُسے یقین دلایا تھا کہ آئندہ زندگی میں اُس سے کوئی اور گناہ تو سرزد ہو سکتا ہے۔

لیکن —

وہ فضل شاہ کے پکڑ میں کبھی نہیں آئے گا۔

نمبردار احمد دین خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ حالات پر اُس کی نظر تھی۔ جب اُس کے آدمیوں نے پلوال سے اطلاع دی کہ سردار رشید اور عالم داد میں صلح ہو گئی ہے تو اُس نے موقعہ عینیت جانا اور نذر محمد کو بھی مشورہ دیا کہ فوراً سرداروں سے رابطہ قائم کر کے حینف خان کی اُن کے ساتھ صلح کرانے کی کوشش کرے۔

احمد دین میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔ میری طرف سے تمہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں تم جو بھی چاہو کرو۔ میرے خیال سے جس طرح تم نے حینف خان کا ساتھ دیا ہے اُس کے باپ کی روح خوش ہو گئی ہوگی۔ اب بھی جو کچھ کرنا ہے تم ہی کو دو گے۔

نذر محمد نے سنجیدگی سے کہا۔

اُس نے یہ بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ ان حالات میں واقعی اگر انہیں اُمید کی کوئی کرن یہاں دکھائی دی تھی تو وہ احمد دین اور اُس کے لڑکے ہی تھے جنہوں نے جی جان سے اُن کا ساتھ دیا تھا اور انہیں اس قابل کیا تھا کہ اپنے باپ دادا کی زمین پر دوبارہ آباد ہوں۔

نذر محمد ایک بات تو بخوبی سمجھتا تھا کہ حینف خان کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو جائے وہ مکاری اور ریاکاری میں فضل شاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سرکار دربار میں فضل شاہ کے بزرگوں نے جو ساکھ بنا رکھی تھی وہ آج اُس کے کام آ رہی تھی اور اس محاذ پر حینف خان اُس کے مقابلے میں بالکل تہی دست تھا۔ اسے بہر حال سرداروں

کا تقاون درکار تھا جو کہ کسی حد تک تو اس معاملے میں اُس کی مدد کر سکتے تھے۔ نذر محمد کی شدید خواہش تھی کہ اُس سے پہلے کہ حینف خان کے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہو جائے کہ پھر کوئی مارنے کے علاوہ حکومت کے پاس کوئی چارہ ہی باقی نہ بچے وہ پولیس کے سامنے پیش ہو جائے۔ سردار رشید سے اگر بات بن جاتی تو وہ یہ کام ضرور کروا سکتا تھا کہ اُس کی زندگی کی ضمانت پر اُسے شہر میں کسی اعلیٰ پولیس افسر کے سامنے پیش کر دیتا۔!

حینف خان اس مرتبہ واپس لوٹا تو ایک اور حیرت اُس کی منتظر تھی۔ نذر محمد ہی ایک لڑکی کے ساتھ گھر پر موجود تھا۔

”یہ کون ہے؟“

اُس نے چھٹتے ہی دریافت کیا تھا۔

”میری بیوی۔“

نذیر نے بڑے اطمینان سے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ جاتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب ہے تمہارا — تم نے شادی کر لی کیا؟

حینف خان نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہاں — کیوں کیا میں شادی نہ کرنا؟“

نذیر نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”نہیں یار۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو اس بات پر حیران تھا کہ تم جیسے شخص کو بھی

بالآخر شادی کا خیال آ ہی گیا۔“

حینف خان نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔

اس کا دل یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

لیکن —

اس نے اس کا اظہار کرنا نذیر کے سامنے مناسب نہ جانا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ جو وہ کہہ رہا

ہو وہ سچ ہو۔ دس پندرہ دن بعد اسی کشمکش میں گزر گئے۔

اس درمیان حینف خان نے اسے گریزا نامناسب نہ سمجھا۔ اس نے بھی کبھی نذیر سے کوئی

اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ نذیرے کو صرف اس بات کا علم تھا کہ اس کی بیوی کا نام صغرا ہے اور وہ بچپن ہی سے اس کی میگزینر تھی دونوں کے درمیان ایک طرح یہ خاموش اور شریفانہ معاہدہ تھا کہ وہ کبھی ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہیں گے کیونکہ دونوں ہی پولیس کو مطلوب تھے اور کسی ایک کی گرفتاری سے دوسرا کیوں مصیبت میں پڑے۔

ایک بات حنیف خان نے البتہ خاص طور پر محسوس کی تھی کہ یہ عورت جسے نذیر اپنی بیوی کہتا تھا، اور تو سب کچھ ہو سکتی تھی۔

لیکن

کسی کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔

اس کی ہرادا اور بات ذومعنی ہوتی تھی۔ نذیرے کی غیر موجودگی میں کم از کم دو مرتبہ اس نے حنیف خان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

یہ الگ بات کے حنیف خان نے کبھی بھول کر بھی اس بات کا تصور نہیں کیا تھا کہ جو عورت نذیرے کی بیوی ہو وہ اس کے متعلق دل میں کبھی کوئی غلط گمان بھی لائے گا۔ اس کا بیٹا سات آٹھ ماہ کا ہونے کو آ رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ چاند دنوں کے لئے صغرا کو دوبارہ یہاں لے آئے کچھ روز تو وہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ ایسی عورت کی موجودگی میں صغرا کا یہاں آنا مناسب بھی رہے گا؟ چپ رہا۔

اب شدت سے اسے صغرا کی کمی محسوس ہونے لگی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہے وہ اسے یہاں لے آئے۔ اسے صغرا کے لپٹن سے ابھی اور بچوں کو بھی جہنم دینا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اکیلی سنسن بھی کبھی کبھی کتا بڑا المیہ بن جاتی ہے آج بے اختیار سو کر وہ اپنی بیوی کو واپس لینے جا رہا تھا۔

اس مرتبہ اس نے نگرے کے ذریعے اپنے گھر تک رسائی حاصل کی جو اب ضمانت پر آگیا تھا۔ پولیس نے اسے شامل تفتیش کر لیا تھا لیکن اس کے خلاف گواہی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضمانت ہو گئی تھی، پھر جو ثبوت وقوعہ کے وقت اس کے پولیس کی حراست میں ہونے کا موجود تھا۔ اس کے بعد سے تو مقامی تھانے کو اس کے خلاف کوئی ڈھنگ کی بات سوجھ بھی

نہیں رہی تھی۔ نگرے کے ڈیرے پر فیروز صغرا اور نذر محمد کو لے کر آگیا۔ ساری رات بحث کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے حنیف خان کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ وہ جنگ کا محاذ لبا کرنے کے بجائے چھوٹا کر دیں اور سرداروں کے ساتھ اگر باعزت صلح کے مواقع موجود ہوں تو صلح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حنیف خان نے یہ بات انہیں صاف طور پر کہہ دی تھی کہ فضل شاہ کو ٹھکانے لگانے بغیر وہ پولیس کو گرفتاری پیش نہیں کرے گا۔ اس سلسلے میں اس نے مزید بات چیت کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اب تم ہی برادری کے بڑے ہو۔“

بالآخر نذر محمد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ حنیف نے بیٹے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ لیکن۔

اس معصوم کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص جس نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس کا باپ بھی ہے۔ وہ اپنی ماں اور نانا ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ نذر محمد کے کہنے پر اس نے عابد کو اپنے نانا کے پاس ہی چھوڑ دیا۔

نگرا خود انہیں ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار کر دیا تھا۔ اس نے بھی حنیف خان کو یقین دلادیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی نذر محمد یا اس کا خاندان خود کو اکیلے محسوس نہیں کرے گا۔

حنیف خان گھر پہنچا تو نذیر اپنی بیوی سمیت غائب تھا اس نے اسی دوران صغرا کو بتا دیا تھا کہ نذیرے نے شادی کر لی ہے لیکن اس کے ماتھے ہی اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ نذیرے کی بیوی کو زیادہ مند رکھائے۔ کیونکہ یہ عورت اسے ایک نظر نہیں بھاتی تھی۔

نذیرے کی واپسی قریباً ایک ہفتے بعد ہوئی۔

لیکن

بیوی کے ساتھ نہیں، اکیلے! —  
 ”کہاں گئی تمہاری بیوی؟“ —

حنیف خان نے پوچھا۔

”بھاگ گئی سالی — بے وفائکی، خیر نہیں کیا کوئی اور کریں گے۔“

نذیر نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

اور —

حنیف خان کو ساری بات سمجھ آگئی۔ اس نے جان لیا کہ اس موذی نے ابھی تک اپنا پرانا دھندہ نہیں چھوڑا۔ آج بھی وہ مختلف شہروں سے عورتوں کو درغلا کر لاتا اور اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد انہیں آگے جسم فروشی کے کسی اڈے پر فروخت کر دیتا تھا۔

یہ بڑا مکروہ دھندہ تھا۔

حنیف خان کے لئے ایسے شخص کے ساتھ ایک منٹ کا ٹنا بھی صدیوں پر بھاری تھا یہ اس کی بے پناہ مجبوری تھی کہ وہ ایسے ذلیل اور گھٹیا شخص کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔

لیکن

اس مرتبہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس لعنت سے بھی اپنا پیچھا چھڑو لے گا۔ شاید حنیف خان اب تک یہ کبھی چکا ہوتا۔ لیکن نذیر نے اسے جس لائن کا چپکا گا دیا تھا۔ اور جس طرح معمولی سی محنت اور حاضر دماغی سے ان لوگوں نے آخری کامیاب ڈاکہ مارا تھا اس کے بعد سے تو نذیر اس کی کچھ زیادہ ہی مجبوری بن چکا تھا۔

اب اس کی بھی خواہش تھی۔ نذیر نے کی مدد سے ایک دو بے ہاتھ مار کر کسی دوسرے شہر میں کوئی مکان خرید کر آرام سے زندگی بسر کرے اور نذیر سے اپنی جان چھڑالے۔ وہ جانتا تھا کہ نذیر کو جس گندے کام کا چپکا ہے وہ اب اسے کبھی نہیں چھوڑے گا جب کہ حنیف خان کی یہ مجبوری تھی کہ اسے کچھ دنوں کے لئے ہی سہی صغرائے کو بھی اپنے ساتھ رکھنا ہوتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ گھور کر نذیر سے کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ جھی ہوئی تھی اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ گو کہ دونوں نے آج تک ایک دوسرے سے دریافت نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے لوٹ کے مال کا کیا استعمال کرتے ہیں

حنیف خان کا دل کہتا تھا کہ اس موذی نے کسی دوسرے شہر میں کوئی جائیداد ضرور بنا رکھی ہے اور اپنے پیسے بھی کسی بینک میں جمع کرواتا ہے اسے قوی امید تھی کہ ایک روز وہ خود ہی بھاگ جائے گا۔ لیکن خدا جانے نذیر کس مٹی کا بنا تھا۔ یا پھر کون سی ایسی مجبوری تھی جس نے اسے ابھی تک حنیف خان سے ہانڈھ رکھا تھا۔

پانچ چھ روز بعد ایک دن حنیف خان نے خود ہی اس سے پوچھ لیا۔

”کوئی نئی آسامی نہیں دیکھی؟“

”حنیف یار! اس مرتبہ تجھے ایسا ہاتھ مرواؤں گا کہ ساری زندگی نذیر کے کوہا د کرے گا۔“  
 ”کر ڈوں کا مال ہے کر ڈوں کا۔“  
 ”بس یوں سمجھنا کہ تمہاری زندگی کا آخری ڈاکہ ہو گا۔ جس کے بعد تم خود اتنے بڑے سیٹھ بن جاؤ گے تمہیں اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔“

اس نے بڑی رازداری سے کہا۔

آٹھ دس روز بعد ایک دن اس نے حنیف خان کو ساری واردات سمجھا دی۔

اس مرتبہ اس نے یہاں سے قریباً ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر ایک دوسرے شہر میں ایک موٹی آسامی دیکھی تھی۔ یہ شہر کی صرفہ انجن کے صدر کا گھر تھا جس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور جس کے پاس نذیر نے کی اطلاع کے مطابق سونے کی کئی آئینیں موجود تھیں۔ اس نے گھر کے ایک نوکر کو جو کبھی کسی طوائف کے کوٹھے پر کام کرتے ہوئے نذیر کے بار دوست بن گیا تھا۔ اعتماد میں لے کر تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔

یہ بڑا عیاش آدمی تھا۔

”کل رات کو سال بڑے شہر میں طوائفوں کی ایک تقریب میں شرکت کرنے جا رہا ہے اسے

رد دار آواز سن کر وہ بھی اپنے کمروں سے باہر آگئے اور یہ تین مرد اور دو تین عورتیں عینیں بنادیں  
بڑے کو اس مرتبہ غلط اطلاعات ملی عینیں اور یہاں گھر میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔

دو آدمی جو بڑے عینے میں تھے سیدھا چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف آئے۔  
حنیف خاں نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو اسے اور کچھ نہ سوچنا اس نے اچانک  
لوٹھی کا دروازہ کھولا اور باہر دوڑ لگا دی۔

لیکن —

اب خاصی دیر ہو چکی تھی گھر کے مکینوں نے ”چور چور“ کے شور سے آسمان سر پر اٹھایا۔  
شاید یہ کوئی مختلف قسم کی کالونی تھی، جہاں اس شور پر دوسرے گھروں کے دروازے بھی کھلنے  
لگے۔ جو لوگ سیٹھ کے گھر آئے تھے انہوں نے جب حنیف خاں کو بھاگتے دیکھا اور اس کے  
لقاب میں ”چور، چور“ کی آوازیں بھی سنیں تو اپنی گاڑی اس کے پیچھے دوڑا دی۔

حنیف خاں کی مزید قسمتی یہ ہوئی کہ بھاگتے ہوئے اس نے اپنی ٹولوار میں جو پستول  
چھپایا ہوا تھا وہ بھی راستے میں کہیں گر پڑا  
وہ ٹرک پر منہ اٹھائے بھاگ رہا تھا۔ جب کالونی کی ایک ٹرک سے نکلنے والے سکوپر  
سے اچانک ٹکر کر گیا اور پھر اسے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

کار سوار اس کے سر پر پہنچ چکے تھے  
سکوپر سوار بھی کوئی اتھلیٹ دکھائی دیتا تھا اور کالونی کے تین چوکیدار لگتے تھے ان  
سب نے زمین پر گرے حنیف خاں کا مار مار کر بھر کس نکال دیا

حنیف خاں کو تو شاید وہ جان ہی سے مار ڈالتے کیونکہ اس علاقے کا شاید ہی کوئی  
ایسا گھر تھا جس کا چوروں نے صفایا نہ کیا ہو۔ یہاں کا ہر مکین چوروں کا ڈسا ہوا تھا۔

وہ لوگ اپنا سارا خضہ حنیف خاں پر ہی نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔  
پولیس کی گشتی جیپ کے حوالدار نے ہوا میں تین چار گولیاں چلا کر لوگوں کو خوفزدہ کیا  
اور پھر اوہ موے حنیف خاں کو تھکڑی لگا کر اپنی جیپ میں ڈال کر تھانے لے آئے۔

کنیروں میں چودھرا بٹ جمانے کا بڑا شوق ہے اور وہ بھی اپنی کوئی تقریب اس کے بغیر نہیں کرتے  
گھر پرائس کی موٹی بیوی اور ایک آدھ سالہ بچہ گائے گا جس کو قافلو کرنا تمہارے لئے کچھ مشکل  
نہیں ہوگا —

اس نے بالآخر ایک روز اس سے کہہ ہی دیا۔ اس دن دونوں دوسرے شہر کی طرف  
چل دیے۔ محمود آباد وہ دوپہر کے وقت پہنچے تھے۔ دوپہر ہی کو نذیرا سے سیٹھ کے گھر تک لے  
گیا جو ایک ماڈرن آبادی کے عین وسط میں بنا ہوا تھا۔

گھر کے دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

حنیف خاں نے چاروں طرف گھوم پھر کر صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ذہن میں  
ایک منصوبہ بنا لیا تھا اور اسی رات کو انہیں اس منصوبے کے مطابق کام کرنا تھا۔ اس نے اس مرتبہ  
حالات کی نزاکت کے پیش نظر مکان کے اندرونی حصے میں خود گھسنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ ممکنہ  
مقابلے کی صورت میں نذیرا کچھ نہیں کر سکتا تھا جس کے یہاں امکانات موجود تھے —

اس مرتبہ اس نے نذیرے کو سائیکل پر گیسٹ کے نزدیک کھڑے رہنے کی ہدایت  
کی تھی۔ وہ سائیکل کے ذریعے اس علاقے سے نوکروں کے روپ میں آسانی باہر نکل سکتے  
تھے یہاں کسی تعاقب کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

گھر میں داخل ہونے کا مرحلہ اس نے آسانی سے طے کر لیا تھا۔ گھر کے بڑے دروازے  
سے ٹلحہ ایک پھوٹی ٹیسی کوٹھڑی میں اس نے چوکیدار کو قافلو کر کے پھینک دیا تھا۔

عین ان لمحات میں جب وہ مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک ایک  
مصیبت اس کے سر پر آن پڑی۔

شاید یہ سیٹھ کے کوئی رشتہ دار تھے جو رات دیر گئے کسی کام سے اس طرف آئے تھے۔  
انہوں نے اطلاعی گھنٹی بجانا شروع کر دی۔

گھر کے چوکیدار کو تو اس نے ہاندھ کر کوٹھڑی میں پھینک دیا تھا۔ اب دروازہ کون کھولا  
دوسری طرف جو مہان آئے تھے وہ شاید کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھے کیونکہ اب تک چوکیدار  
کا دروازہ نہ کھولنا انہیں کھلنے لگا تھا۔ پہلے تو گھر کے مکین خاموش رہے لیکن مسلسل گھنٹی کی

ایک برعکس اور چور ہونے کے ناطے حنیف خان کے لئے پولیس کی گرفت میں آنا تو کوئی نئی یا اچھٹے والی بات نہیں تھی۔

لیکن —

اس کا دل بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ اس مرتبہ نذیر نے اس سے دھوکہ کیا ہے۔ کہیں اب تو نہیں کہ گذشتہ چوری میں ملنے والے ہیرے جواہرات کے زیورات ابھی تک اسی کے قبضے میں تھے۔ کیونکہ اس نے حنیف خان سے کہا تھا کہ وہ انہیں کسی دوسرے شہر میں کچھ عرصے بعد اچھے داموں فروخت کروادے گا۔

حنیف خان بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ ایسے زیورات کا مقامی ساروں کے پاس فروخت کرنا تو انہیں مشکوک کہا جاسکتا تھا۔ یوں بھی پولیس چوکس تھی اور ممکن ہے اس نے ساروں کی دوکان پر نظر بھی رکھی ہو۔

یوں بھی اس کی شہروں میں کچھ ایسی واقفیت نہ تھی۔ اپنی موجودہ حیثیت میں وہ مشتبہ حالت میں زیادہ گھومنا پھرتا اور زیر زمین دنیا کے ہاسیوں سے رابطہ رکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ ڈیڑھ دو لاکھ مالیت کے وہ زیورات ہی دراصل اس کی گرفتاری کا باعث بنے ہیں اور نذیر نے اس مرتبہ اس کے ساتھ بے ایمانی کر کے اسے ایک ایسے گھر میں داخل کر دیا جہاں سے اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا — !

شاید یہی وجہ تھی کہ اس مرتبہ اس نے حنیف خان کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہونے پر پکچھا ہٹ دکھائی تھی۔

لیکن —

تب حنیف خان نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب جبکہ وہ پولیس کے تنگے میں جکڑا جا چکا تھا تو اسے نذیر نے کی ایک ایک حرکت پر تنگ ہونے لگا تھا۔ — !!

لیکن اب سوائے کھچتا دے کے اس کے پاس رہ بھی کیا گیا تھا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جگائے بھاگتے پتوں گر گیا ورنہ اس کے ہاتھوں سے کوئی قتل

بھی ہو جاتا اور پولیس بھی اسے نہ چھوڑتی۔

اب کم از کم اس کے پاس کوئی شناخت ایسی نہیں تھی جو اس کی اصلیت بتا سکتی —  
 ”لو بیٹا حنیف خان اب ذرا قائم رہنا۔ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے،“

اس نے دل ہی دل میں کہا اور فوراً ایک منصوبہ اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس کے باپ نے اسے ایک ہی تربیت دی تھی۔ کہ پولیس کے قابو آنے کے بعد کبھی اپنے جرم کا اقرار نہ کرنا خواہ اس کی کتنی ہی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے۔

پولیس والوں نے اس کی تلاشی اچھی طرح کر لی تھی لیکن سوائے چند سو روپے کے اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔

صبح جب اس کی حالت درجے سنھلی تو پولیس اس کے سر پر سوار ہو گئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”کیا کرنے آئے تھے؟“

وہ لوگ اس سے مختلف سوالات کر رہے تھے۔

لیکن —

حنیف خان جواب میں ان کی شکلیں ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔

اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا۔

عجیب عجیب حرکتیں کر کے انہیں یہ ہادر کروا رہا تھا کہ اس کا تو ذہنی توازن ہی ٹھیک

نہیں ہے۔

”اچھا سالے ایکٹنگ کرتا ہے — ابھی دیکھتا ہوں تجھے — بڑے دیکھے ہیں تیرے

جیسے — اگر طوطی کی طرح نہ بولنے لگا تو کبھی دینا،“

ایک لمبے ٹرنگے پولیس انسپکٹر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

”لے سے ذرا لمبا کروادئے —“

اس نے اپنے جواؤں کو حکم دیا۔ جنہوں نے پک بھپکتے ہی اس کو زمین پر لاندھے منہ لٹا دیا۔



دو پولیس والے اس کے بازوؤں پر اور دو اس کی ٹانگوں پر بیٹھ گئے۔ جبکہ پانچویں نے اس کی کمر پر دھیان ڈنڈے برساتے شروع کر دیئے۔

لیکن

کیا مجال کہ اس کی حالت بدلی ہو۔ وہ بدستور پانچوں کی طرح چیختا چلاتا رہا۔ شام تک پولیس والوں نے اپنی دانست میں اس پر بڑے خطرناک تھرڈ ڈگری طریقے استعمال کر لئے تھے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

یہ سلسلہ آٹھ دس روز چلتا رہا۔

اس درمیان پولیس نے اس کا ریمانڈ بھی لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی ایسا غیر انسانی طریقہ نہیں چھوڑا تھا جو حنیف خاں پر نہ اپنالیا ہو۔

لیکن

کیا مجال جو اس کے پائے ثنات میں لغزش آئی ہو۔ اس کے بدن کی ہڈیاں صرزد سلامت رہ گئی تھیں۔ جہاں بہت جسم کا تعلق تھا اس کے ایک ایک اٹیچ پر پولیس تشدد کے نشانات پڑ چکے تھے۔

پندرہ روز تک پولیس اور سی آئی اے سٹاف والے اس سے مغز ماری کرتے رہے۔ اس درمیان اس کے جسم پر سوائے سُرخ سُرخ آنکھوں کے اور کچھ سلامت نہیں رہا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہے یا کسی فولاد کا بنا ہوا جسم۔ جس پر کوئی بھی ضرب اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے اب واقعی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ یہ پاگل ہے یا پھر اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔

ابھی تک انہیں حنیف خاں نے اپنا کوئی نام بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ ہر وقت اول فول بکتا رہتا۔ منہ ہی منہ میں جائے کیا بڑبڑاتا رہتا۔

لیکن

ان کے کسی سوال پر وہ چونکتا بھی نہیں تھا۔

دو مہینے تک پولیس والوں نے اسے اپنے پاس رکھا۔ اس درمیان وہ اس سے مختلف

خدمات لیتے رہے۔ کبھی کوئی اپنی مالش کر دیتا۔ کبھی اس سے صفائی کر دیتے اور کبھی جوتے پالش کر دیتے۔ تقریباً تین ماہ بعد بالآخر پولیس والوں نے اس پر آوارہ گردی کا مقدمہ کر کے اس کا اپنی طرف سے محمد شریف دلرشتا ق احمد نام رکھ کر اسے جیل بھیج کر اپنی جان چھڑالی۔

○

جیل پہنچ کر حنیف نے سکھ کا سانس مزور لیا تھا۔

لیکن

اس کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ صرف ایک سوال کا جواب دینے لگا تھا اور وہ سوال تھا۔ تمہارا نام کیا ہے جس کے جواب میں وہ پہلے تو پانچوں کی طرح زوردار قہقہہ لگاتا پھر سوال کرنے والے کو چرلانے کے انداز میں کہتا محمد شریف۔ اور بس۔

اس سے آگے وہ کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔

البتہ روٹی وہ معمول کے مطابق کھاتا رہا۔ اسی درمیان اسی کو ”سائیں لوگ“ سمجھ کر کچھ قیدی ڈنڈوئی کر کے اس کی مدد بھی کرنے لگے۔ کسی نے اسے تیل دے دیا اور کسی نے کبھی کچھ کھانے کو دے دیا۔ سگریٹ بیٹری وہ پتیا نہیں تھا نہ ہی ان لوگوں نے اس طرف توجہ دی۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے۔ ایک دن جیل کے نائی کو سکی حالت پر رحم آگیا اور اس نے حنیف خاں کا سارا سر مونڈ دیا۔

دو تین قیدیوں نے زبردستی اسکے جسم پر صابن مل کر اسے نہلا دیا۔ دو تین نے اس کے بدن پر تیل کی مالش کر دی۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو اسے کوئی ”سینچا ہوا بزرگ“ سمجھ کر اس کی سیوا میں بچتے ہوئے تھے۔

اسے جس بیک میں رکھا گیا تھا۔ وہاں زیادہ دفعہ ۳۰۲ کے حوالاتی تھے جو قتل کے الزام میں جیل آئے ہوئے تھے۔

حنیف خاں کی خوش قسمتی تھی کہ جس شخص کے دماغ پر سب سے پہلے اس کے ”سائیں“ ہونے کا بھوت سوار ہوا اور اس نے حنیف خاں کی ٹہل سیوا شروع کی وہ ایک ہفتے بعد ہی تقدیر بھری ہو گیا۔ جسے اس نے خالصتاً ”سائیں جی“ کی دعاؤں کا کرشمہ جانا۔ اس نے ساری بیک کو

بنادیا تھا کہ اگر انہوں نے بری ہونا ہے تو بابا شریف سائیں، کی خدمت کریں۔

اور —

وہاں اس کی خدمت کرنے کیلئے حوالاتیوں نے ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے حنیف خاں کے کپڑے تبدیل کر دئیے، اس کے لئے تین نئے جوڑے بن کر آگئے۔

وہ ان ملازموں کو دن رات گالیاں نکالتا، دھکتے دیتا اور ایک آدھ کو پھٹڑ بھی رسید کرتا لیکن یہ لوگ اس کی گالیوں کو مار کو بھی عطیہ خداوندی جان کر قبول کر لیتے۔ وہ اسے بھی بابا جی کی کوئی ادا سمجھتے اور یہی گمان کرتے کہ بابا جی ان پر مہربان ہونے والے ہیں۔

”بابا شریف سائیں“ کی اب جیل کے ملازمین بھی عزت کرنے لگے تھے اور اکثر اپنی ترقی کے لئے اس سے دعا کی التجا کرتے تھے۔

جب میں بابا شریف سائیں انہیں ماں بہن کی گالیاں دیتا جس کا مطلب یہی لیتے کہ سائیں جی نے ان کی بات مان لی ہے اور اب ان کا کام ہو جائے گا۔

حنیف خاں دل ہی دل میں اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سمارتا تھا۔ اس کا حلیہ گو کہ بہت بدل چکا تھا لیکن ایک خوف اسے ہمیشہ دامنگیر رہا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے۔

ایک روز بالا خراس کی ”پیتیا“ رنگ لے ہی آئی۔ جب جیل خانہ جات کے آئی جی صاحب نے ایک غیر ملکی وفد کے ساتھ جیل کا دورہ کیا اور معمولی جرائم میں جیلوں میں بند قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا تو آئی جی صاحب نے چار ماہ سے جیل میں بند اس بے گناہ اور پائل شخص کی رہائی کے احکامات بھی جاری کر دئیے۔

قریباً سات ماہ کی جان توڑا ذیتیں برداشت کرنے کے بعد وہ بالا خراجیل کے دروازے سے باہر آ گیا تھا۔ جیل کے باہر آنے ہی اس نے پھر یا گلوں کی سی حرکات شروع کر دیں اور ناچنے لگانا چتے ناچتے وہ اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور دتین میل تک بھاگتا چلا گیا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تو اپنی نارمل حالت پر واپس لوٹ آیا۔

اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑا طویل راستہ اختیار کیا تھا۔

صبح کا جیل سے نکلا وہ شام ڈھلنے پر گھر پہنچا تھا۔

لیکن —

گھر کے دروازے پر کچھ اجنبی لوگ دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا شاید یہ نذیرے کے کوئی ملنے ملانے والے ہوں گے اس نے سوچا اور اطمینان سے ان کے نزدیک پہنچ گیا

”کیا بات ہے بابا جی“

ان میں سے ایک نے اس کی لمبی ڈاڑھی اور چیلے کو دیکھ کر کہا۔

”یہاں نذیر نامی ایک نوجوان رہتا ہے“

اس نے پوچھا۔

”گزشتہ پانچ ماہ سے تو ہم یہاں رہ رہے۔ اس سے پہلے کوئی اور کر لے دار تھا لیکن نذیر

تو نہیں وہ تو کوئی میر صاحب تھے۔ بابا جی آپ نام تو نہیں بھول رہے“

اس نوجوان نے کہا۔

حنیف خاں کو دھچکا سا لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نذیر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا ہے لیکن

صغراں — وہ کہاں گئی؟

اس نے محلے والوں سے پوچھنا مناسب نہ جانا اور نزدیکی چلنے کے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

وہ کیا حال ہے بھائی صدیق — کیا بات ہے بڑے صوفی بن گئے ہو بھئی — جب سے

اس علاقے سے گئے ہوا اس طرف کا پکڑ بھی نہیں لگایا کوئی غلطی ہو گئی ہم سے“

چائے کے ہوٹل کے مالک نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔

”نہیں غلام علی یارس اب زندگی ہی ایسی ہو گئی ہے جب سے بابا جی کے بیعت ہوئے

ہیں کہیں جانا ہی نہیں ہوتا“

اس نے غلام علی کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے کہا۔

حنیف خان نے یہاں سے چائے پی تو ہوٹل کے مالک نے پیسے لینے سے انکار کر دیا

اس کے پاس جیل میں ملنے والے نذرانوں سے کچھ پیسے ابھی تک باقی تھے جو اس نے سنبھال

کر رکھ لئے تھے۔ غلام علی کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر آگیا۔

» عین ممکن ہے نذیرے نے اس کی گرفتاری سے خوفزدہ ہو کر راہ فرار اختیار کر لی ہو اور اس کی بیوی بھی اپنے میکے شمشیر نگر واپس لوٹ گئی ہو۔ کیونکہ نذیر کو یہی گمان ہو گا کہ جب پولیس حنیف خان پر تشدد کرے گی تو وہ اس کا نام بھی لے دے گا،  
تب حنیف خان نے بھی یہی سوچا تھا۔

اور

یہی سوچ کے وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ !

اس نے اپنے گھر جانے کی بجائے نمرود احمد دین کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ !  
» حنیف خان۔ اُدے تو کہاں چلا گیا تھا یار۔ اتنا لمبا انتظار کروایا تو نے۔  
تو کتنا ظالم نکلا۔ ہمیں خبر تک نہ دی تو نے۔ «

دروازے سے باہر آ کر فیروز اس کے ساتھ یوں بغل گیر ہوا تھا جیسے پچھلے کئی جنموں سے اس کا منتظر رہا ہو۔

» کیا حال ہے گھر بار کا۔ «

اس نے چُھٹتے ہی سوال کیا۔

» سب ٹھیک ہیں۔ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں حنیف خان۔ سردار صلح کے لئے تیار ہیں اور فضل شاہ تو سنے گا تو حیران رہ جائے گا۔ فضل شاہ سے قدرت نے خود انتقام لے لیا ہے اس کے گردے نیل ہو چکے ہیں۔ حنیف خان وہ زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ «  
فیروز اسے ہتھیاری سے ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔

لیکن

جو وہ سنا چاہتا تھا۔ وہ بات فیروز کی زبان پر نہ آسکی۔ نہ ہی ماما نذر محمد نے جو تھوڑی دیر بعد وہاں آگیا تھا کہی۔

صغراں یہاں نہیں تھی؟

کہاں گئی۔ اس کی صغراں؟ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکھنے کا احساس ہوا۔ چاچا احمد دین

نے نگرے کی طرف آدمی بھیج دیا تھا۔ جس نے بڑی منت سماجت کی تھی کہ جب بھی حنیف خان آئے وہ اسے ضرور ملائیں۔

رات ڈھلنے بہت نکر بھی وہاں آگیا۔ اس کا رواں رواں حنیف خان کا احسان مند تھا۔

لیکن

حنیف عالم ہوش میں تھا، ہی کہاں۔

اس کی حالت زخمی چیتے کی طرح تھی جسے کسی شکاری نے ایک گہری ضرب لگا کر تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔

صغراں کی جُڑائی کے غم نے اس کو باؤلا کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ صغراں خود کہیں نہیں جاسکتی۔ ضرور اس موذی نذیرے نے ہی اس کے ساتھ

کوئی گھناؤنا کھیل کھیلا ہے اور عین ممکن ہے اسے جرم و گناہ کی دنیا میں دھکیل دیا ہو؟

اس سے آگے سوچنے کی اس میں سکت نہیں تھی اس کی سوچیں محمد ہو کر رہ جاتی تھیں

نذیرے کو وہ کہاں تلاش کرے؟

اس سوال کا اسے بار بار ایک ہی جواب شہ ربا تھا کہ وہ کبھی شہر کے کسی نہ کسی بازار حسن میں

ضرور ملے گا۔ اُسے اس گندے کام کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ اب اس کے لئے اس سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

حنیف خان نے سختی مرتبہ جی بھر کر اپنے بیٹے کو دکھیا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔

اسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہر دفعہ جب وہ اپنے گاؤں سے واپس جاتا تو پہلے سے

پتلاں کردہ راستے پر ہی سفر کیا کرتا تھا۔

لیکن

آج سچا نے کیوں اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاقت رکھ دی تھیں۔

فیروز نے زبردستی اسے کچھ روپے دے دیئے تھے کہ وقت آنے پر واپس لوٹا دے اس

نے بھی نذر محمد کی طرح اس کی بہت منت سماجت کی تھی کہ حنیف خان پولیس کے سامنے پیش ہو جائے۔

کر دیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں تھی؟

لیکن

اگر وہ زندہ تھا تو اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ حنیف خاں کے پاس —

”ماما — اپنی بیوی کے بغیر اپنے گھر جاتے ہوئے میں کیا اچھا لگوں گا — کیا

اجواب دوں گا برادری کو، جب وہ پوچھیں گے صغراں کہاں ہے؟ کیا تباؤں کا انہیں؟ کیا تمہاری

غیرت برداشت کر لے گی — نہیں ماما — میں نامرد ہو کر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں جی

سکتا — میں صغراں کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ نہیں تو خود بھی واپس نہیں لوٹوں گا۔

یہ تھی وہ آخری بات جو اس نے روانگی سے پہلے کہی تھی اس کی ان باتوں کا نذر محمد یا

احمد دین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

احمد دین نے اس سے کہا تھا کہ وہ اکیلا صغراں کو کہاں ڈھونڈھے گا اپنے ساتھ ہی کسی کو لے جائے

لیکن

اس نے یہ پیش کش بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”میرے باپ نے مجھے ساری زندگی کیلئے اپنی جنگ لڑنا سکھایا ہے چاچا — یہ میری

رٹائی ہے۔ مجھ ہی کو لڑنی ہوگی۔ کوئی اور درمیان میں کیوں آئے۔

اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

”فیروز تم نے جس طرح میرا گھر بار سنبھالا ہے اگر زندہ رہا تو اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں

گا بس میری ایک خواہش ضرور پوری کرنا کہ میرے بیٹے کو اپنے باپ دادا کے راستے پر نہ چلنے دینا

اسے تعلیم دلانا میری خواہش ہے کہ وہ اچھا انسان بنے،“

اور

وہ چلا گیا۔

حنیف خاں نے ڈیڑھ سال ملک کے ہر بازار حسن کی خاک چھاننے میں گزار دیئے —

اس درمیان اسے دو مرتبہ صرف اس بات کا علم کہ نذیرا موچی فلاں جگہ دکھایا گیا۔

اس نے حنیف خاں سے کہا تھا کہ فضل شاہ قدرت کے انتقام کی گرفت میں آچکا ہے اس

کے بچکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے گردے کا کارہ ہو چکے ہیں —

نذر محمد نے اسے بتایا تھا کہ اس خاندان میں زیادہ لوگ اس بیماری سے مرتے ہیں یہ عیاش

طبع ورنہ اپنی جوتانی تسکین کے لئے سونے چاندی کے کتے کھاتے ہیں اور ان کے گردے جو پہلے

ہی شراب کے بے تحاشا استعمال اور زنا کاری سے خستہ حال ہو چکے ہوتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں

اسی طرح فضل شاہ کا باپ مرا تھا اور اس بیماری نے اس کے دادا کی جان لی تھی —

نذر محمد نے کہا تھا —

”اگر ریاست شاہ گولی سے نہ مارا جاتا تو اس بیماری سے مرنا —“

میں ممکن تھا کہ جس طرح قدرت نے حالات کو اس کے حق میں ہموار کیا تھا۔ حنیف خاں پیش

ہو جاتا۔ کیونکہ اب فضل شاہ کی بیماری کے بعد اس علاقے کی سب سے بڑی سیاسی قوت سردار تھے۔

سرداروں کو اس بات کا بجز بی اندازہ تھا کہ حنیف خاں کی دشمنی سے زیادہ دوستی ان کے لئے

بہتر ہو سکتی ہے۔

”پلوال“ کی طرف سے نذر محمد تک پہنچ چکا تھا اور اس کی طرف سے اشارہ ہونے

پر علاقہ کے تین معززین نے اپنی ضمانت پر دونوں کی ملاقات کا اہتمام بھی کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔

لیکن

حنیف خاں کو اس وقت مولے صغراں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اگر نذیرے نے اس کا مال کھایا ہوتا تو وہ اسے معاف کر دیتا کیونکہ راتوں رات دولت

حاصل کر لینا اس کے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

اس نے تو حنیف خاں کو زندہ درگوبہ کر دیا تھا۔

وہ اپنی اگلی زندگی صغراں کے بغیر بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وفا کی اس دیوی نے

موت کی دھار پر چلتے ہوئے اس کا ساتھ نبھایا تھا۔ اس کی جان پر جو بھی عذاب آیا ہوا اس کا

سبب حنیف خاں ہی تھا۔ وہ خود نذیرے سے نہیں ملی تھی۔

یہ حنیف خاں تھا جس نے نذیرے کا تعارف اس سے ایک قابل اعتماد ساتھی کی حیثیت سے

اس نے کسی فطری عمل کے تابع اس لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا  
 دراپنا یا رہے۔ خوش کردینا اسے — معمولی آدمی نہیں،،  
 دلال نے اسی عورت کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی،

عورت چپ چاپ اس کے ساتھ ملحقہ مکان کے اس کمرے میں آگئی جہاں اسے معمول  
 کے مطابق لایا جانا تھا

”تمہارا نام کیا ہے؟“

حنیف خاں نے تنہائی پاتے ہی اس سے دریا فت کیا۔

چھوڑو حنیف خاں۔ نام میں کیا رکھا ہے — تمہاری بیوی کا بھی کوئی نام تھا۔  
 لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اپنے پیسے پورے کرو۔

حنیف خاں کو ایسے لگا جیسے اچانک اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھیڑ لیا ہو۔

ایک زوردار جھٹکے نے اسے ایک دم سے عبولی کہانی یاد دلادی —  
 یہ شرفیاں تھی —

وہی عورت جسے ندیرا اپنی بیوی بنا کر لایا تھا اور جسے اس نے حنیف خاں کی توقعات  
 کے مطابق بازا حسن میں فروخت کر دیا تھا۔

”کہاں ہے صفراں؟“

اس نے وحشیانہ انداز سے شرفیاں کا ہاتھ اپنے ماتھ میں پکڑتے ہوئے اسے اتنی زور سے جھنجھوڑا  
 شرفیاں کی آنکھیں ابل پڑیں۔

اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

قریباً ایک منٹ اسے اپنی حالت کو نارمل کرنے میں لگا جس کے بعد اس نے دو چار لمبے  
 نانس لئے اور حنیف خاں کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا

”مار ڈالو مجھے — میں تو یوں بھی زندہ نہیں ہوں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جسم کی زندگی کو زندہ رہنا  
 لبتے ہیں تو ٹھیک ہے — لیکن اس سے تم صفراں کو نہیں مل سکو گے — حنیف صفراں  
 سے ملنے کے لئے مجھے نہیں۔ تمہیں مزنا پڑے گا — وہ میرے جیسی فاحشہ اور بے غیرت عورت

لیکن —

اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔

اُس نے اپنے گھردالوں سے کوئی رابطہ تو نہیں کیا۔ لیکن اپنے گھریلو حالات سے بے خبر بھی نہیں  
 رہا۔ اس کی روانگی کے دو ماہ بعد ہی فضل شاہ گردے فیل ہونے سے مر گیا — اب شاہ پور  
 میں سرداری پھر سے ریاست شاہ کی تیسری بیوی کے پہلو ٹھکی کے بیٹے عامل شاہ کے ہاتھ آگئی تھی  
 لیکن عامل شاہ کو سب سے زیادہ عورتوں اور شراب میں دلچسپی تھی۔ ابھی تک اس نے الیکشن لڑنے  
 کا باقاعدہ اعلان یا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے اس کا دل کبھی بے اختیار مچلتا۔  
 لیکن —

وہ بادل نخواستہ اپنی اس خواہش کو دبائے رکھتا۔ صفراں کے غائب ہونے کے بعد سے  
 اُسے خود سے اپنے پیشے سے نفرت سی ہوگئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا منحوس سایہ اس کے بیٹے پر نہ پڑے  
 تاکہ وہ الگ قسم کے ماحول ہی میں پرورش پائے۔

اس نے زیر زمین دنیا میں روابط بنا لئے تھے۔

اب اسے ایک اور آسان دھندہ مل گیا تھا وہ ”مال“ ادھر سے ادھر لے جاتا۔ اپنا حصہ وصول  
 کرتا اور غائب ہو جاتا۔ کبھی ایک جگہ وہ ٹمک کر نہیں بیٹھا تھا۔

اپنی صفراں کو ڈھونڈنے کے لئے اس نے بڑے کوٹھوں کی خاک چھانی تھی آج بھی وہ ملک  
 کے دوسرے بڑے شہروں کے ایک قصبہ خانے میں ایک دلال کے ساتھ جا رہا تھا۔

ایک نیم روشن کمرے میں لوکیوں کو بکاؤ مال کی طرح قطار میں بٹھایا گیا تھا جب اچانک  
 ایک چہرے پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔

اُسے یاد آ رہا تھا کہ یہ چہرہ اس کا شناسا ہے وہ ضرور اس سے کہیں مل چکا ہے۔

لیکن کہاں؟

یہ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

”وہ لڑکی“

نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر سے کسی یار کے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی تھی۔ اسی لئے تو مر گئی۔  
 اسی نے تو اس بازار میں آنے کے سات اٹھ روز بعد ہی تیسری منزل سے پھلانگ لگا کر جان دیدی  
 تھی۔ لیکن تم اسے ضرور مار ڈالو جس نے میری جیسی جانے کتنی لڑکیوں کو درد غلا کر آج جسم  
 فروش فاحشائیں بنا ڈالا ہے۔ حنیف! تیری غیرت کو کسی اور نے نہیں، تیرے یار نذیر  
 موچی نے داؤ پر لگایا تھا۔ وہ اسے بھی اس کوٹھے پر فروخت کرنے لایا تھا۔ میں تو  
 اسے کبھی نہ پہچان پاتی، لیکن جب وہ تمہارا نام لے کر اور چیخ مچا کر کہا کرتی تھی کہ نذیر سے حنیف خان  
 میرا بدلہ لے گا۔ تو مجھے علم ہوا کہ وہ کون ہے،

اس کا سانس زور سے چل رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور بولی۔

”حنیف خان مجھے صغراں نے بتایا تھا کہ وہ موذی اسے تمہاری پولیس کے ہاتھوں گرفتاری  
 کی خبر سنا کر بوکھلائی ہوئی حالت میں گھر سے باہر لے آیا تھا۔ اس نے صغراں سے یہی کہا تھا  
 کہ وہ اسے گاؤں پہنچا دے گا۔ لیکن فوراً گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پھر وہ صغراں کو  
 اپنی ایک رشتہ دار عورت کے گھر لے آیا۔ تم جان سکتے ہو کہ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ اس  
 بازار کی مشہور نانکھ رکھی بائی۔ مرگئی حرام زادی۔ اس کے جسم سے ایسے بدلے کے پھونکے  
 اٹھ رہے تھے۔ اور گھروالوں نے اٹھا کر خیراتی ہسپتال میں پھینک دیا۔ وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر  
 گئی۔“

اسے موقع ملا تو وہ مکان کی چھت سے کود کر مر گئی۔ کسی کو کاؤن کاں خبر نہ ہو سکی  
 ان لوگوں نے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ختم کر دیا۔ خدا جانے اس بے چاری کو کفن بھی نصیب ہوا  
 یا نہیں۔ خدا جانے۔“

جیسے جیسے وہ بول رہی تھی۔ حنیف خان کو اپنے دل میں تیز دھار بھالا اترنے کا احساس  
 ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نادیدہ طاقت نے اسے اندر سے کاٹنا شروع کر دیا ہو۔  
 اس کے حلق میں ایک پھانسی سی اٹک کر رہ گئی۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں  
 نے اچانک ہی آنسوؤں کے دریا بہا دیئے تھے۔

اس کی ڈاڑھی ان آنسوؤں سے بیگم جلی تھی۔

”حنیف خاں۔۔۔ یہاں سے نہ جانا۔ وہ ضرور آئے گا۔ آج نہیں تو کل۔ یا کسی  
 اور دن۔۔۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ کبھی ایک دو رات عیاشی کرنے اور کبھی کوئی نیا شکار  
 ان کو سوچنے۔۔۔ حنیف خاں سے مار ڈال۔ تو اسے میرے سامنے لٹا کر میرے ہاتھ میں لٹو کا  
 دے دینا۔ حنیف خاں تجھے خدا رسول کا واسطہ ہے اس کے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے کرنے  
 دینا۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے۔۔۔“  
 وہ سسکیاں لینے لگی۔

”ہوش کر شریفیاں۔ اگر تو واقعی مرنے سے پہلے کچھ لمحوں کا سکون چاہتی ہے تو خود کو  
 بالکل نارل کر لے۔ تیری کسی حرکت پر یہاں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔ یہی ایک صورت  
 ہے جس سے تیرے اور میرے کلبجے میں پھرتی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ ورنہ تو بھی میری  
 طرح بسک بسک کر مر جائے گی۔“  
 شریفیاں نے اس کی بات فوراً سمجھ لی تھی۔  
 یہی وجہ تھی کہ وہ چذمنٹ بعد ہی نارل ہو گئی۔  
 ساری رات وہ اسے کدیر کدیر کر صغراں کی باتیں پوچھتا رہا شریفیاں نے اپنی دانت میں اسے  
 ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔  
 علی الصباح وہ اس سے اگ ہو کر اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔

دس دن تک اس نے صغراں کی قبر کا پتہ۔ گھوانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اپنایا۔  
 لیکن۔۔۔

اس سے آگے اسے کسی بات کا علم نہ ہو سکا کہ ایک عورت نے پھلانگ لگا کر خود کشی کی  
 تھی جس کی لاش کارپوریشن والے دفن کرنے کے لئے لے گئے تھے۔  
 اگلے روز وہ اپنی جان تہیلی پر رکھ کر کارپوریشن کے دفتر جا پہنچا۔ اس نے بڑی ہشکاری سے اس  
 کلرک کا پتہ لگایا جو اپنے رجسٹر میں ایسی لاش کا اندراج کیا کرتا تھا۔

لیکن.....

حنیف خاں اس کی قبر سے لپٹ کر گھنٹوں روتا رہا۔

اس نے اگلا سارا دن وہیں گزارا۔ اپنی آنکھوں نے سامنے قبہ کی چار دیواری بنوائی کیونکہ اور دس بارہ روز تک اس کا نام و نشان مٹنے والا تھا۔ اپنے خاندانی رواج کے مطابق اس نے قبر پر صغراں کے نام کی تختی لگوائی اور ساری رات اس کے سرہانے پاگلوں کی طرح بیٹھا رہا۔

اب اس پر دیوانگی طاری رہنے لگی تھی.....

اس نے اسی بازار میں مستقل اڑھ بھالیا تھا.....

اپنے مستقل ٹھکانے کی اس نے اگلے ہی روز شریفان کو نشاندہی کر دی تھی۔ جس نے خدا رسولؐ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ جیسے ہی نذیرے کی اطلاع پائے گی اپنی جان پر کھیل کر اسے مطلع کرے گی.....!

○ ○ ○

نذیرے کا انتظار کرتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

اسے یہاں قیام پذیر ہوئے قریباً چالیس روز ہونے کو آ رہے تھے اسی درمیان اس نے صغراں کی قبر ناخچ بڑھنے میں ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔

اکتیسویں روز اس کی مراد بر آئی۔ جب بازار میں ڈاکٹر کی دکان سے دوائی لینے کے بہانے شریفان ایب اور ٹرکی کے ساتھ آئی۔ اس دکان پر قریباً روزانہ حنیف خاں چکر لگایا کرتا تھا۔ لڑکی کو دوائی والی لائن میں لگا کر اس نے جب حنیف خاں کو یہ خوشخبری سنائی تو اس کا دل اتنا زور سے دھڑکا۔ جیسے ابھی جان کا بخبرہ توڑ کر باہر آن گئے گا.....

زندگی میں اتنا کسی بات کا انتظار اس نے نہیں کیا تھا

وہ تو نجانے کب سے اس ساعت سعید کا منتظر تھا۔

اس نندے بازار کے ایک کونے میں کرائے پر لئے ہوئے ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے کے ایک کونے میں رکھی گندی سی رضائی سے اس نے کلاشکوف نکال کر اور اسے اپنے بازو کے نیچے دبا کر اوپر سے بڑی سی گرم چادر اس طرح اوڑھ لی کہ وہ اب اس کے جسم کا

شام ڈھلے حیب اس نے مرہیل سے کلرک کے دروازے پر دستک دی تو ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر جس کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”گھبراؤ نہیں — یہ لو۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے کلرک کے سامنے اس کی دو تین سال کی تنخواہوں سے زیادہ مالیت کے کرنسی نوٹ پھینک دیئے۔

اس نے اندازے سے وہ پتہ جواسے شریفان نے سمجھایا تھا بتا کر کلرک سے صرف یہ پوچھا تھا کہ اس گناہ لاش کو دفنایا گیا تھا۔

”وہ جس نے خودکشی کی تھی —“

کلرک کو اچانک جیسے بھولی ہوئی داستان یاد آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ شخص گدھا دکھائی دیا جس نے محض اتنی سی جائزبات پوچھنے کے لئے اس کے سامنے اتنے نوٹ پھینک دیے تھے ؟

”بڑے قبرستان میں — بھی میں خود گیا تھا — ابھی سال ڈیڑھ سال کی تو بات ہے۔ میں اس کی نشاندہی کر سکتا ہوں — لیکن تم کون ہو؟“

جواب میں اسے حنیف خاں نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بیچارہ سہم کر رہ گیا۔

”متم میرا مطلب ہے بجائی صاحب اتنی سی بات پوچھنے کے لئے اتنے پیسے دینے کی کیا ضرورت تھی“

کلرک کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے یہی کچھ کہہ کر اپنی جان چھڑانا چاہی وہ نہیں۔ تم پیسے رکھو — اور یہ پیسے تمہیں زبان بند رکھنے کے لئے دے رہا ہوں — خبردار اگر زندگی میں کبھی بھولے سے بھی تمہاری زبان پر یہ لفظ آیا کہ کسی نے تم سے اس قبر کے بارے دریافت کیا تھا —“

حنیف خان نے اسے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”ٹھک ٹھک ٹھیک ہے“

کلرک کی گھنٹی بندھ گئی

خدا جانے وہ کس کی قبر تھی جس کی اس نے نشاندہی کی —

حصہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں دھرے پلاسٹک کے کین کو اس نے کھول کر دیکھا۔ پٹرول کی پوری مقدار اس میں موجود تھی۔ وہ روزانہ جتنا پٹرول کم ہوتا۔ اتنا اس میں ڈال دیتا۔

آج اس پر ایک عجیب سا نشہ طاری ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے کین اٹھایا اور اطمینان سے اپنی منزل کی طرف چل دیا سورج اپنا سفر مکمل کر رہا تھا۔

شام کے منحوس سائے بازار میں پھیلے گناہوں کی سیاہی میں ڈھل رہے تھے۔ رات کی تیاریاں شروع تھیں۔ دکانیں سجنے لگی تھیں۔ بازار کی رونق بڑھنے لگی تھی۔

لوگ اپنے کاموں میں اس طرح منہمک تھے کہ کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی میسر نہیں تھی۔ حنیف خان بڑے اطمینان سے اس مکان تک پہنچا۔ اس کی بیڑھیوں کے نیچے بنی جگہ پر اس نے پٹرول کا کین آرام سے رکھ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر پہنچ گیا۔

سامنے والے کمرے میں ایک ذہلی عمر کی موٹے جسم والی ناشکہ۔ لور کوٹھے کا دلالت نذیرے کے ساتھ کسی بات پر زور دار قہقہے لگا رہا تھے۔ جب اس نے پاؤں کی زور دار ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

تینوں نے کسی برقی عمل کے تابع اپنی گردنیں روپوت کی طرح اس کی طرف گھمائیں۔ تو حنیف خان نے ان کی طرف کلاشکوف تان رکھی تھی۔۔۔۔۔!!

”حنیف خان تم۔۔۔۔۔“

خدا جانے صرف یہ تین الفاظ ادا کرنے کے لئے نذیرے کو کتنا زور صرف کرنا پڑا۔

”ہاں میں۔۔۔۔۔ تمہاری موت۔۔۔۔۔ کتے کے پلے۔۔۔۔۔ تم مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔۔۔۔۔ حرام خور۔۔۔۔۔ ذلیل انسان تیرا انجام اس بازار کی تاریخ بن جائے گا۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھوں سے کون اور آواز سے قہر برس رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے کوئی دوسری بات نکلتی۔ حنیف خان نے پورے زور سے لات ناشکہ کی کمر پر رسید کر دی جس نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے ایک طرف ہٹنا چاہا تھا اس کا منہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر کر چیخنے لگی۔

”مم میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔“

دلالت نے ہاتھ باندھ دیئے

”ہٹ جا۔۔۔۔۔“

حنیف خان نے اتنے زور سے اسے کہا کہ وہ لرز کر پرے ہٹ گیا۔

اس نے نذیرے کو بندوق کی نوک پر بیڑھیوں کی طرف دھکیلا اور جیسے ہی وہ بیڑھیوں پر پہنچا پوری قوت سے حنیف خان نے اس کی کمر میں لات رسید کی۔

نذیرا موچی لڑکھنیاں کھاتا بیڑھیوں سے باہر سڑک پر گر پڑا۔۔۔۔۔

حنیف خان فرشتہ اجل بن کر اس کے سر پر موجود تھا۔۔۔۔۔

اس نے زمین پر گرے نذیرا موچی کی ٹانگوں میں دو گولیاں ماریں اور وہ زخم خوردہ کتے کی طرح چیخنے لگا۔۔۔۔۔

بازار میں شور مچاتی زندگی پر موت کے سائے منڈلانے لگے۔ حنیف خان نے بڑے اطمینان سے پٹرول کاٹین باہر نکالا اور اس پر الٹ دیا۔۔۔۔۔

سارے بازار پر دہشت طاری تھی۔۔۔۔۔

لوگ خوفزدہ ہو کر کونوں میں سمٹ گئے تھے

ابھی اس نے اپنی جیب سے ماچس نکالی ہی تھی جب بیڑھیوں سے چیختی ہوئی شریفان نیچے اتر آئی۔۔۔۔۔

نہیں حنیف خان۔۔۔۔۔ خدا کے لئے نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔۔۔۔۔

اس نے اپنے ہاتھ میں گوشت کاٹنے والی چھری پکڑ رکھی تھی۔

حنیف خان نے خون چپکتی آنکھوں سے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ روک لیا۔ جیسے اسے چند سیکنڈ کی مہلت دے کر اس کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہو۔

شریفان بھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر پل پڑی۔ اس نے عالم وحشت میں اس کے جسم پر جانے کتنے گھاؤ لگا دیئے پھر نڈھال ہی ہو کر گر پڑی۔۔۔۔۔

نذیرا زنج ہوتے بکرے کی طرح ڈکراتا ہوا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

لیکن۔۔۔۔۔

حنیف خان کو جیسے اپنے گرداگرد کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔



اس نے کین کا باقی پٹروں اس پر اندیلا اور پرے ہٹ کر جلتی ہوئی ماچس کی تیلی اس پر پھینک دی۔

نذیرے کا گناہ آلود بدن یوں دھماکے سے جلا تھا جیسے اس میں یارود بھرا ہوا ہو۔۔۔۔۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک اس کی چیخیں سنائی دیں پھر جیسے اس کا گلا ہی بند ہو گیا تھا۔ یہ منظر اس بازار کی تاریخ بن چکا تھا۔

کوٹھے سے پانچ چھ لڑکیاں بھاگ کر نیچے آگئی تھیں جو دیوانہ وار اس کے بدن کے آگے رد چینی چلاتی تاج رہی تھیں ان پر دیوانگی کا عالم طاری تھا نذیرے کی چیخ کے ساتھ وہ زیادہ تیزی سے قہقہے لگا کر چیخ چلا رہی تھیں۔

یہ وہ بد قسمت لڑکیاں تھیں جنہیں اس نے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے درغلا کر اغواء کیا اور اب انہیں عورت سے فاحشہ بنا ڈالا تھا۔

آہستہ آہستہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔

کسی نے شاید پولیس کو خبر کر دی تھی تھانے والوں کو جب یقین ہو گیا کہ اب ”تماشا“ ختم ہو چکا ہو گا تو وہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

لیکن۔۔۔۔۔

حنیف خان وہاں نہیں تھا

نیم پاگل شریفان کو وہ دھکے مارتے تھانے لے گئے۔

اس روز رات گئے وہ آخری مرتبہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو بے اختیار اپنے نیند میں

سوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر چومتا رہا۔

”بس ماما۔۔۔۔۔ صبح میں پیش ہو جاؤں گا تم نے جو بندوبست کرنا ہے کر لو۔۔۔۔۔“

اس نے نذر محمد سے کہا جو حیرانگی اور بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف ایک ننگ دیکھ

رہا تھا۔

ایم این اے کے امیدوار سردار رشید اور نزدیکی دیہاتوں کے پندرہ بیس معززین کی

موجودگی میں ایس ایس پی کے سامنے انہوں نے حنیف خان کو پیش کر دیا۔۔۔۔۔ ۱۱

ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلتا رہا۔

اس پر بے شمار الزامات تھے۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔

پولیس ملازمین نے یہاں بھی نااہلی کا مظاہرہ کیا اور ڈھنگ کا کیس بھی تیار نہ کر سکے ریاست شاہ کے قتل کا سارا بوجھ فضل شاہ اپنی زندگی میں عالم داد پر ڈال گیا تھا۔ اس کیس میں وہ بری ہو گیا۔

سردار مرید کے لواحقین نے اس سے صلح کر لی تھی۔

نذیرے کے بیٹانہ قتل کو وکیل صفائی نے جوش انتقال میں حنیف خان کا ”انتقامی اقدام“ ثابت کر دیا۔ نذیرے کے خلاف دس لڑکیاں عدالت میں پیش ہوئی تھیں جنہوں نے اس کی شخصیت کے ایسے گھناؤنے پہلو عدالت کے سامنے پیش کئے کہ سرکاری وکیل کے لئے اس کے قتل کی وکالت کرنا مشکل پڑنے لگا۔

جب یہ بے کس اور بے بس عورتیں جو آج زندہ درگو ہو چکی تھیں۔ عدالت کو چیخ چیخ کر اپنے جسموں پر ڈھائے تشدد کے نشانات دکھاتیں تو محترم جج صاحبان بے اختیار اپنی آنکھوں پر نشو پتھر رکھ لیتے۔

عمر دین اور اس کے بھائی کو شدید زخم آنے کے جرائم میں اسے دس سال قید بامشقت ہو گئی۔ جس روز وہ جیل کی طرف جا رہا تھا اس روز پہلی مرتبہ اس کی مرضی کے خلاف اور اجازت کے بغیر نذر محمد اس کے پانچ سالہ بیٹے کو اس کی ایک جھلک دکھانے لے آیا۔۔۔۔۔“

حنیف خاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور چپ چاپ جیل چلا گیا ساری جیل اس کے لئے دیدہ و دل فراش راہ کئے ہوئے تھے۔

لیکن۔۔۔۔۔

وہ اب نھو خان بد معاش کا بیٹا نہیں ایک زخم خوردہ انسان تھا جس کے سینے پر سب سے گہرا گھاؤ اس کی بیوی کی موت کا تھا۔۔۔۔۔

سردار رشید کی مہربانیوں سے اسے دو تین ماہ بعد کسی نہ کسی بہانے پولیس گارڈ صفراں اور اس کے والدین کی قبروں پر لے جاتی تھی۔

تین سال مزید زندہ رہ کر نذر محمد نے جینے کا حق ادا کر دیا وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اپنی بیٹی کی قبر پر جاتا رہا۔ اس کی موت پر سردار رشید کی مہربانی سے جو اب شمشیر نگر کے تعاون سے ایم این اے بن چکا تھا۔ بیروں پر رہا کر کے پولیس اپنی حفاظت میں گاڑوں لے آئی۔

اس کا بیٹا ایک وقت میں قرآن بھی حفظ کر رہا تھا اور سکول بھی جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ۱۔  
 نذر محمد کی موت پر نمبردار احمد دین اس کنبے کا باپ بن گیا۔ اس نے نذر محمد کی دونوں  
 بیٹیاں یوں بیاہیں کہ شمشیر نگر اور گرداگرد کے کلین انگشت بدندان رہ گئے۔  
 مختلف معافیاں ڈال کر حنیف خاں کو سات سال بعد رہائی مل گئی۔۔۔۔۔ ۱۔  
 جیل کے دروازے پر شمشیر نگر اور دوسرے دیہاتوں کے سینکڑوں دیہاتی پھولوں کے  
 ہار لئے اس کے منتظر تھے۔

ان میں سب سے نمایاں چہرہ حافظ عبد خاں کا تھا جو سکول کے ہوٹل سے اپنے باپ کو  
 لینے آیا تھا۔

آنسوؤں سے تڑا دھمی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے اپنی دونوں بانہیں عبد کا  
 کے لئے کھول دیں۔ بیٹا سینے سے لگا تو اس کے سینے میں دھکتے آلاؤ پر جیسے برف سی جم گئی۔  
 ”ماں یاد آرہی ہے اباجی۔۔۔۔۔“

عابد خان نے فیروز چچا کی کار میں اپنے باپ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا۔  
 حنیف خان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بچوں کی طرح سسک  
 پڑا۔

”اباجی۔۔۔۔۔ آپ کیوں روتے ہیں۔۔۔۔۔ میں ہوں نا۔۔۔۔۔ آپ کا بیٹا عابد خاں، میں ہوں  
 نا۔۔۔۔۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گا۔۔۔۔۔“

عابد خان نے بھرائی آواز میں کہا۔

”بس کر حنیف خاں۔۔۔۔۔ تیرا بیٹا جو ان ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اوئے گھبرو بیٹوں کے باپ نہیں  
 رویا کر دے بزدل۔۔۔۔۔“

فیروز کا گلا رندھ ہو گیا۔

دھوپ کی نرم کرنیں عنفراں کی قبر کو تھکیاں دے رہی تھیں۔ جب دونوں باپ بیٹا  
 وہاں پہنچے۔۔۔۔۔

وفا کی دیوی کی دعا کو اٹھے ان کے ہاتھوں پر ان کی آنکھوں سے آنسو تو اتر سے ٹپک  
 رہے تھے، جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ہو۔۔۔۔۔

حنیف خان نے دعا کے اختتام پر اپنی آنسوؤں میں بھیگی ہتھیلیاں چہرے پر پھیریں تو

سارا چہرہ دمک اٹھا۔

اس کے گناہوں کی ساری سیاہی ان آنسوؤں کے ساتھ بہ گئی تھیں۔۔۔۔۔



۱۰ اپریل ۱۹۶۳ء

۸۳۔ راولی روڈ، لاہور

KitabPK.Com